

# اخلاق رسول ﷺ

رسول اکرم ﷺ کی سماجی و سیاسی زندگی  
اخلاق کے آئینہ میں

تالیف

حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی  
استاذ و مہتمم جامعہ رحیمیہ مہدیان میر درد روڈ دہلی

سید امجد مبینی  
آر ب منزل  
پاکستان چوک کراچی



وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلِقْتَ عَطِیْمًا

2684

4444

14/4/99

K.P. 759

~~K8006~~

اللہ صلی علیہ وسلم

# اخلاق رسول

کامل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی و سیاسی زندگی  
اخلاق کے آئینہ میں

تالیف

حضرت مولانا حافظ اخلاق حسین صاحب قاسمی الدہلوی  
استاذ و مہتمم جامعہ رحیمیہ مہندبان میر درد روڈ دہلی

حسب اجازت و عنایت خصوصاً حضرت مؤلف مدظلہ العالی

ناشر

سید امین گینی  
ایکب منزل  
یاکین چوک کراچی



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## تالیف کا مقصد

الندوہ ٹرسٹ لاہور

چھتر۔ اسلام آباد

خدا کے ان بندوں تک اتمامِ حجت کی حد تک دین کا پیغام پہنچانا جو دین حق کی روشنی سے محروم ہیں، ہم مسلمانوں کا اہم فریضہ ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لکھا ہے کہ غیر مسلم طبقہ پر اتمامِ حجت کے دو طریقے ہیں : ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اپنی عملی زندگی کو اسلام کی صداقت کا عملی نمونہ (گواہ و شاہد) بنا کر پیش کریں اور ہماری عملی زندگی میں لوگ اسلام کی برکتیں اور رحمتیں دیکھ کر اسلام کو نجات و ہدایت کا راستہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی کمالات اور معجزانہ کیرکیر کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ہر طبقہ کو اسکی زبان، اسکی سمجھ اور اسکی استعداد کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی جائے تاکہ رحمۃ اللعالمین اور صاحبِ خلقِ عظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت لوگوں کے دلوں میں اتر جائے اور پھر اس محبوب، شفیق، رحمدل اور محسنِ انسانیت کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو لوگ سچا ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پانے لگیں (فتاویٰ عزیزیہ ص ۴۱)

اتمامِ حجت کے دوسرے طریقہ کے مطابق فریضہ دعوت ادا کرنے کی غرض سے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی کمالات پر یہ کتاب پیش کی جا رہی ہے۔

یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی کے اہتمام میں ناچیز کی تالیف اخلاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت اچھے معیار کتابت و طباعت کے ساتھ ہو رہی ہے دعا ہے کہ خداوند عالم اس کتاب کو قبولِ عام عطا کرے اور امت مسلمہ کو اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق عطا فرمائے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کے اس مجموعہ کو قبولِ عام عطا فرمائے اور یہ مجموعہ ہر زبان میں خدا کے ہر بندے کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور خدا تعالیٰ ہر مسلمان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس کتاب کی اشاعت میں حصہ لیکر دعوتِ دین کے اس بنیادی فریضہ کی ادائیگی میں شریک ہو اور سعادتِ دارین حاصل کرے۔ رَبَّنَا لَقَبْكَ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اخلاق حسین قاسمی دہلوی

ادارہ رحمتِ عالم

حالیہ مقیم، ضیاء منزل، برنس روڈ کراچی

شیخ چاند اسٹریٹ ۸۳۸ لال کنواں۔ دہلی

۲۳ اپریل ۸۶ء مطابق ۱۳ شعبان ۱۴۰۶ھ

# فہرست مضامین اخلاق رسول ﷺ حصہ اول دوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۸	عدل و انصاف	۲	تالیف کا مقصد
۱۹	مساوات و اخوت	۹	حصہ اول - سماجی زندگی
۱۹	شجاعت و قوت	۹	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت
۲۰	مشورہ	۱۰	رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم کا اعلان
۲۰	اقتصادی خوشحالی		
۲۱	نبوت سے پہلے چالیس سالہ اخلاقی کردار	۱۱	صاحب خلق عظیم کامل معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم
۲۲	یتیمی کا داغ	۱۵	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات
۲۲	معصوم جوانی، قوت، امانت اور خدمت	۱۵	زہد، ایثار، قناعت اور سادگی
۲۵	شرم و حیا	۱۶	عفت، نیک چلنی، گیر گیر کی بلندی
۲۶	جوانی میں ضبط نفس اور پاکبازی	۱۶	صدق، سچائی
۲۷	حضرت خدیجہؓ نے انتخاب کیوں کیا؟	۱۶	امانت، دیانت
۲۷	حق پسندی اس نوجوان کی فطرت تھی	۱۶	مہربان و رحمیل
۲۹	جوانی میں گانا سننے سے پرہیز	۱۷	علم و بردباری
۲۹	دانش مندی کا ایک واقعہ	۱۷	رحم اور نرمی
۳۰	سعادۂ امن میں شرکت اور تعاون	۱۷	تواضع و خاکساری
۳۱	حضرت خدیجہؓ کا خراج عقیدت	۱۸	پابندی عہد
۳۲	اپنے بڑوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق	۱۸	دنیوی محنت و کسب
		۱۸	خوش طبعی



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۴۸	پر دوسی اگر تکلیف پہنچائے تو کیا کرے	۳۳	ماں، باپ کے لئے دعا
۴۹	اولادِ رسول اور پر دوسی کا حق	۳۵	رضاعی ماں باپ کی عزت
۵۱	{ سسرال والوں کے ساتھ ایک شریف	۳۵	چچی کی لمحہ اپنے ہاتھ سے بنائی
	واماد کے اخلاق	۳۶	اپنے چھوٹوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
۵۲	وامادوں کے ساتھ ایک شریف خسر کے اخلاق		کے اخلاق
۵۲	{ دوستوں کے ساتھ ایک بہترین دوست کے	۳۷	حضرت سیدہ کبریٰ اور ان کے بچوں
	اخلاق		سے محبت
۵۸	{ مہانوں اور میزبانوں کے ساتھ حضور صلی اللہ	۳۸	رطکیوں کے ہلاک کرنے پر حضور صلی اللہ
	علیہ وسلم کے اخلاق		علیہ وسلم کا رونا
۵۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہمان کی حیثیت سے	۳۹	تعلیم و تربیت کی سختی
۶۰	{ گاہکوں اور خریداروں کے ساتھ حضور	۴۰	حضرت حمزہؓ کی یتیم بچی کے ساتھ محبت
	صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق	۴۱	گھر کے خادم سے محبت
۶۲	{ محنت کے کاموں میں اپنے رفیقوں کے ساتھ	۴۱	ماں باپ کے حقوق کی تعلیم
	شرکت	۴۲	ماں باپ کے فرائض کی تعلیم
۶۴	اپنے رفیقوں کو کسب معاش کا طریقہ سکھایا	۴۳	اچھی تربیت اور اچھی تعلیم کے لئے اہتمام
۶۸	{ ازواجِ مطہرات کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم	۴۴	بیماروں کے ساتھ اخلاق
	کے اخلاق	۴۴	غلاموں کے ساتھ اخلاق
۶۹	عورت کی عزت کا عملی اعلان	۴۶	یتیم پر شفقت
۷۱	{ بیوہ عورت سے شادی اور عورت کی	۴۷	بیوہ عورتوں کے ساتھ حسنِ اخلاق
	عزت کا اعلان	۴۷	پر دوسی کے حقوق کی تعلیم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۹۲	صحت جسمانی اور ورزش کا خیال	۷۲	عورت کے حقوق کا عملی اعلان
۹۳	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس	۷۳	نان و نفقہ میں اسناد کیا
۹۸	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع قطع اور آرائش	۷۴	مزید اضافہ کے لئے مطالبہ کی شدت
۹۹	رفقار	۷۵	ازواجِ مطہرات کے مطالبہ کا سبب
	تکلم	۷۶	مرد کے لئے طلاق کا حق
۱۰۰	روحی فداہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اندازِ تکلم	۷۹	عورت کی طرف سے علیحدگی کی خواہش
۱۰۲	کمال ایمان و عبادت، عبدیت کاملہ	۷۹	عورت پر اخلاقی کنٹرول کی سختی
۱۰۵	اول المسلمین	۸۰	بیوی کے مذاق پر بیستم کا اظہار
۱۰۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان اور توحید کا درجہ	۸۰	بیوی کے منہ سے میکے والوں کی تعریف
۱۰۷	اپنی نبوت پر ایمان و یقین	۸۱	تعددِ ازواج کا سبب
۱۰۸	آخرت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان و یقین	۸۳	شادی بیاہ کے معاملہ میں کفو اور جوڑ کا سوال
۱۰۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت گزاری کا بے مثل مقام	۸۳	کفو کا مسئلہ محدثین اور فقہاء کی نظر میں
۱۱۱	عبدیت اور تواضع کے مختلف رنگ	۸۵	بحر الرائق نے لکھا ہے
۱۱۳	عبدیت انسانی کمزوریوں کے رنگ میں	۸۵	بیویوں کی دلجوئی کے چند واقعات
۱۱۳	راہِ حق میں مطلوبیت	۸۶	بے جاد دلجوئی پر وحی الہی کی ناراضگی
۱۱۴	بھول چوک اور نبی معصوم	۸۷	غلبہ توحید کے جوش میں حضرت عائشہ رضی
۱۱۵	بیماری اور جادو کا اثر	۸۷	کا سود ادب
۱۱۶	اہلِ دعیال کا فکر	۸۹	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالیاتی ذوق
۱۱۷	عبدیت کا آخری منظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ آخرت	۹۰	دین کی آسانی کا اعلان کس موقع پر کیا؟



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۳۴	مال غنیمت سے دلچسپی پر مواخذہ	۱۲۱	حصہ دوم - سیاسی زندگی
۱۳۶	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی اور	۱۲۱	دما اور سناٹا لا رحمة للعالمین
۱۳۶	قدیم مورخین اسلام	۱۲۳	رحمت للعالمین ہونے کے مختلف پہلو
۱۵۱	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن	۱۲۴	عفت
۱۵۱	(ترجید و اخلاق کی دعوت)	۱۲۶	رحم و رحم
۱۵۱	مکی اور مدنی زندگی میں فرق	۱۲۷	جو دوستی
۱۵۵	کفر کی طرف سے نکالنے کی دھمکی اور	۱۲۸	امانت و دیانت
۱۵۵	حضرات انبیاء کا جواب	۱۲۹	صبر و تحمل
۱۵۶	دھمکی کا زبانی جواب	۱۳۰	عفو و درگزر
۱۵۹	مدینہ منورہ میں اسلام	۱۳۱	عدل و انصاف
۱۵۹	مکہ اور مدینہ میں فرق	۱۳۲	اخلاقی فضائل روحانی کمالات اور سیاسی تدبیر
۱۶۱	مدینہ منورہ میں پہلی دعوت	۱۳۳	کا مکمل اور جامع نمونہ
۱۶۳	بیعت عقبیٰ اولیٰ	۱۳۴	حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی خدا تعالیٰ نے
۱۶۶	ہجرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم	۱۳۵	قسم کھائی
۱۷۱	ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں تقریریں	۱۳۶	مغربی دانشوروں کا الگ الگ استدلال
۱۷۲	مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعہ	۱۳۷	تمام رسول سچے ہیں، لیکن محمد عربیٰ آخری نبی ہیں
۱۷۲	خطبہ التقویٰ	۱۳۸	رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی نظام کی تشریح
۱۷۹	مدینہ منورہ میں پہلی نسیمت	۱۳۹	افراد و تفریق کے دو نقطہ نظر
۱۷۹	”اسلام“ امن و سلامتی کا مشن	۱۴۰	دعوت حق اور سیاسی تحریک میں فرق
۱۸۱	میدان جنگ کے اخلاقی اصول	۱۴۱	قومی لیڈر اور رسول میں فرق

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۰۷	مسجد حرام میں داخلہ اور مجرموں کی معافی	۱۸۱	مقصدِ جہاد میں اخلاقی اصولوں کا احترام
۲۰۹	کعبہ کی کتنی واپس کر دی گئی	۱۸۱	جنگ کے طریقوں میں اخلاقی اصولوں کا احترام
۲۱۰	فاتح حکمران ملکہ بلقیس کی نظر میں	۱۸۲	۱۔ بورہوں اور بچوں کا تحفظ
۲۱۲	کعبہ پر اذان، ابو مخذومہ پر شفقت	۱۸۲	۲۔ شب خون کی ممانعت
۲۱۳	ثمامہ بن اثال پر رحم و کرم	۱۸۲	۳۔ آگ میں جلانے کی ممانعت
۲۱۴	مکہ میں قحط اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا {	۱۸۲	۴۔ اذیت دے کر قتل کرنے کی ممانعت
	رحم و کرم	۱۸۵	۵۔ لوٹ مار کرنے کی ممانعت
۲۱۸	حملہ آور قاتل پر رحم و کرم	۱۸۵	۶۔ شور مچانے کی ممانعت
۲۲۰	میدانِ حنین میں شیبہ پر رحم و کرم	۱۸۶	قیدیوں پر احسان و کرم اور دشمنوں سے سلوک
۲۲۲	حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی پر لطف و کرم	۱۸۶	غزوہ بدر کے قیدی
	بندہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت {	۱۸۷	مہذب قوموں کا سلوک قیدیوں کے ساتھ
۲۲۴	اور مہربانی	۱۹۱	قیدیوں کا تبادلہ
	مہاجرین کے چھوڑے ہوئے مکان مکہ والوں {	۱۹۲	فدیہ کی حوصلہ شکنی
۲۲۵	کے حوالہ کر دیئے	۱۹۳	میدانِ اُحد میں دشمنوں کے لئے دُعا
۲۲۵	سردارانِ قریش کے لئے عفو و کرم	۱۹۴	حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کے درمیان فرق
۲۲۷	عکرمہ کی آمد	۱۹۷	حضرت ابراہیمؑ کا رحم و کرم
۲۳۰	سفوان بن امیہ پر رحم و کرم	۱۹۸	حضرت ملیحیہؑ کا رحم و کرم
۲۳۵	ابولہب کے بیٹوں کے لئے دُعا	۱۹۹	خدا تعالیٰ کا رحم و کرم ہے
۲۳۶	ابولہب کی بیٹی "درہ" پر لطف و کرم	۲۰۰	فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ
۲۳۶	حنین کے قیدیوں پر رحم و کرم	۲۰۰	مدینہ سے روانگی
۲۳۸	حاتم طائی کی بیٹی پر رحم و کرم کی بارش	۲۰۲	ابوسفیان بن حرب پر رسول اکرم کا رحم و کرم
		۲۰۴	مکہ میں داخلہ کے وقت خاکساری اور بندگی



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۶۱	بیر معونہ کے واقعہ پر بدعا	۲۳۹	سراقہ بن مالک بن جشمہ کی معافی اور انعام
۲۶۲	تیسرا واقعہ	۲۴۲	منافقین کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق
۲۶۳	چور کے حق میں بدعا کرتے سے ممانعت	۲۴۴	ابن ابی کے جنازہ کی نماز
۲۶۴	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر پر آسمانی آیت کا نزول	۲۴۶	نماز جنازہ کی ممانعت (برائے کفار)
۲۶۵	شرعی سیاست کی بنیاد و حجت پر ہے	۲۴۷	منافقین کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم
۲۶۸	چند مثالیں	۲۴۸	کرنیکی کوشش اور آپ کا رحم و کرم
۲۷۰	نہی عن المنکر میں احتیاط	۲۴۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کو
۲۷۲	مجرموں کے ساتھ عادلانہ اخلاق	۲۵۰	منافقین کمزوری سمجھتے تھے
۲۷۳	قوت، شجاعت، جرأت، عدالت	۲۵۱	زہر دینے والی عورت پر رحم و کرم
۲۷۴	قانونی انصاف، اپنی ذات سے بدلہ	۲۵۲	اسی حملہ آوروں کو معافی
۲۷۵	مسلمانوں کے قاتل پر غصہ	۲۵۳	غیر مسلم ماں کی عزت کا حکم
۲۷۶	اسلام کے تعزیری قوانین کی سختی	۲۵۴	عہد کی پابندی کے تین اہم واقعات (بدر کا واقعہ)
۲۷۷	عدل و مساوات کے معاملہ میں آسمانی فہمائش	۲۵۵	ابو جندل کا واقعہ
۲۷۸	قانون بنانے کا حق اسلام میں	۲۵۶	ابو بصیر کا واقعہ
۲۷۹	قانون شریعت کی نگرانی خدا کی طرف سے	۲۵۷	خدا نے راہ نکالی
۲۸۰	سیاسی اور قانونی انصاف پر فہمائش	۲۵۸	آپ نے مرے ہوئے غیر مسلم کی مذمت کو ناپسند فرمایا
۲۸۱	بشیر ابن ابیرق کا واقعہ	۲۵۹	ابو بکر صدیق کو بھی منع فرمایا
۲۸۲	معاشرتی مساوات کے معاملہ میں فہمائش	۲۶۰	حضرت بلالؓ کی اذان پر اعتراض اور وحی الہی کا جواب
۲۸۳	کالے اور گورے کے امتیاز پر حضورؐ کی ناراضگی	۲۶۱	کیا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعما کی ہے؟
۲۸۴	عبداللہؓ بن کتوم کا واقعہ	۲۶۲	بدعما کے دو موقعے اور پھر اس کی ممانعت
۲۸۵	حضورؐ کے کردار میں زہد، قناعت اور ایثار	۲۶۳	



حصہ اول سماجی زندگی

## رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت

دُنیا میں جب سے انسان کا وجود ہے اسی وقت سے اخلاقی تعلیم کا وجود بھی ہے، اپنے جسم کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے انسان روٹی، پانی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور پھر اس کے لئے محنت کرتا ہے، اسی طرح اپنی انسانیت کو زندہ رکھنے کے لئے اسے اخلاقی تعلیم اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے شروع زندگی سے لے کر آج تک سینکڑوں اخلاقی معلم اخلاقی ہدایات لے کر آتے رہے اور انھوں نے آسمانی تعلیمات کے مطابق دنیا کو اچھے اخلاق کا راستہ بتایا اور اس پر چلایا۔

اسی طرح عقل و دانش کی روشنی میں اخلاقیات کا سبق دینے والے حکمائے اخلاق بھی ہر دور میں پیدا ہوتے رہے اور اپنے اخلاقی فلسفہ سے دنیا کو اخلاقِ حسنہ کی روشنی پہنچاتے رہے۔

علم اخلاق کے آسمانی رہنماؤں اور معلموں میں حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ تک بڑے بڑے انسانی معلم نظر آتے ہیں جن کی اخلاقی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور مستقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے حکمائے اخلاق کی فلسفیانہ کاوشوں کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا کے سامنے ایسا اخلاقی معلم کون ہے جس کے پاس اخلاقِ حسنہ کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاقیات کا نظام بھی مکمل طور پر موجود ہو اور اس تعلیم و فلسفہ کے مطابق عملی زندگی کے ہر شعبے کے لئے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ بھی دُنیا کے سامنے بنے نقاب ہو۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مہدوستان، ایران اور چین میں بڑے بڑے اخلاقی معلم آئے اور تورات، وانجیل کے باوجود مقدس نے بھی جو اخلاقی روشنی پھیلانی اس کے اثرات آج تک زندہ ہیں۔ لیکن بحثِ نوا یک اعلیٰ اور مکمل نمونہ کی ہے اور سوال تو یہ ہے کہ وہ اخلاقی معلم کون ہے جس نے زندگی کے



ہر شعبہ اور جہاتِ انسانی کے ہر گوشہ کے لئے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ چھوڑا ہوا وہ تاریخ نے اس کے ایک ایک اخلاقی کردار کو پوری احتیاط سے محفوظ رکھا ہے۔

تاریخ نے ایسے کامل اخلاقی مسلمہ کے طور پر اگر کسی کو پیش کیا ہے تو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس سے کسی اخلاقی مسئلہ کے مرتبہ پر کمی کا خیال نہ لیا جائے، حضرت موسیٰ ہوں یا حضرت عیسیٰؑ ہندوستان کے کرشن جی ہوں یا مہاتما بدھ یا ایران کے زرتشت، یہ سب اخلاقی پیشوا اپنے اپنے دور میں اپنے حالات کے مطابق اپنی قوموں اور بستیوں کو اخلاقی روشنی پہنچانے کا کام پورا کر کے اس دنیا سے چلے گئے، لیکن خلاق کی تکمیل کے لئے آخر میں آنے والے اخلاقی معلم (رسول ربی صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ یہ کام چھوڑ گئے کہ جب انسانی زندگی اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ درجہ کمال کو پہنچے لگے تو اس وقت وہ آخری رسول اپنی مکمل تعلیم اور مکمل سیرت کے ساتھ دنیا پر ظاہر ہو جائے اور انفرادی زندگی سے لے کر سماجی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے ہر گوشہ میں اعلیٰ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دے۔

## رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم کا اعلان

قرآن کریم نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت کے متعلق آسمانی اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَنْتَ لَعَلَّ سُلَيْمٌ حَنِيفٌ (سودہ ن: ۱۰) (اے محمدؐ) بے شک تم اخلاق کے بڑے درجہ پر قائم ہو۔

اعلیٰ اخلاق کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے مقام پر اعلان فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (سورۃ انبیاء) (اے محمدؐ) ہم نے تجھیں جہان والوں کے

لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اعلیٰ اور بلند اخلاق کا کمال یہ ہے کہ آپؐ کی ذاتِ گرامی تمام عالم کے لئے تمام قوموں کے لئے

اور تمام زمانہ کے لئے رحمت و کرم سے زندگی بھر گوشہ لے لئے رحمت و مہربانی ہے۔

اس مقام کی وضاحت کرتے ہوئے سورۃ آل عمران میں فرمایا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَكَوْنْتَ قَلْبًا عَظِيْمًا لِّلْقَلْبِ لَا تَهْمُؤْا مِنْ خَلْقِكَ



فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران) ————— ”خدا تعالیٰ کے کرم سے اے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان لوگوں کے لئے نرم دل ہو اور اگر تم سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاتے، پس ان کے ساتھ عنود و درگزر کا معاملہ کرو، ان کے لئے دُور کرو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرو۔“

نرم مزاج اور نرم دل ہونا، لوگوں کے ساتھ معافی کا بہ ادبہ، لوگوں کے حق میں بھائی کی دھارنا اور ان سے مشورہ کر کے ان کی حوصلہ افزائی اور عزت بڑھانا اخلاقِ حسنہ کی اصل روح ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی مقام ”رحمۃ للعالمین“ کی یہی تشریح ہے اور اسی صفت کو اعلیٰ انداز میں نبیاد کہا جاتا ہے۔

**صاحبِ خلقِ عظیم، کامل معلمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم**  
اخلاقی احساس ایک فطری احساس ہے جسے خالق کائنات نے ہر انسان کی فطرت میں لہام کیا ہے۔ انسانی فطرت سچائی، پاسِ عہد، امانت، رحم و ہمدردی جیسی صفتوں کو پسند کرتی ہے اور ان کے مقابلہ میں ظلم، عناد، کینہ اور جھوٹ کو ناپسند کرتی ہے۔

فطرتِ انسانی کے پسندیدہ اور محبوب کاموں کا درس دیتے اور ان پر خود عمل کر کے دکھانے کے لئے خدا کی طرف سے معلمینِ اخلاق ہمیشہ آتے رہے، ہر قوم اور ہر ملک میں آتے رہے۔ ان معلمینِ اخلاق میں سب سے آخری معلم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

”انما بعثت لاتمم مکام الاخلاق (کنز العمال ج ۲ ص ۵)۔“ میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لئے بھیجا

گیا ہوں، خدا تعالیٰ نے آپ کے لئے جو سب سے زیادہ پسندیدہ صفت، اختیار رکھی اور اس صفت سے آپ کو یاد کیا وہ صفت ”خلقِ عظیم“ اور ”رحمۃ للعالمین“ کی صفت ہے۔

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (سورہ د) ————— ”بیشک تم اپنے نبی! بلند ترین اخلاق کے مالک ہو“  
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (سورہ انبیاء) ————— ”اور ہم نے تمہیں سارے

جہانوں کے لئے رحمت کا سامان بنا کر بھیجا ہے۔“



تمام معلمین اخلاق میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم "اخلاق کو مکمل کرنے والے" کا مقام کس بناء پر رکھتے ہیں اور آپ کو ایک لاطچوبیس ہزار رسولوں اور بیشمار مصطفیٰ اور فلاسفہ اخلاق اور حکام میں یہ امتیازی مقام کس سبب سے حاصل ہوا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان، عبادت، رضائے الہی، جنت اور آخرت کی کامرانی کا دار و مدار اعلیٰ اخلاق پر رکھا اور ساف صاف فرمایا:

احسنکم احسنکم اخلاقاً (حدیث) "تم میں سب اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر انسان کو یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ کسی انسان سے اسی وقت راضی ہو سکتا ہے اور کوئی انسان اسی وقت عبادت گزار کہلایا جاسکتا ہے اور سی مرد و عورت کو آخرت کی فلاح و کامرانی اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب وہ خدا کی مخلوق کے حقوق اچھی طرح ادا کرے اور اسی کا نام اعلیٰ اخلاق ہے۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک انسان اپنے ہم جنسوں، بھائی بندوں، پڑوسیوں اور شہریوں کیساتھ تو برا سلوک کرے، ان کی مصیبتوں میں ان کے کام نہ آئے، ان کے دکھ درد میں شریک نہ ہو اور اسے خدا کی محبت اور رحمت حاصل ہو جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی وہ اخلاقی کارنامہ ہے جو آپ سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا اسلام سے پہلے ایک انسان اپنے ہم جنسوں اور بھائی بندوں سے بالکل کنارہ کش اور بے تعلق ہو کر جنسوں میں رہتا تھا اور وہ خدا کی محبت کا حق دار بن جاتا تھا۔

حضرت عیسیٰ کے رامبوں، مہاتما بدھ کے بھکشوؤں اور جوگیوں کا یہی خیال تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی۔ اخلاقِ انسانی کی تعلیم اپنے دور کے لحاظ سے درست ہوگی لیکن انسانی ترقی اور انسانی تعلقات کی وسعت اور پھیلاؤ کے دور میں اسی تعلیم کی ضرورت تھی جو آخری معلم اخلاق نے پیش کی۔ اور یہی تکمیل اخلاق کا مطلب ہے۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اخلاقِ حسنہ



کما اصل مقصود خدا کی خوشنودی حاصل کرنا قرار دیا اور فرمایا:

اَخْلَصُوا اَعْمَالَكُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ اِلَّا مِنْ خَالِصٍ لَهُ رَحْمَةً ————— اپنے نیک اعمال میں اخلاص پیدا کرو کیونکہ خدا تعالیٰ وہی نیک قبول کرتا ہے جو اس کی رضا مندی کے لئے کی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیک اخلاق اختیار کرے اور اس سے تمہارا مقصد صرف یہ ہو کہ تمہارا خداتم سے خوش ہو جائے کسی پر احسان رکھنے اور اس سے بدلہ چاہنے کے لئے کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا اعلیٰ اخلاق کی روح کے خلاف ہے۔

اَخْلَصُوا وَلَهِيَّتُكَ يَهْدِيهِمْ جَسَّسٌ اَخْلَاقِي تَرْقِيْ كَ الْمَكَانَاتِ كِي كُوْنِيْ اَنْتَهَا نَهِيْ رَتَبِيْ۔  
قرآن کریم کی سب سے سچی وحی اور پہلے فرمان الہی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی تھی۔  
وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ سُوْرَةُ مَائِدَةِ ————— ”اے نبی! اصل اللہ علیہ وسلم تم کسی پر اس لئے احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ بدلہ چاہو۔“

اسی حکم کی تعمیل میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی اخلاص، سچائی اور بے غرضانہ انسانی محبت کا مکمل نمونہ نظر آتی ہے۔

۳۔ رحمتِ سالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کی میسر ہوئی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے خدا اور آخرت کے خوف سے لوگوں میں اخلاقِ حسنہ پر چپنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کی، پولیس اور فوج کا خارجی و باذہر وقت انسان پر قائم نہیں رہ سکتا ہیں خدا کا خوف اور آخرت کا یقین ہر لمحہ انسان کے اندر موجود رہتا ہے اور انسان کو ظلم و زیادتی سے بچا کر رحم و انصاف پر آمادہ کرتا ہے۔ قرآن کریم لوگوں کو کہتا ہے:

مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَاْبِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْفٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيُّنَ مَا كَانُوْا (سورۃ مجادلہ: ۴) ————— ”تین آدمی جب آپس میں سرگوشی کرتے ہیں تو چوتھا ان میں خدا ہوتا ہے اور جب پانچ آدمی کا ناچھوڑی کرتے ہیں تو چھٹا ان میں خدا ہوتا ہے اور اس سے کم ہو۔“

یہی یا اس سے زیادہ، ہر حال میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔  
دوسری جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:



مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (سورہ ق) ————— ”کوئی لفظ ان کے من سے نہیں نکلتا مگر اس کی نگہبانی کرنے والا محافظ موجود رہتا ہے“

خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کے قول و فعل کی دیکھ بھال، ہر برائی اور بھلائی پر حجبہ اور مزا کا اعلان، انسان کے دل میں ہر وقت، رات ہو یا دن، جلوت ہو یا خلوت، اندھیرا ہو یا اجالا، اپنے عیلم و خیر مالک کا خوف قائم رکھتا ہے۔ اور یہی خوف و تقویٰ اخلاق کے لئے قوتِ نافذہ ہے جو کسی کو دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور اسے زندگی میں نافذ اور بری کراتی ہے۔

اور پھر اس خوفِ خدا کے ذریعے اس کے اخلاقی احساس میں اتنی تازگی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ ذرا سی تنبیہ سے اس کا اخلاقی ضمیر پاک اُٹھتا ہے اور معمولی سی برائی سے اس کے دل میں ندامت چھلک لینے لگتی ہے، قرآنِ کریم نے انسانی احساس کی اسی کیفیت کے متعلق کہا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (سورہ اعراف) ————— ”بے شدہ منتفی اور ڈرنے والے وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی شیطان انہیں

چھوتا بھی ہے تو وہ چونکہ اٹھتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں“

۴۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی اور سماجی تعلقات کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اخلاق و شرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔

گھر والوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ اور بے ضرر شہریوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا معاملہ کرنا زیادہ مشکل نہیں لیکن سیاسی دشمنوں کے ساتھ اور حمد آور معاندوں کے ساتھ رحم و کرم اور شرافت و انصاف کا اعلیٰ پیمانہ کرنا بہت بڑے ندرت اور بہت اعلیٰ فطرتِ الٰہی بات ہے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق و شرافت کے اسی مشکل ترین کام کو آسان بنا کر دکھایا اور جس طرح خون کے رشتہ داروں کے ساتھ پیار و محبت کا پیمانہ کرنا اسی طرح خون کے پیاسوں پر رحم و کرم کی بارش فرمائی۔



# رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات

جود و کرم، صدقہ، خیرات، مالی امداد

۱۔ السخی قریب من اللہ، قریب من الناس، قریب من الجنة والبغیل بعید من اللہ، بعید من الناس، بعید من الجنة، قریب من النار۔ ”سخاوت کرنے والا، خدا سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے اور جنت سے بھی قریب ہے اور کجی کرنے والا، خدا سے دُور ہے، لوگوں سے دُور ہے، جنت سے دُور ہے اور دوزخ سے قریب ہے۔“

۲۔ من کان عندہ فضل ظہر فلیعده بہ علی من لا ظہر لہ ومن کان عندہ فضل زاد فلیعده بہ علی من لا زاد لہ حتی نطننا انہ لا حق لاحد منافی الفضل۔ ”جس شخص کے پاس سواری زاد ہو تو وہ اسے دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس ضروریات زندگی کا سامان زاد ہو تو وہ اسے دے دے جس کے پاس سامان زندگی نہ ہو حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی اس ہدایت سے ہم نے یہ خیال کیا کہ ہم میں سے کسی کو اپنے زاد از ضروریات سامان پر کوئی حق نہیں۔“

زید، ایشیا، قناعت اور سادگی:

علیکم بالقناعة فان القناعة مال لا ینفد۔ ”قناعت کو لازم پکڑو، کیونکہ قناعت ایسی دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

طوبی لمن ہدی لا سلام وکان عیشہ کفایاً وقنع۔ ”خوشخبری ہے اُس شخص کے لئے جسے اسلام کی ہدایت دی گئی اور اس کی زندگی بند ضرورت سے اور وہ قناعت اختیار کرتا ہے۔“

۱۔ تیسرے الاصول ج ۲ ص ۸۸، ۲۔ ایضاً ج ۲ ص ۹۱ والمنع من السنہ ج ۲ ص ۲۲۴ عن مسلم ومذہب احمد

۳۔ کنز العمال ج ۲ ص ۸۰ ۴۔ ایضاً العلوم ج ۳ ص ۲۰۶



## عفت نیک چلتی، کیرکٹر کی بلندی :

ليس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذيء (ترجمہ) ”وہ شخص مومن نہیں جو کسی کو عیب لگائے، چغلی خوری کرے یا کسی کو طعنہ دے اور نہ وہ شخص مومن ہے جو کسی کو کاپال دے، کسی کو شرمندہ کرے، کسی کو دھتکارے اور نہ وہ مومن ہے جو ید زبانی کرے، بے حیائی کرے، بدکاری کرے، اور نہ بد اسحاق، ید زبان اور بد چلن“۔

## صدق، سچائی :

عَزَّوَاللَّهِ الصَّدَقَاتُ اِنْ رَأَيْتُمْ فِيهِ الْهَلَكَةَ فَانْصِرْفُوا لِحَيْثُ رَأَيْتُمْ فِيهِ الْهَلَكَةَ فَانْصِرْفُوا لِحَيْثُ رَأَيْتُمْ فِيهِ الْهَلَكَةَ (ترجمہ) ”سچائی کا ارادہ کرو، سچائی پر قائم رہو اگرچہ تمہیں اس میں ہلاکت نظر آئے، کیونکہ اس میں بھلائی ہے اور چھوٹے سے دور رہو اگرچہ اس میں تمہیں نجات نظر آئے، بے شک اس میں ہلاکت ہے“۔

لَا يَحِلُّ الْكَذِبُ اِلَّا فِي ثَلَاثٍ، يُحَدِّثُ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ لِيَرْضِيَهَا وَالْكَذِبُ فِي الْحَرْبِ وَفِي الْاِصْلَاحِ بَيْنَ النَّاسِ (ترجمہ) ”تین سوتلوں پر چھوٹ بولنے کی اجازت ہے، شوہر اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لئے بولے، میدان جنگ میں اور لوگوں کے درمیان صلح سفاکی کرنے کے لئے“۔

## امانت و دیانت :

لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اِمَانَةَ لَهُ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا صِلَاةَ لَهُ (ترجمہ) ”اس شخص کے پاس کمال ایمان نہیں جو امانت والا نہیں اور اس کا دین کامل نہیں جو نماز پڑھنے والا نہیں“۔

## صبر و تحمل :

الصَّبْرُ مِنَ الْاِيْمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرُّوحِ مِنَ الْجَسَدِ (ترجمہ) ”ایمان کیلئے صبر ایسا ہے جیسے جسم کے لئے روح“۔

الصَّبْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ (ترجمہ) ”صبر ادا ایمان ہے“۔

۱۔ احیاء، ص ۱۴۳ ۲۔ کنز العمال، ص ۱۴۳ ۳۔ فتح الباری، ص ۱۴۳ ۴۔ کنز العمال، ص ۱۴۳ ۵۔ کنز العمال، ص ۱۴۳ ۶۔ کنز العمال، ص ۱۴۳





اختیار کرتا ہے اسے خدا تعالیٰ بلند کرتا ہے“

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبَرٍ ————— ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر غرور ہوگا“

**پابندی عہد :**

عِدَّةُ الْمُؤْمِنِينَ دِينٌ وَعِدَةُ الْمُؤْمِنِينَ كَالْأَخْذِ بِالْيَدِ ————— ”مومن کا وعدہ دین ہے اور مومن کا وعدہ ایسا ہے جیسے اس نے ہاتھ پکڑ لیا“

**دنیوی محنت و کسب :**

خَيْرُكُمْ مَنْ لَمْ يَدْعِ آخِرَتَهُ لِدُنْيَاكَ وَلَا دُنْيَاكَ لِآخِرَتِهِ ————— ”تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو آخرت کو دنیا کی وجہ سے نہ پھوڑے اور نہ دنیا کو آخرت کی وجہ سے ترک کرے“

**خوش طبعی :**

لَا خَيْرَ فِيمَنْ لَا يُطْرَبُ وَلَا يُطْرَبُ ————— ”اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو نہ خود خوش رتبا ہے اور نہ دوسروں کو خوش کرتا ہے“

كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ وَمِنَ الْمَعْرُوفِ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهِ طَلِقٍ ————— ”نیکوئیوں میں شامل ہے کہ تو اپنے بھائی سے ملے تو تیرا چہرہ خوش رخم ہو اور خندہ پیشانی کیسا تھ ملے“

**عدل و انصاف :**

وَلَا يَجْزِيَنَّكُمْ شَتَانُ قَوْمٍ عَلَى أَنْ لَا تَعْدِلُوا أَعْدِلُوا هَوَا حُوبُ لِلشَّقَوَى، وَالْقَوَا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ————— ”مسلمانو! کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان کے ساتھ بے انسانی کرنے لگو، انصاف کرو، وہ پرہیزگاری کے قریب ہے خدا سے ڈرو، بے شک خدا تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے“

الظُّلَمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ————— ”ظلم قیامت کے دن تاریکیاں بن کر نمودار ہوگا“

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

## مساوات و اخوت :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا  
 إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْوَىٰ ۚ ————— ”اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت  
 سے پیدا کیا اور تم کو مختلف خاندانوں اور برادریوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو اور  
 کا ذریعہ بنالو، بے شک تم میں بزرگ وہ ہے جو پرہیزگار ہے۔“  
 الناس كلهم سواك سنان المشط ۚ ————— ”تمام انسان آپس میں برابر ہیں جس طرح کنگی کے  
 دانتے۔“ (دندلے)۔

ان ربکم واحد، وان اباکم واحد، ولا فضل لعربی علی عجمی ولا عجمی علی عربی  
 ولا احمر علی اسود ولا اسود علی احمر الا بالتقویٰ، ان اکرمکم عند اللہ اتقکم، الا  
 هل یلتفت؟ فلیبلغ الشاهد الغائب ۚ ————— ”لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے  
 اور تمہارا باپ بھی ایک ہے اور کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور نہ کسی سُرخ کو کالے پر اور نہ کالے کو  
 سُرخ پر فضیلت حاصل ہے مگر تقویٰ سے۔ بے شک تم میں اللہ کے نزدیک بزرگ وہ ہے جو زیادہ  
 پرہیزگار ہے، کیا میں نے تمہیں پہنچا دیا؟ پس ہر حاضر کو چاہیے کہ وہ غیر حاضر کو میری بات پہنچا دے۔“  
 (آخری حج سے واپس آتے ہوئے مسلمانوں کے بہت بڑے اجتماع میں حضورؐ نے یہ تقریر فرمائی)۔

## شجاعت و قوت :

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (الأنبی) ————— ”جتنی قوت و طاقت تم  
 پیدا کر سکتے ہو وہ پیدا کرو۔“

المومن القوی خیر و احب الی اللہ من المومن الضعیف افضل الجہاد کلمۃ  
 حق عند سلطان جائز ۚ ————— ”طاقت و مومن بہتر ہے، کمزور مومن سے، اور خدا کو  
 پسند ہے بہترین جہاد حق بات کہنا ہے ظالم حاکم کے سامنے۔“

۱۔ سیدہ جرات ۲۔ کمزور ۳۔ کمزور اعمال ج ۲، ص ۲۲ ۴۔ مسلم کتاب القدر



## مشورہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ الْأَمْرُ الْأَمْرُ (۱) ————— ”اے نبی! تم اپنے رفیقوں سے مشورہ کیا کرو۔“  
 الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ ۱۰ ————— ”جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ صاحبِ امانت ہوتا ہے“  
 (پس غلط مشورہ دے کہ وہ خیانت کا ارتکاب نہ کرے)۔

اذا كان امراءكم خياريكم واغنياءكم اسنياءكم وامركم شوري بينكم فظهر  
 الارض خبير من بطنها واذا كان امراءكم شراريكم واغنياءكم غيلاءكم وامركم الى  
 نساءكم فبطن الارض خير من ظهرها ۱۱ ————— ”جب تمہارے امیر، تم میں سے  
 بہتر لوگ ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات مشورہ پر ہوں تو تمہارے لئے زمینی  
 کے اوپر زندہ رہنا، زمین کے اندر دفن ہونے سے بہتر ہے اور جب تمہارے امیر، بُرے لوگ ہوں  
 اور تمہارے مالدار کنجوس لوگ ہوں اور تمہارے معاملات غور توں پر چلیں تو تمہارے لئے زمین کے اندر  
 کا حصہ اوپر کے حصے سے بہتر ہے۔“

## اقتصادی خوشحالی:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۱۲  
 ————— ”جب تم نماز جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو خدا کی زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل (رزق)  
 تلاش کرو۔“

نعم العون على تقوى الله المال ۱۳ ————— ”بہترین مددگار تقویٰ کا مال ہے۔“  
 (مال سے خیر خیرات، حج و زکوٰۃ اور اہل و عیال اور دوسرے ضرورت مندوں کی کفالت  
 کی جاتی ہے، مال سے تسلیم و جہاد کا انتظام ہوتا ہے)۔



## نبوت سے پہلے چالیس سالہ اخلاقی کردار

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے عام دستور کے مطابق چالیس سال کی عمر میں منصب رسالت پر فائز ہوئے نبوت سے پہلے کا یہ لمبا دور آپؐ نے کس طرح گزارا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کے بعد معلم اخلاق ہو کر نمودار ہوتا تھا، اس لئے اس چالیس سالہ دور میں خدا تعالیٰ نے آپؐ کو نہایت بند اخلاقی کردار پر قائم فرمایا۔ اس دور میں آپؐ کے اخلاق میں صداقت، امانت، شرافت اور خدمت کے اوصاف اس قدر نمایاں ہوئے کہ آپؐ پوری قوم میں ایک غیر معمولی انسان نظر آنے لگے۔ \_\_\_\_\_ عبد اللہ کا یہ لال جب بطنِ مادر میں آیا تو اس کی قوم قحط اور خشک سالی کا شکار تھی۔ اس نورانی سچے کی آمد کی برکت سے مکہ کی خشک زمین سرسبز و شاداب ہو گئی۔ قریش نے اس سال کو فتح وابتہاج کا سال قرار دے دیا۔

پھر جب یہ بابرکت سچے عالم وجود میں آیا تو نبی بی آمنہؓ نے دیکھا کہ روشنی نمودار ہوئی جس نے مشرق سے مغرب تک ساری فضا کو روشن کر دیا۔ چچا عباسؓ نے ایک شعر میں اپنے بھتیجے کے متعلق کہا:

وانتَ لَمَّا دُلَّتْ اَشْرِقَتِ الارضُ واصْطاعتْ بتورثِ الافق \_\_\_\_\_ ”اور جب

آپؐ پیدا ہوئے تو ساری زمین روشن ہو گئی اور آپؐ کے نور سے سارا عالم منور ہو گیا۔“

آمنہؓ کے اس لال کو دودھ پلانے والی رضاعی ماں دائی حلیمہؓ کا بیان ہے کہ ہمارے قبیلہ بنی سعد میں قحط پڑا ہوا تھا اس لئے ہمارے قبیلہ کی عورتیں مکہ کے رئیس گھرانے کے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے مکہ معظمہ آئیں۔ خود خبابہؓ حلیمہؓ کا دودھ خشک ہو گیا تھا اور ان کی ادھنی کے قفس سوکھ گئے تھے جب حلیمہؓ اس دُرِ یتیم کو ساتھ لے کر حلیںؓ تو راستہ میں اس سچے کی برکتیں ظاہر ہونی شروع ہو گئیں۔ حلیمہؓ کی چھاتیاں دودھ سے بھر گئیں اور ان کے رُط کے عبد اللہؓ اور رضاعی بیٹے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) دونوں نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا۔ حلیمہؓ جب گھر پہنچیں تو ان کے شوہر حارثؓ نے کہا حلیمہؓ دیکھو!



ہماری اونٹنی کے تھن کس طرح سے بھرے ہوئے ہیں۔

رومانیہ کے نو مسلم عیسائی ادیب، کونستان جارج نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ۲۲ سال کی محنت کے بعد ایک کتاب (پیغمبر اسلام) لکھی ہے اس میں یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

رضاعت کے زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شوقِ صدر کا واقعہ پیش آیا جس میں فرشتگانِ الہی نے اس بچہ کا سینہ چاک کر کے اخلاقی علم و حکمت کی امانت اس بچہ کے سپرد کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا جناب عبد المطلب اپنی قوم کے سردار تھے۔ آپ کی مسندِ اہل بیت کی دیوار کے نیچے بچائی جاتی تھی اور آپ کی ساری اولاد مسند کے چاروں طرف فرش کے اوپر بیٹھی تھی۔ اس حالت میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو آپ بلا تکلف دادا کی گدی پر بیٹھ جاتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اس کو بے ادبی سمجھ کر آپ کو روکنا چاہتے مگر جناب عبد المطلب فرماتے، میرے بیٹے کو میرے پاس آنے دو، خدا کی قسم! اس کی شان ہی کچھ اور ہے۔ حضرت عباس نے ایک قصیدہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت ذات کی تعریف میں ایک شعر یہ بھی کہا ہے۔

و ابيض ليستسقى الغمام بوجهه ثمال اليتامى عصمة للارامل ذرقاني ج

”آپ صاحبِ حسن و جمال ہیں، آپ کے روئے انور کے طفیل بارش کی دعا کی جاتی ہے، آپ یتیموں کی پناہ اور یراؤں کے محافظ ہیں۔“

آخری مصرع میں آپ کے اخلاقی کردار کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

یتیمی کا داغ :

نبوت کی تاریخ میں ایک بچہ (موسیٰ) وہ تھا جو ماں باپ کی آغوشِ محبت سے جدا کر کے دشمن کی گود میں پہنچا یا گیا اور خدا تعالیٰ نے اس بچہ کے چہرہ پر محبت بکھیر دی تاکہ اس کے دشمن اس پر ہزار جان سے عاشق ہو جائیں۔ قرآن نے کہا۔

وَالْقَيِّتُ حَلِيْتُ مَحَبَّةٍ مِّنِّي وَلِئُصْنَعَ عَلَيَّ عَيْتِي (سورہ طہ) ————— ”اور میں نے

اے موسیٰ! تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا تاکہ تو میری آنکھوں کے سامنے پرورش پائے“

شاہ ولی اللہ نے محبت کا ترجمہ قبولیت کیا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نے لتصنعہ کا ترجمہ کیا ہے ”تاکہ تیار ہو تو میری آنکھ کے سامنے“ تیار ہو، کالفظ پر درش سے زیادہ جامع اور وسیع ہے۔ یعنی جو کام موسیٰؑ کو آگے چل کر نہ مانگنا اس کی تیاری شاہی محل کے اندر ہی ہو سکتی تھی یہاں حضرت موسیٰؑ کو شاہی غذا میں ملیں جس سے موسیٰؑ کے جسم میں طاقت آئی۔ شاہی محل کا خوف دل سے نکل گیا فرعون کی حکومت کی برائیاں شروع ہی سے موسیٰؑ کی آنکھوں کے سامنے آنے لگیں۔

یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے کس پر درش کو ”اپنی آنکھوں کے سامنے“ سے تعبیر کیا ہے؟ تو ظاہر ہے کہ ماں کی آغوش سے دور دشمن کی گود میں جو پر درش ہونے والی تھی اس کی طرت اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ جس خاص بندے کو ہم ظاہری سہاروں سے محروم کر دیتے ہیں اسے اپنی خصوصی نگرانی میں لے لیتے ہیں اور وہ ہماری خاص رحمت کے سایہ میں پروان چڑھتا ہے۔

اسی سنت الہی کے تحت موسیٰؑ فرعون کی گود میں چل کر جوان ہوئے اور حضرت یوسفؑ نے زندان مصر میں جوانی کی سخت منزلوں کو طے کیا اور اسی قانون قدرت کے تحت عبداللہؑ کا جنم دجسؑ ودرتیم نبایا گیا۔ یہ ودرتیم بی بی آمنہ کے شکم میں آیا تو باپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ ودرتیم چھ سال کا ہوا تو ماں کے سایہ عاطفت سے بھی محروم ہو گیا۔ دو سال دادا نے سرپرستی کی مگر خدا کو یہ ظاہری سہارا بھی گوارا نہ ہوا اور دادا خدا کو پیارے ہو گئے۔ پھر بھوپا ام امین اور چچا ابو طالب نے اس ودرتیم کی خدمت کر کے اپنے لئے سعادت کا سرمایہ جمع کیا۔

یہ ودرتیم اپنے پہلو میں حساس دل رکھتا تھا۔ پھر ماں باپ کی جدائی کا غم لے کیوں محسوس نہ ہوتا؟ روحانیہ کا یہ نو مسلم عیسائی مورخ اس ودرتیم کے احساس غم پر لکھتا ہے ”موت کے وقت جو لوگ حضرت آمنہ کے پاس موجود تھے انھوں نے دیکھا کہ کس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موت کی بے ہوشی کے عالم میں اپنی ماں کے کلیجے سے لپٹے ہوئے کہہ رہے ہیں۔“ اماں! تم جواب کیوں نہیں دینیں، خاموش کیوں رہیں؟“ لیکن خبابہ آمنہ کی روح پرواز کر چکی تھی۔

اسی طرح جب لوگ حضرت آمنہ کو دفن کر کے واپس آنے لگے تو دیکھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود



نہیں ہیں۔ ادھر ادھر تلاش کیا تو اس غم زدہ بچہ کو اپنی ماں کی قبر کے پاس مدتے ہوئے دیکھا اور اس وقت آپ کی زبانِ مبارک سے یہ جملے نکل رہے تھے: ”اماں! تم گھر کیوں نہیں جلتیں؟ شاید تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔“ (پیغمبر اسلام ص ۳۰)

**معصوم جوانی، قوت، امانت اور خدمت:**

ہونے والے رسول اور معلمِ اخلاق کا بچپن اپنے اندر غیر معمولی برکت رکھنے کی وجہ سے اپنے ماحول میں الگ اور ممتاز نظر آتا ہے اور اس کی جوانی، قوت، امانت اور خدمت کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے سبب اس کی صداقت کا کھلا نشان بنتی ہے اور نبی منصب نبوت پر سرفراز ہو کر اپنے اسی اعلیٰ کردار کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

نبوت کی پچھلی تاریخ میں جوانی کے دو کردار بہت مشہور ہیں، ایک کردار حضرت موسیٰ کا اور دوسرا حضرت یوسفؑ کا۔ حضرت یوسفؑ کا اخلاقی کردار امانت اور خدمت میں نمایاں شہرت رکھتا ہے۔ یوسفؑ ایک صاحبِ جمال نوجوان ہیں اور ایک صاحبِ جمال مصری خاتون (زلیخا) کے گھر میں ایک غلام کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں اور اس عورت کے مہنون احسان ہیں مگر جب وہ عورت اپنے اس پروردہ غلام کو دعوتِ عیش دیتی ہے تو یوسفؑ معاذ اللہ کہہ کر وہاں سے بھاگ پڑتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں جیل خانہ کی مشقت کا دور آ جاتا ہے۔ یوسفؑ جیل خانہ میں نہایت صبر و استقلال کے ساتھ قیدیوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان میں دعوتِ حق پھیلاتے ہیں۔ یہ امانت، شرافت اور خدمت کا اعلیٰ کردار ہے۔

دوسرا اخلاقی کردار جسے قرآنِ کریم نے نمایاں کر کے پیش کیا ہے حضرت موسیٰؑ کا ہے۔ یہ قوت، امانت اور خدمت کی تینوں صفتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ جس بادشاہ کی گود میں پلے ہیں اس بادشاہ کے مظالم اپنی قوم کے اوپر دیکھ کر بیتاب ہو جاتے ہیں اور ایک موقع پر ایک قطبی کو طمانچہ مار کر بے جان کر دیتے ہیں۔ یہ قوت اور جوش و جلال تھا۔ پھر اس جوشِ حق کی پاداش میں وطن سے نکالے جاتے ہیں اور حضرت شعیبؑ کے گھرانے کی خدمت کرتے ہیں۔ شعیبؑ کی بیٹی مصری نوجوان کو کنوڑی پر

پانی پلاتا دیکھ کر باپ سے کہتی ہے۔

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرَْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِينُ (سورہ قصص) ————— ”اے باپ! بلاشبہ اچھا ملازم وہ ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو۔“  
یہ نوجوان شعیبؑ کے گھر کی خدمت انجام دینے پر مقرر ہو جاتا ہے اور اس صلاح پسندی کی تربیت میں رہ کر اپنے اخلاقی کردار کو بچتہ کرتا ہے۔

اب نوجوان ہاشمی کو دیکھو! یہ کس ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے؟ ایک تاریک ماحول ہے، چوری، شراب اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، قومی شاعر اپنی بہنوں سے عشق بازی کرتے ہیں اور اس پر شاعری کرتے ہیں۔ بیٹیا اپنی سوتیلی بیوہ ماں سے شادی کرتا ہے۔ اس گندے معاشرے میں یہ ہاشمی نوجوان طاقت اور حسن و جمال کا پیکر ہے اور پھر تہذیب و شائستگی کا پتلا ہے۔ اس کا دل، اس کی نگاہ اور اس کے جذبات بے داغ ہیں، اس کا بہترین مشغلہ خلق خدا کی خدمت اور تلاش حق ہے۔

یوسفؑ کی شرافت اور موسیٰؑ کا جلال اس کے اعلیٰ اخلاقی کردار پر قربان ہے۔ قوم اسے ”الامین“ کہہ کر پکارنے لگتی ہے اور اس کے اعلیٰ اخلاقی کردار کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔  
**شرم و حیا:**

یہ بے حیا معاشرہ ہے۔ یہ لوگ کعبہ کے اندر ننگے ہو کر طواف کرنے کو عبادت شمار کرتے ہیں، لیکن یہ ہاشمی بچہ کس قدر حیا دار طبیعت رکھتا ہے۔ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر یہ اپنے بزرگوں کے ساتھ سر پر پتھر اٹھا اٹھا کر لارہا تھا، نرم و نازک جسم تھا، چچا عیاس کو ترس آیا کہ کہیں اس جسم نازک پر خراش نہ آجائے، اس خیال سے اس با حیا بچہ کا تہبند کھول کر اس کے سر پر باندھ دیا تاکہ سر کی حفاظت رہے، بس کیا تھا، ستر کھلتے ہی یہ بچہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں، چند منٹ کے بعد ہوش آیا تو آنکھیں کھولتے ہی فرمایا، میرا تہبند، میرا تہبند، بچا دوڑے اور بچتیجے کے تہبند باندھ دیا۔ (فتح الملہم جلد ۱ ص ۴۸۳)



ابو طہیل کا بیان ہے کہ آپ کو غیب سے آواز سنائی دی ”یا محمد عورت“ محمد ! اپنی شرم گاہ کا خیال رکھو، ستر کی حفاظت کرو۔ عالم غیب کی یہ پہلی آواز تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی۔

### جوانی میں ضبطِ نفس اور پاکبازی:

اس ہاشمی نوجوان نے جوانی میں نفسانی خواہش پر ضبط اور کنٹرول کی جو مثال قائم کی وہ یوسفؑ کی پاکبازی سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ ۲۵ سال کی عمر تک کا زمانہ جوانی کی رنگین اُمنگوں اور حسین دلوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ سارا دور اس جوان نے مجردہ گزارا اور اخلاقی کمر کھڑا اس قدر پاکیزہ رکھا کہ کسی دشمن کو آنکلی رکھنے کا موقع نہ ملا۔ ابو جہل اور اس کی پارٹی نے سخت سے سخت مخالفت کی۔ دیوانگی، جنون اور کہانت کے لیے بنیاد الزامات لگائے مگر اس صاف ستھرے نوجوان کے اخلاق پر طعنے کرنے کی کسی کوجرات نہ ہو سکی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چال چلن پر اگر یہ مخالف ذرا سا بھی داغ پالیتے تو آپ کے شخصی وقار کو گرانے کے لئے میل کا بیل اور تنکے کا شہتیر بنا دیتے لیکن جہاں اس کی جوانی چاند سورج سے زیادہ روشن چھوٹوں سے زیادہ پاکیزہ اور معطر تھی وہاں دشمن زبان کھولتے تو کس طرح۔

۲۵ سال اس طرح پاکبازی کے ساتھ گزار کر یہ نوجوان کسی دد شیرہ لڑکی سے نہیں بلکہ ایک بیوہ عورت (خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا) سے نکاح کرتا ہے جس کی عمر چالیس سال ہے۔ یہ دودھ پیوگی کے داغ سہہ چکی ہے۔ ہاں اس کا کمر کھڑا عرب کے گندے ماحول میں نہایت بلند ہے۔ قوم اس بیوہ کو ”طاہرہ“ کے لقب سے پکارتی ہے اور اسی خوبی کو یہ طاہر و طیب نوجوان پسند کرتا ہے۔ خود اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہے اور اپنی رفیقہ حیات کے لئے ایک نمونہ اخلاق خاتون کا انتخاب کرتا ہے۔

حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ۲۸ سال گزارے نبوت سے پہلے ۱۵ سال میں زیادہ وقت تجارت، خدمتِ خلق اور علمداری میں تلاشِ خدا میں صرف کیا اور ۱۳ سال نبوت کے بعد تبلیغ و دعوت کی بے پناہ سختیوں میں بسر ہوئے۔

یہ سارا درد نہایت محبت اور خوش گواری سے گدرا۔ ایک دن کل اور بد مزگی نہ ہوئی۔  
شکرہ و شکایت کی جگہ صبر و شکرہ اور باہمی تعاون قائم رہا۔

حضرت خدیجہؓ نے انتخاب کیوں کیا؟

خدیجہؓ کبرایٰ رضاعی کی کامیاب سوداگر خاتون تھیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تجارت میں شریک کر کے اور تجارتی قافلوں میں بھیج کر آپ کے اخلاقی کردار کا قریب تجربہ کر چکی تھیں اس لئے خود فرماتی ہیں۔

انی رغبت فیك لحسن خلقك وصدق حدیثك (اصح السیر ص ۱۱)

”میں نے آپ کو آپ کے اعلیٰ اخلاق اور زبان کی سچائی کی وجہ سے منتخب کیا ہے۔“

خدیجہؓ کبرایٰ رضاعی ایک مال دار خاتون تھیں اور قریش کے بڑے بڑے لوگ ان کے ساتھ شادی کرنے کے خواہشمند تھے، لیکن حضرت خدیجہؓ نے تمام سفیحات کو ٹھکرا کر آپ کو پسند کیا۔ خدیجہؓ کبرایٰ رضاعی کے رشتہ دار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غربت کے سبب اس رشتہ کو اچھا نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کو اس بات کا علم تھا چنانچہ آپ نے اپنے بھتیجے کی طرف سے خطبہ نکاح پڑھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاندار مستقبل کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

ان ابن ابی محمد بن عبد اللہ لا یوزن بہ رجل الارجم بہ شرفاً نبلاً وفضلًا

و عقلا و ان کان فی المال قل فان المال ظل زائل و امر حائل و هو و اللہ بعد ہذا  
لہ نبأٌ عظیم و خطر جلیل (اصح السیر ص ۱۱) ————— ”میرا یہ بھتیجا محمد صلی اللہ علیہ وسلم،

اس شان کا نوجوان ہے کہ جس شخص سے بھی اس کا مقابلہ شرافت، عقلمندی اور بزرگی میں کیا جائے تو یہ اس سے برتر ہو جائے گا، مگر مال و دولت ڈھلتے والا سایہ ہے اور یہ بدلنے والی چیز ہے اور یہ نوجوان نہ اکی قسم! اس کا مستقبل عظیم ہوگا اور اس کی بات ادنیٰ رہے گی۔

حق پسندی اس نوجوان کی فطرت تھی :

ایک گمراہ قوم میں اس نوجوان کی حق پسندی سارے ماحول میں اسے ممتاز کر دیتی ہے تین صدیوں



پھیلی ہوئی اداہم پرستی اس نوجوان کی پاک فطرت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ قدرت ہر قدم پر اس کی حفاظت کرتی ہے۔ اس نوجوان کا خاندان کبیرہ کا متولی ہے اور اس مذہبی منصب کی وجہ سے پوری قوم اس خاندان کی عزت کرتی ہے، لیکن اس عزت و سرداری کی طمع اسے چھپنے کی بھی جرأت نہیں کرتی یہ نوجوان مخلوق کے سامنے ٹھکنے سے بے زار نظر آتا ہے۔

اس کے سامنے بتوں کے چڑھاوے کا کھانا لایا جاتا ہے تو یہ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ میں تو صرف دہی چیز کھاتا ہوں جس پر خدا کا نام لیا جاتا ہے (فتح الباری ج ۱، ص ۱۰۰)۔ مذہبی تہواروں کو سماج میں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے مگر یہ ہاشمی جوان ان مشرکانہ تہواروں سے دُور رہتا ہے۔ چچا اور چچہ پھیاں تہوار میں اپنے بچے کے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتی ہیں مگر یہ انکار کر دیتا ہے اور جب رشتہ داروں کا زور پڑتا ہے تو گھر سے چلا جاتا ہے۔ واپسی پر گھر کی عورتیں پوچھتی ہیں تو جواب میں کہتا ہے کہ میری طبیعت پر کچھ اثر تھا۔ عورتیں سوچتی ہیں شاید جن بھوت کے اثر کا اس رٹ کے کوہم ہو گیا ہے۔ اس پر وہ کہتی ہیں۔

مَا كَانَ اللَّهُ لِيُتْلِيَهُ بِالْشَّيْطَانِ وَفِيكَ مِنْ خِصَالِ الْخَيْرِ (فتح الباری ایضاً)۔  
 ”بیٹا! یہ بات نہیں کہ خدا تم کو شیطان کے اثر میں مبتلا کرے گا۔ جب کہ تمہارے اندر اچھی عادتیں موجود ہیں۔“

یہ خاندان کی دانش ور عورتوں کی طرف سے اس نوجوان کی اخلاقی شان کا اقرار تھا۔ ایک تجارتی سفر میں اس ہاشمی سوداگر کا ایک گاہک سے کچھ اختلاف ہو گیا۔ وہ گاہک عرب کے دستور کے مطابق بولا: اَحْلَيْتَ بِاللَّاتِ وَالْعُزَّى۔ آپ لات و عزیٰ کی قسم کھائیے! آپ نے بڑی حقارت سے اس مطالبہ کو ٹھکراتے ہوئے کہا میں برگزائن بتوں کی قسم نہ کھاؤں گا (ابن سعد ج ۱)۔ اس نوجوان کی فطرت میں بت پرستی سے اس قدر نفرت اس ماحول میں کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ نوجوان خدا تعالیٰ کی مگرانی میں پرورش پاتا ہے۔ خدا ہی اس کا معلم و مربی ہے کیونکہ یہ منصب رسالت پر سرفراز ہو کر معلم اخلاق بننے والا ہے۔

جوانی میں گانا سننے سے پرہیز:

خدا تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کو ایسا پاکیزہ بنایا تھا کہ رسالت سے پہلے بھی آپ فضول اور بے کار کاموں سے دُور رہتے تھے اور آپ کی فطرت آپ کی حفاظت کرتی تھی۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُننا کہ جوانی میں جاہلیت کی کسی بات کا شوق میرے دل میں پیدا نہیں ہوا، سوائے دو موقوفوں کے مگر ان موقوفوں پر بھی خدا نے مجھے محفوظ رکھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنے ساتھ کیریاں چرانے والے ساتھی سے کہا تم میری کمریوں کا خیال رکھنا میں مگر جا کر قےتے کہانیاں سن آؤں۔ اس خیال سے میں جا رہا تھا کہ ایک مکان کے اندر سے مجھے گانے کی آواز آئی، میں نے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ اس گھر میں فلاں آدمی کی شادی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میں گانا سن لوں میں بیٹھ گیا۔ خدا تعالیٰ نے میرے کانوں پر فوراً مہر لگا دی اور میں سو گیا۔ خدا کی قسم! میں ایسا سو یا کہ سورج کی شعاعوں نے مجھے صبح کو بیدار کیا۔ صبح اُٹھ کر میں اپنے ساتھی کے پاس چراگاہ میں پہنچا۔ میرے ساتھی نے پوچھا، کہو کیا سُن کر آئے ہیں نے سارا واقعہ اسے سنایا۔

دوسرے دن پھر میرے دل میں وہی خیال پیدا ہوا اور میں پھر شہر کی طرف چل پڑا، مگر خدا تعالیٰ نے پھر مجھے سلا دیا اور میں گانا سننے سے محفوظ رہا۔ اس کے بعد پھر بھی مجھے اس طرح کی باتوں کا خیال نہیں آیا۔ (خصائص کبریٰ ج ۱، ص ۸۸)۔

یہ اس معلم اخلاق کی شان تھی جسے خدا تعالیٰ اخلاقِ حسنہ اور شائستگی کی تعلیم کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ ہم اس کی فطرت اتنی پاکیزہ کیوں نہ ہوتی؟  
دانش مندی کا ایک واقعہ:

اس نوجوان کے پاس جو دانش مندی اور سمجھ بوجھ ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے۔



ایک وحشی اور رٹنے مرنے والی قوم میں ایسا صلح پسند اور دور اندیش نوجوان حالات کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسے اس نوجوان کی شکل میں قدرت کا انعام عظیم ہی کہا جاسکتا ہے۔ غور کرو یہ صرف ۲۵ سالہ نوجوان ہے اور قریش کے بڑے بڑے دانشوروں کو اپنی دانش مندی سے حیرت میں ڈال رہا ہے۔

بیت اللہ میں حجر اسود نصب کرنے کا واقعہ مشہور ہے۔ قریش کعبہ کی از سر نو تعمیر سے فارغ ہو کر اس کی دیوار میں حجر اسود لگانے پر آپس میں جھگڑا کرنے لگے۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ سعادت ہمارے حصہ میں آئے۔ بات اتنی بڑھی کہ تلواریں نکل آئیں۔ خون سے بھرے پیالوں میں انگلیاں ڈبو کر قسمیں کھائی جانے لگیں۔ اور اسی جھگڑے میں چار دن لگ گئے۔ پانچویں دن قریش کے بوڑھے سردار ابو امیہ نے یہ تجویز پیش کی کہ جو شخص صبح کو سب سے پہلے کعبہ میں آجائے اسی کو اس جگہ کے میں ثالث بنالیا جائے۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔ صبح کو ہر شخص سب سے پہلے پہنچنے کے ارادہ سے جلدی جلدی گھر سے نکلا لیکن حرم میں داخل ہو کر سب نے یہ دیکھا کہ عرب کا وہ جوان سالہ و جوان نخت نوجوان کعبہ میں سب سے پہلے موجود ہے۔

قرارداد کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم بنا دیئے گئے۔ آپ چاہتے تو حجر اسود لگانے کا تنہا اپنے لئے فیصلہ کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس سعادت میں سب کو شریک کرنے کے لئے ایک تجویز پیش کی اور فرمایا، جو قبیلے اپنے آپ کو اس شرف کا حق دار سمجھتے ہیں وہ اپنا ایک ایک نمائندہ چن کر مجھے دیں، پھر آپ نے اپنی چادر مبارک بچھائی اور اس پر حجر اسود رکھ دیا اور ان نمائندوں سے کہا کہ اس چادر کو سب مل کر اٹھائیں اور دیوار کعبہ کے پاس رکھ دیں اور پھر آپ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔

اس واقعہ سے اس نوجوان کی صلح پسندی اور دانش مندی کی دھاک بیٹھ گئی اور سرداران قوم کے سر اس کی اخلاقی عظمت کے سامنے جھک گئے (خصائص کبریٰ جلال الدین سیوطی ص ۹۸) معاہدہ امن میں شرکت اور تعاون: یہ بااخلاق نوجوان اپنی قوم کے برے اور غلط کاموں

سے کوسوں دور رہتا ہے۔ مگر اچھی باتوں میں تعاون کا موقع آتا ہے تو اس وقت قوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ حرب فجار (قریش کی مشہور جنگ) کے بعد قریش کے دانشوروں نے امن کے پرانے معاہدہ کو زندہ کرنا چاہا اور اس (حلف الفضول) کے لئے ایک اجتماع بلایا۔ اس امن پسند نوجوان نے اس اجتماع میں شرکت کی اور معاہدہ امن میں حصہ لیا۔ اس معاہدہ میں درج تھا۔

۱۔ سب مل کر حق و انصاف کی حمایت کریں گے۔ ظالم اپنا ہویا غیر اس سے مظلوم کا حق دلوں کر دیں گے۔

۲۔ بے روزگار لوگوں کے ساتھ اظہارِ مہر و مہر دی کریں گے۔

امن و امان قائم رکھنے اور مجھوکوں اور پریشانی حال لوگوں کی مدد کرنے کے سلسلہ میں یہ اہم اقدام تھا جس میں اس صالح نوجوان نے شرکت کی اور پھر قریش کے لوگ تو اس پر قائم نہ رہ سکے لیکن آپ نے اپنی ساری زندگی اسی مشن کے لئے وقف کر دی۔

نبوت کے بعد ایک دفعہ حلف الفضول کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا، اسلام کے بعد آج بھی اگر اس قسم کے معاہدہ کے لئے کوئی مجھے دعوت دے تو میں اسے ضرور قبول کروں گا یعنی مسلم ہو یا غیر مسلم، اچھے کاموں میں سب کے ساتھ تعاون کرنا اسلام کا بنیادی مقصد ہے میں اس پر قائم رہوں گا۔ (ابن سعد ج ۱ ص ۸۲)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کا خراج عقیدت :

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی چالیس سالہ زندگی کا یہ مختصر خاکہ ہے جو شرافت، امانت اور خدمت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اخلاقی کردار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وحی الہی کی پہلی آمد کے موقع پر حضرت خدیجہ کبریٰ نے فرمایا تھا۔

واللہ ما یجزیک اللہ ابداً انک لتصل الرحم وتحمل الكل وتکسب المعدم وتقرى الضیف وتعين على نوائب الحق

”خدا کی قسم! خدا تعالیٰ کبھی آپ کو رسوا



نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں بیرونہ داروں کو کمانے کے قابل کرتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر کرتے ہیں اور لوگوں کی جائزہ مصیبت میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے بڑوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اپنے بڑوں کے ساتھ اخلاق کا نہایت شریفانہ کردار ملتا ہے۔ ایک بیٹا، ایک بھائی اور ایک بھتیجا، بھانجا، بڑے مقام پر پہنچ کر اپنے بڑوں کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ، چچا اور ماموں کے ساتھ ادب و احترام کا کتنا ادب بڑا دکھاتا ہے؟ اس نمونہ کے لئے ہمیں اس آخری معلم اخلاق کی گھریلو زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

نبوت کی تاریخ میں قرآن کریم نے شریف بیٹے کے طور پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا اخلاقی اسوہ حسنہ پیش کیا ہے اور شریف بھائی کے طور پر حضرت یوسفؑ کو نمایاں کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر کے ساتھ نہایت اعلیٰ اخلاق پیش کئے۔ باپ نے توحید الہی کا پیغام سنانے پر ابراہیمؑ کو گھر سے نکالا۔ ابراہیمؑ نے اس تکلیف دہ برتاؤ کے باوجود باپ کے حق میں دعا خیر کی۔ حضرت اسماعیلؑ نے اپنے باپ ابراہیمؑ کے حکم پر اپنا گلا چھری کے نیچے رکھ دیا اور ایک اطاعت شعار بیٹے کا آخری نمونہ دنیا کو دکھایا۔ حضرت یوسفؑ نے کنوئیں میں ڈالنے والے اور غلام کی طرح بیچنے والے بھائیوں کے ساتھ شرافت اور سخاوت کا اعلیٰ اخلاقی سلوک کیا۔

حضرت یوسفؑ جب امتحان کی ساری منزلوں سے گزر کر مصر کے تخت شاہی پر بیٹھے اور برادرانِ یوسفؑ قحط سے تنگ آئے ہوئے بھکاریوں کی طرح شاہِ مصر یوسفؑ کے سامنے حاضر ہوئے تو بھائی نے بے خبری کے سارے پردے اٹھاتے ہوئے اپنے بھائیوں کو یاد دلایا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ قَالُوا لَا نَدْرِي يَوْسُفُ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي فَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مِنْ يَتَّى وَيَصِيرَ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ أَشْرَكْنَا بِاللَّهِ عَالِمِينَ وَإِنْ كُنَّا لَخَا طِئِينَ قَالَ لَا تَزِرُ وَبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يُعْذِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (سورہ یوسف) ————— "یوسفؑ"

بولے، کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی بن یامین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ وہ بولے، کیا آپ یوسفؑ میں؟ یوسفؑ نے کہا، ہاں میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے ہم سب پر خدا نے انعام فرمایا، بیشک جو شخص برائیوں سے بچتا ہے اور مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر و ثواب سنائے نہیں کرتا۔ وہ بولے، خدا کی قسم! خدا نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ ہم سب قصور و اہم ہیں۔ یوسفؑ بولے آج تم پر کوئی سزائش نہیں۔ اللہ تم کو معاف فرماے گا اور وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔“

بھائیوں نے اچانک اور خلاف توقع یوسفؑ کو غصت کے مقام پر دکھایا، شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ یوسفؑ نے بغیر کسی تاخیر کے بھائیوں کو معاف کر دیا کسی قسم کی ملامت نہ کی۔ ایک لفظ طنز و طعنے کا زبان پر نہ لائے اور ان کے حرمین و دعا کی اور اس سے بھی اونچے بات یہ کہ رجب انہیں کھلی باتیں یاد دلانیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا یہ اس وقت کی بات ہے جب تم نادان تھے۔ یعنی غلطی یاد بھی دلائی تو اس انداز سے کہ خود ہی صحتی بھی پیش کر دی کہ تم نادانی کی حالت میں ایسی غلطی نہ بیٹھے تھے۔

شرافت اور ادب کے اخلاق کی یہ کتنی اعلیٰ مثال ہے لیکن رسولِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ایک شریف بیٹے اور شریف بھائی کا جو بے مثال نمونہ ہے وہ مجموعی حیثیت سے نبوت کی پوری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

ماں باپ کے لئے دعا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوان ہونے سے پہلے ہی آپ کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور آپ کو ان کی خدمت کا موقع نہیں ملا تھا لیکن آپ اپنے بزرگ باپ اور پیاری ماں کو بھول نہیں سکتے تھے۔ سب سے پہلے یہ بیان کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار کے قریب جابہ تھے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان جب آپ اس مقدس مقام پر پہنچے، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ مدفون تھیں تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا، تم غصہ کے پاس ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ آپ کچھ



دور جا کر قبر مبارک کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ فذل علی قبر — فجلس علی قبر پھر آپ نے دعا کرنی شروع کی۔ دعا کرتے کرتے آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روتے سے بے قابو ہو گئے اور خود بھی رونے لگے۔ دعا سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا، تم کیوں روتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا، آپ کی گریہ وزاری نے ہمیں بھی بیقرار کر دیا اور ہم یہ سمجھے کہ شاید خدا تعالیٰ کی طرف سے امت کے لئے کوئی سخت حکم نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسا نہیں ہوا۔ یہ میری ماں کا مزار ہے۔ میں نے اپنی ماں کے لئے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی۔ خدا تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ مجھ پر ایمان لائیں محدثین کہتے ہیں، حضرت آمنہ کی یہ زندگی اسی طرح ہے جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے خدا تعالیٰ نے دوتے سورج کو دوبارہ واپس کیا اور آپ نے عصر کی نماز ادا فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر سورہ قمر ص ۳۹۳)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یتیم ہونے کے بعد آپ کے چچا جناب ابوطالب نے باپ کی طرح اپنے بھتیجے کی پرورش کی اور ہر مصیبت میں بھتیجے کا ساتھ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر تھے مگر آپ کے مرتبہ کی بڑائی نے کبھی آپ کو اپنے بڑوں کی عزت سے نہیں روکا۔ غریب چچا کا تجارت میں ہاتھ بٹایا۔ مکہ میں ابوطالب کی دکان تھی اس پر آپ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ چچا بیمار ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم چچا کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے چچا نے بھتیجے سے کہا، بیٹا! کیا تم خالی مزاج پرسی کے لئے آئے ہو؟ جس خدا نے تمہیں رسول بنایا ہے اس خدا سے تم میری تندرستی کے لئے دعا کیوں نہیں کرتے؟ بھتیجے نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ رحمت الہی کہ جوش آگیا۔ دعا قبول ہوئی اور ابوطالب کے کانٹا سا نکل گیا۔ ابوطالب اٹھ کر بیٹھ گئے اور بوسے، محمد! خدا تمہارا کہنا مانا ہے۔ آپ نے تبلیغ کا موقع پا کر کہا، چچا جان! اگر آپ بھی میرا کہنا مان لیں تو خدا تعالیٰ آپ کا بھی کہنا مانے لگے۔ (سیرت النبی جلد اول)

ابوطالب زندگی بھر تو اپنے قومی مذہب پر قائم رہے مگر جب بیمار پڑے تو بھتیجے کی زبان سے لا الہ الا اللہ سن کر ایمان سے مشرف ہو گئے۔ موت کے وقت ان کے بھائی حضرت عباس ابوطالب کے

کے پاس کھڑے تھے۔ جب ابوطالب کے لب بٹنے لگے تو حضرت عباس نے اپنے کان ان کے منہ سے لگا کر ان کی آواز سنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا بھتیجے! تم نے سنا جو کلمہ میرے بھائی کے سامنے پیش کیا تھا، میرے بھائی نے اس کلمہ پر جان دی ہے۔ (سیرت ابن ہشام ص ۱۴۶) علامہ شبلیؒ نے جناب ابوطالب کے ایمان کی روایت کو ترجیح دی ہے اور جن حضرات نے دوسری روایت کو اختیار کیا ہے انہوں نے جناب ابوطالب کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کو دیکھتے ہوئے کفر و ایمان کے مسئلہ میں سکوت کو اولیٰ اور بہتر کہا ہے (دیکھو علامہ شبیر احمد عثمانی کا تفسیری حاشیہ سورہ توبہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا)۔

### رضاعی ماں باپ کی عزت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رضاعی ماں باپ کی بھی بہت عزت کرتے تھے اور حقیقی ماں باپ کی طرح ہی پرورش کرنے والے ماں باپ کا حق مانتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئیں تو آپ بچوں کی طرح ”میری ماں، میری ماں“ کہہ کر ان سے پیٹ گئے۔ حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے تو دیکھتے ہی اپنی چادر پاک ان کے لئے زمین پر ڈال دی اور حارث نے قیامت کے متعلق پوچھا تو آپؐ نے فرمایا، ابا جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو تباؤں گا کہ دیکھو ابا! یہ قیامت قائم ہوگئی ہے حضرت حارث رضیہ واقعہ بڑے والہانہ انداز سے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرا بیٹا جب قیامت کے دن میرا ہاتھ پکڑے گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے جنت سے دے نہیں چھوڑے گا۔

### چچی کی لحد اپنے ہاتھ سے بنائی:

حضرت فاطمہ بنت اسد جناب ابوطالب کی بیوی تھیں۔ فاطمہ نے شوہر کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا وہی سلوک کیا جو ان کے شوہر کرتے تھے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی چچی کو ماں کے برابر سمجھا۔ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ نے جذب القلوب میں لکھا ہے کہ جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

چچا ابوطالب کے بعد فاطمہ بنت اسد سے زیادہ میرے ساتھ کوئی بھلائی کرنے والا نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر میں خود اترے اور اپنے ہاتھ سے لحد بنائی اور اپنے ہاتھ سے مٹی نکالی اور پھر اس قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ گئے پھر قبر کے سر ہاتھ کھڑے ہو کر فرمایا:

جزاك الله من امر و ربيبة - خيرا فنعلم الام و نعم الربيبه -

”اے میری ماں! اور اے میری پالنے والی! خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ کتنی اچھی ماں تھیں اور کتنی اچھی پالنے والی“

آپ نے فرمایا میں نے فاطمہ کو کفن کے لئے کرتہ دیا تھا تاکہ خدا تعالیٰ انہیں ہشتی حدہ عطا فرمائے اور میں ان کی قبر میں لیٹا تاکہ خدا تعالیٰ اسے وسیع کر دے۔ (ترجمہ جذبات القلوب مطبوعہ کراچی ص ۲۱۴)۔  
کتنے شریف بیٹے اور شریف بھتیجے اور شریف بھائی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہ شرافت بھی اس شریف انسان پر ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔

### دادا کی وفات پر:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھر بھی ام ایمن فرماتی ہیں کہ جس وقت جناب عبدالمطلب جنازہ اٹھا تو میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ جنازے کے پیچھے روتے ہوئے جا رہے تھے اس وقت آپ کی عمر شریف آٹھ سال کی تھی۔ (ابن سعد ج ۱ ص ۷۴)۔  
اپنے چھوٹوں کیساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھوٹوں کے ساتھ محبت اور پیار کا بہترین برتاؤ کرتے تھے وہاں محبت کے جوش میں کبھی چھوٹوں کی تربیت اور فہمائش سے غفلت نہیں فرماتے تھے۔ محبت کے وقت محبت اور نصیحت کے وقت نصیحت، یہ آپ کا اخلاقی اصول تھا۔ آپ نے باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد کے ساتھ، نانا کی حیثیت سے اپنے نواسوں کے ساتھ، چچا کی حیثیت سے اپنی بھتیجی کے ساتھ اور ایک اقا کی حیثیت سے اپنے خادموں کیساتھ کتنا اعلیٰ اخلاقی برتاؤ کیا۔ اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔



عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایک انسان اگر روحانی آدمی بنتا ہے تو بال بچوں سے بے تعلق ہو جاتا ہے اور اگر دنیا داری کی طرف جھکتا ہے تو بال بچوں کی محبت میں غرق ہو کر مذہب اخلاق کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک ایسے اخلاق کی زندگی ہے جس میں بال بچوں کے لئے بے پناہ محبت بھی ہے اور آخرت کے خیال سے ان کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا اہتمام بھی ہے۔ یہی معتدل اخلاقی اسوہ سالم انسانیت کے لئے قابل تقلید ہو سکتا ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی سیرت پاک کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ آپ نے تمدن و سیاست کے بڑے کاموں میں مشغول رہ کر بھی اپنی اولاد اور اپنی امت کی تعلیم و تربیت کے نہایت چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی پوری توجہ فرمائی۔

### حضرت سیدہ کبریٰ اور ان کے بچوں سے محبت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی چھوٹی لڑکی خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بچی محبت تھی۔ روزانہ عشاء کے بعد حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی خبر لینے کے لئے ان کے مکان پر تشریف لیجاتے بیٹے کو آتا دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ دیتے، کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے، ان کے بچوں کو حسین کو کندھوں پر لئے پھرتے، خطبہ دیتے ہوئے نواسوں کو مسجد میں آہٹا دیکھتے تو منبر سے اتر کر انہیں گودیں اٹھا لیتے اور منبر کے پاس بٹھا لیتے۔ بیٹی داماد کو سوتا ہوا پاتے تو نواسوں کو اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ نکال کر پلاتے اور انہیں تھپک کر پھر سلا دیتے۔

چوہہ ماد کے بچے ابراہیم کا انتقال ہو گیا تو بیٹے کی جدائی کے غم میں عام انسانوں کی طرح رونے لگے اور اظہارِ غم کے طور پر فرمایا:

”اللہ یا ابراہیم انا یفراقک لمحزون —————“ خدا کی قسم اے ابراہیم! میں تیری جدائی سے مغموم ہوں۔“

ابراہیم سے اس قدر محبت فرماتے کہ جس دایہ کے پاس ابراہیم دودھ پینے کے لئے چوڑے گئے تھے وہ ایک لوار کی بیوی تھی۔ آپ بیٹے کو دیکھنے اس کے گھر تشریف لے جاتے

لوہار کی بھٹی کا دھواں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں اور ناک میں گھستار تھا، آپ نازک طبع ہونے کے باوجود اس دھویں کو بچے کی محبت میں برداشت کرتے۔ انہیں ابراہیم کی پیدائش کی جس غلام نے خوشخبری سنائی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو آزاد کر دیا تھا یہ کئی بیٹیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بہت چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ اپنے محبوب کی آرزو کے اس بچہ کو کھلا رکھے۔ ابراہیم خدا کو پیارے ہو گئے اور خدا تعالیٰ نے بیٹے کے بغیر صرف بیٹیوں سے آپ کا نام چلایا۔ حضور کی تمام اولاد حضرت خدیجہ کبریٰ کے بطن سے تھی۔ صرف حضرت ابراہیم، حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ ایک اعرابی صحابی حضرت اقرع بن جاس در باندہ بوی میں حاضر تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہما آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گود میں لے کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ دیہاتی لوگ سخت مزاج ہوتے ہیں۔ حضرت اقرع کو یہ بات وقارِ نبوت کے خلاف محسوس ہوئی۔ یہ بولے، حضور! میرے تو دوست بچے ہیں میں نے ان میں سے کسی کو اس طرح پیار نہیں کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا، اقرع! جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ دوسری روایت میں یہ الفاظ اور دیا دہ ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ (بخاری کتاب الادب)۔

لڑکیوں کے ہلاک کرتے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا :

ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنی لڑکیوں کو ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ میری لڑکی تھی جو مجھ سے بہت ہی محبت کرتی تھی۔ میں اس کو بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن میں نے اسے آواز دی وہ دوڑ کر میرے پاس آئی۔ میں اگے اگے چلتا رہا اور وہ میرے پیچھے پیچھے آتی رہی، یہاں تک کہ گھر کے پاس ایک کنواں تھا میں اس کنویں پر آیا۔ اپنی بچی کو پکڑا اور اس کنویں میں ڈال دیا وہ آتا پکا رتی رہی اور یہی اس کی آخری آواز تھی۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس درد بھرے افسانے کو سن کر رونے لگے۔ ایک صحابی نے اس سنانے والے شخص کو برا بھلا کہا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غمگین کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے کچھ نہ کہو جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔ پھر اس شخص سے فرمایا، ہاں، میاں تم مجھے اپنا یہ قصہ پھر سناؤ انھوں نے دوبارہ بیان کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک (ڈاڑھی) آنسو سے تر ہو گئی۔ پھر فرمایا، جاؤ، جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے۔ اب نئے سرے سے زندگی بناؤ۔ (سیرت النبی ج ۶ ص ۱۶۲)۔

### تعلیم و تربیت کی سختی :

اس محبت و شفقت کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین و اخلاق کے معاملوں میں اولاد کے ساتھ کبھی نرمی نہیں برتی، قبیلہ غزہ کی ایک خاتون فاطمہؓ سے چوری کا ایک جرم سرزد ہو گیا۔ ان کے رشتہ داروں نے حضرت اسامہؓ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفارش پہنچائی۔ سفارٹل سن کر آپؐ نے فرمایا، خدا کی قسم! اس فاطمہ کی جگہ اگر میری لخت جگر فاطمہ بھی ہوتی اور چوری کا الزام ثابت ہو جاتا تو میں اس کا ہاتھ کاٹنے میں بھی دیر نہ کرتا۔

اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کو سخت تنبیہ فرمائی کہ میں اخلاق و قانون کے معاملہ میں کسی قسم کی نرمی اختیار نہیں کر سکتا۔ میری اولاد میری محبت کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ تاریخ میں بیٹی و اماد کو نصیحت کرنے اور داماد کی طرف سے لاڈ اور پیار کا ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہے۔ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی وقت ہمارے گھر تشریف لائے اور مجھے اور خاتونِ جنت کو مخاطب کر کے فرمایا، اَلَا تَصَدِّقْنَ ؟ کیا تم دونوں نے غارِ پڑھ لی ؟ میں بولا، یا رسول اللہ ! اِنَّمَا اِنْفِشْنَا بِمِثْلِ اللّٰهِ فَاِذَا شَاءَ اَنْ يَّبْعَثَنَا يَبْعَثْنَا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ! ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں پس وہ جب



پاہتا ہے یہیں اٹھاتا ہے اور ہم اٹھ جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں، میرا جواب سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور آپؐ جاتے ہوئے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے جاتے تھے اور فرماتے تھے:

«كان الانسان اكثر شئ عجداً» (ابوداؤد) ————— «انسان بڑا ہی جبرکڑا ہے»

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے جواب میں حضرت علیؓ نے جو کچھ کہا اس میں اپنے بڑے چچیرے بھائی اور اپنے خسر کے ساتھ ناز و پیار کا فطری انداز پوشیدہ ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت علیؓ نے تقدیر و مشیت کا بہانہ بنا کر ہمیں سے بچنے کی کوشش کی۔

**حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی یتیم بچی کے ساتھ محبت:**

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سمجھوتہ کے مطابق ۶ میں عمرہ ادا کیا۔ عمرہ سے واپسی کے وقت ایک عجیب دل دوز واقعہ پیش آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید چچا حضرت حمزہؓ کی یتیم لڑکی امامہؓ اپنی تنہالی میں مکہ ہی میں رہ گئی تھی۔ اتفاق سے اس بچی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر پڑ گئی وہ دیکھتے ہی چچا، چچا پکارتی ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑی حضور صلی اللہ علیہ وسلم رشتہ میں چچا زاد بھائی تھے مگر بچی نے احترام کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چچا کہہ کر پکارا۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی کھڑے تھے انہوں نے امامہ کو گود میں اٹھ لیا۔ امامہ کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے بھائی جعفرؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زیدؓ بھی علیؓ کے پاس آگئے۔

اب ان تینوں بزرگوں نے امامہ کو لینے کے لئے آپس میں جھگڑا شروع کر دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور چچا حمزہؓ کی مظلومانہ شہادت کا خیال آ رہا تھا:

آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا:

«انت صني وانا منك» ————— «علیؓ! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں»

حضرت زید رحمہ سے کہا:

انت اخوتنا و مولانا ————— ”زید! تم میرے بھائی اور میرے دوست ہو“

جعفر رحمہ سے کہا:

اشبهت خلقتی و خلقتی ————— ”جعفر! تم صورت اور سیرت میں مجھ سے مشابہ ہو“

اور پھر امامہ کو جعفر رحمہ کی بیوی اسماء کے سپرد کر دیا جو امامہ کی خالہ تھیں اور فرمایا، خالہ ماں

کے برابر ہوتی ہے۔ (ابن کثیر ج ۴، ص ۲۰۳)

گھر کے خادم سے محبت:

حضرت انس رحمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہیں۔ بچپن میں ان کی والدہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کام کاج کے سلسلہ میں مجھ پر کبھی ناراض نہیں ہوئے صرف ایک دفعہ ایسا موالہ آپ نے مجھے کسی کام کے لئے بیبا میں بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھنے کے لئے باہر نکلے اور کھیلتے ہوئے پکڑ لیا اور فرمایا، کھیل میں لگ گیا؟ بی بی پتا ہے کہ اسے مسواک سے تمہیں خوب ماروں پس یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی ناراضگی تھی۔

ماں باپ کے حقوق کی تعلیم:

ادب والدین اور دوسرے بڑے رشتہ داروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اخلاق کا ذکر کیا گیا جس میں بڑوں کا ادب، بڑوں کی عزت و احترام اور ان کی خدمت کا نہایت بلند نمونہ نظر آتا ہے۔

اس باب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے بھی ماں باپ کی عزت و خدمت کے ایک ایک گوشہ کی وضاحت کی ہے۔ اور والدین کے اولاد پر حقوق اور اولاد کے ماں باپ پر فرائض و دنوں کی مکمل تشریح کی ہے۔ اور اسی کے ساتھ اپنی شان تکمیلی کا رنگ بھی برقرار رکھا ہے اور ہر قدم پر تشدد اور مبالغہ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، توراۃ نے ماں باپ کو برا بھلا کہنے والے کے لئے

تعزیری قانون بنایا ہے اور ایسی نافرمان اور گستاخ اولاد کے لئے قتل کرنے کی تجویز رکھی ہے اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن طعن کرے، تورات کہتی ہے کہ اسے مار ڈالا جائے (اجارہ ۱۰۲)۔ انجیل عام طور پر تورات کے سخت احکام کو نرم کرتی ہے مگر اس حکم کو اسی طرح برقرار رکھتی ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تورات کے اس حکم میں تخفیف کرتے ہوئے نافرمانی کی سزا آزارت پر اٹھا رکھتے ہیں جو جہنم سے مگر دنیا کی سزا منسوخ فرما دیتے ہیں۔

### ماں باپ کے فرائض کی تعلیم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت باپ کے اولاد کے حقوق غلطی طور پر کس طرح ادا کئے؟ اور اس کا مختصر ذکر کیا گیا۔

اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی نہایت مکمل اور جامع ہے ایک جامع حدیث میں فرمایا: من لم یرحم صغیرنا و لم یوقر کبیرنا فلیس متا (ترمذی)۔  
 ”جو بڑا ہو کہ چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور چھوٹا ہو کہ بڑوں کے ساتھ ادب سے پیش نہ آئے وہ ہم میں سے نہیں ہے“

تمام معلمین انسان اور حکماء نے ماں باپ اور اولاد کے حقوق و فرائض کا جو بے پایاں دستر دمع کیا ہے اسے ایک طرف رکھئے اور آنری معلم اخلاق کا یہ ایک جملہ ایک طرف رکھئے آپ کو نظر آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملہ کی جامعیت نے دریا کو کوڑھ میں بند کرنے کی شاندار مثال پیش کی ہے۔

اگلی شریعتوں میں بڑوں کے حقوق تو بیان کئے گئے ہیں مگر ان کے فرائض کی طرف سے مکمل ملاحظہ رہی ہے لیکن اسلام نے فرائض والدین پر بھی ایک جامع قانون مرتب کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کو استعاطی حمل اور بلا ضرورت عزل سے روکا۔ عربوں میں اذکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا۔ اسے ختم کیا۔ بتوں کے نام پر اولاد کی قربانی کا رواج تھا اسے منسوخ کیا۔



بیٹیوں کے ساتھ نفرت کو محبت میں تبدیل کیا۔ پھوٹے بچوں کی پرورش، رخصت اور حضانہ کی ذمہ داری ماں باپ پر ڈالی اور اس کے لئے ممکن قانون بنایا۔

ماں باپ پر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری عائد کی اور فرمایا کہ ماں باپ سے اولاد کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ انھوں نے اولاد کو کس طرح اٹھایا۔

قرآن کریم میں فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (سورہ تحریم) ————— ”مسلمانو!

اپنی جانوں اور اپنے مال بچوں کو عذابِ جہنم سے بچاؤ۔

حکم دیا کہ لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح نہ دی جائے۔

ارشاد فرمایا: جو مسلمان لڑکیوں پر لڑکوں کو ترجیح نہ دے گا اور ان کی بے عزتی نہ کرے گا تو خدا تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ (ترمذی کتاب البر والصدقہ)۔

اگلی شریعتوں میں پہلوٹھے اور بڑے بیٹے کو دوسری اولاد کے مقابلہ میں ترجیح حاصل تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اولاد کے درمیان انصاف اور مساوات کو ضروری قرار دیا۔

ایک صحابی نے اپنے بڑے لڑکے کو غلام مہبہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس علیہ پر گواہ بننے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا:

کیا تم نے تمام اولاد کو ایک ایک غلام دیا ہے؟ اس نے انکار کیا۔ آپ نے فرمایا میں اس ظالمہ عطیہ پر گواہ نہیں بن سکتا۔ (ابوداؤد کتاب البیوع)

اچھی تربیت اور اچھی تعلیم کے لئے اہتمام:

اسلام نے اولاد کے لئے اچھی سے اچھی تعلیم اور اعلیٰ سے اعلیٰ تربیت کا انتظام ضروری قرار دیا ہے اور اس کے لئے تمام بہتر تدبیریں اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

تَعُوذُوا بِاللّٰهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَمِنْ دَرَكِ الشَّقَاءِ وَمِنْ سُوءِ الْقَضَاءِ  
”لوگو! خدا تعالیٰ سے پناہ مانگو کرو امتحان کی سختی سے، برائی کے ملنے سے اور بُرے فیصلے سے“  
صاحب مشکوٰۃ نے کتاب الاستعاذۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت نقل فرمائی ہے

حدیث کے شارحین نے جہد بلا، یعنی امتحان کی سنتی کی شرح میں لکھا ہے۔

من قلة المال وكثرة العيال ————— "امتحان کی شدت یہ ہے کہ مال کی کمی اور اولاد

کی زیادتی ہو"

اس شرح کے مطابق حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ مال کی کمی اور اس کے ساتھ اولاد کی زیادتی

سے انسان کو بچنے کی دعا کرنی چاہیے۔

اولاد کی کثرت ہو اور مال کی کمی ہو تو ایسی صورت میں انسان بڑی سختی میں گرفتار ہو جاتا ہے اور روٹی کپڑے کے چکر ہی سے اس کا نکلنا مشکل رہتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا خیال رکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر خود ہی یہ دعا فرمایا کرتے تھے تاکہ اُمت بھی اس کا کوئی سیکھ لے، فرمایا کرتے تھے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفَقْرِ وَالْكَفْرِ ————— "میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں افلاس اور کفر سے۔"

ایک صاحب نے پوچھا۔ اَلْفَقْرُ وَ الْكَفْرُ؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا افلاس اور کفر دونوں

برابر ہیں؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا، ہاں، دونوں کے نتائج خطرناک ہوتے ہیں برابر ہیں۔

بیماروں کے ساتھ اخلاق :

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی مزاج پرسی کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اس نیکی کا بڑا درجہ قرار دیا ہے۔ آپ نے ہدایت کی کہ بیمار کی عیادت کرنا ایک مسلمان پر مسلمان کا حق ہے۔ اسی طرح آپ نے غیر مسلموں (یہودیوں) کی بھی مزاج پرسی کی اور منافقین کی عیادت کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ آپ نے فرمایا۔

جب کسی کی عیادت کے لئے جاؤ تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھو اور اس کو تسلی دو اور دلاسا دو اور اس کی تشفائے لئے دعا کرو (سیرت النبی ص ۲۱۶)۔

غلاموں کے ساتھ اخلاق :

عرب میں غلامی کا رواج تھا۔ آپ نے اس طبقہ کی آزادی کی تحریک شروع کی اور ان کو سماج

میں برابر ہی اور عزت کا مقام دلانے کے لئے زبردست جدوجہد فرمائی۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کے بعد ماں دار لوگوں نے غلاموں کو آزاد کرنا شروع کیا۔ حکیم بن حزام صحابی نے سو غلام آزاد کئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک قسم کے کفارہ میں میں چالیس غلام آزاد کئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار غلاموں کو آزاد کرایا۔ عبدالرحمن بن عوفؓ نے تیس ہزار غلاموں کو غلامی سے نجات دلوائی۔ یہ سب آپؐ کی تعلیم اور غلاموں کے ساتھ آپؐ کے حسن اخلاق کا اثر تھا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ آزاد شدہ غلام تھے۔ آپؐ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ حضرت زیدؓ آزاد شدہ غلام تھے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے، یہاں تک کہ لوگوں میں زید بن محمدؓ (صلی اللہ علیہ وسلم) محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بیٹے زید مشہور ہو گئے تھے۔

قریش مکہ ان غلاموں کو اپنے ہاں اچھوتوں کی طرح رکھتے تھے، ان کا لباس عام شرفاء قوم سے الگ تھا۔ یہ لوگ سب الگ تھک رہتے تھے، مگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنے ساتھ اپنی مجلسوں میں بٹھاتے تھے۔ اپنے ساتھ کھلاتے اور پلاتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ابو جہل نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اگر تم ان غلاموں کو اپنی مجلسوں سے الگ رکھو، جب ہم تمہارے پاس ہوں تو یہ لوگ وہاں آنے کی جرأت نہ کریں تو ہم تمہاری باتیں سننے کے لئے آنے لگیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام کے شوق میں ان کے مطالبہ کو ماننے کا ارادہ کر لیا لیکن خدا نے آپؐ کو ان غریبوں کے ساتھ امتیاز برتنے سے منع کر دیا اور اس ممانعت کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَا تَطْهَرُوا الَّذِينَ الْج (سورہ انعام آیت نمبر ۵۲)

آپؐ نے اس مظالم طبقہ کی عزت بڑھانے کے لئے حضرت زیدؓ کے ساتھ اپنی چھوٹی زاد بہن حضرت زینبؓ کی شادی کی حالانکہ زینبؓ ایک باعزت قریشی خاندان کی خاتون تھیں۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کی سرداری کے لئے حضرت زیدؓ کے رٹے اسامہؓ کا انتخاب کیا کچھ لوگوں نے ان کی سرداری پر ناک بھجوں چڑھائی، مگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا



اپنا فیصلہ واپس نہیں لیا، اور صحابہ کرام کو ان کی سرداری کو تسلیم کرنا پڑا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تسلیم اور ذاتی حسن اخلاق کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر اس طبقہ کو سیاسی سرداری اور روحانی پیشوائی کا بلند سے بلند مقام حاصل ہوا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہؓ کے ہاں تشریف فرما تھے کہ آپ کو کسی کام کے لئے خادمہ کو آواز دینے کی ضرورت پڑی، خادمہ نے آنے میں دیر کی اور حضرت ام سلمہؓ اسے دیکھنے کے لئے صحن میں آئیں، خادمہ کو دیکھا کہ وہ بکری کے بچوں سے کھیل رہی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ نے آکر عرض کیا، حضور! خادمہ ایسی گستاخ ہو گئی ہے کہ آپ کی آواز سن کر بھی کھیل کو میں مشغول ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باندی سے کہا

لَوْلَا الْقَوْدُ لَا وَجَعْتُ يَهَذَا السَّوَاكُ (بخاری ادب المفرد ص ۲۸) — ”اگر مجھے

خدا کی طرف سے بدلے کا خوف نہ ہوتا تو میں تجھے اس مسواک سے مارتا“

یہ آپ کی انتہائی ناراضگی تھی۔ اس سے زیادہ کبھی آپ خادموں پر ناراض نہیں ہوئے۔ آپ نے اپنے رفقاء کو ہدایت کر رکھی تھی۔

اَكْوَهُمْ كَمَا تَلْبَسُونَ اطْعَمُوهُمْ كَمَا تَطْعَمُونَ — ”ان غلاموں اور

خادموں کو جو لباس خود پہن رہے ہیں انہیں پہناؤ۔ جو خود کھاتے ہو وہی انہیں کھلاؤ“

عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اخلاقی تعلیم کا اثر آج بھی نظر آتا ہے جو دوسری قوموں کے اندر موجود نہیں ہے۔ ایک عرب سردار اپنے دسترخوان پر جب تک اپنے خادم کو اپنے ساتھ نہیں بٹھالیتا اس وقت تک کھانا شروع نہیں کرتا۔

حالانکہ اس دسترخوان پر بڑے بڑے رؤسا اور افسران ہوتے ہیں اور انہیں کے ساتھ اس گھر کا خادم بھی شریک ہوتا ہے جو ایک منٹ پہلے تک کھانا لانے اور لگانے کا کام کر رہا تھا۔ یتیم پر شفقت: ایک دفعہ ایک یتیم لڑکے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں یہ دعویٰ

دارک کہ یہ نخلستان میرا ہے اس پر فداں شخص قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمہ کی سماعت شروع فرمائی اور لڑکے سے ثبوت طلب فرمایا۔ لڑکا ثبوت دینے سے قاصر رہا آپ نے اس کا دعویٰ خارج کر دیا۔ اس فیصلہ پر وہ یتیم بچہ رونے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحم آیا۔ اس شخص سے کہا، تم یہ نخلستان اس بچہ کو دیدو۔ وہ شخص اس کے لئے تیار نہ ہوا حضرت ابو الدرداء صحابی موجود تھے۔ انھوں نے کہا، کیا تم یہ نخلستان میرے باغ سے بدل سکتے ہو؟ وہ راضی ہو گیا۔ اور حضرت ابو الدرداء نے وہ نخلستان اس یتیم کو عطا کر دیا (سیرۃ النبی ج ۲ ص ۲۰۹)

**بیوہ عورتوں کے ساتھ حسن اخلاق :**

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں بیوہ عورتیں سماج میں بڑی کس میرسی کی زندگی گزارتی تھیں۔ ہندوستان میں شوہر کے ساتھ چل جاتی تھیں۔ عرب میں بیوہ عورت وارث کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ مالک ان کے ساتھ ہر قسم کا غیر انسانی سلوک کرتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ عورت کو اس ذلت سے نکالا اور اسے سماج میں عزت کا مقام عطا کیا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم : آٹھ بیوہ عورتوں کو اپنے حرم پاک میں داخل کیا اور بیوہ کے ساتھ نکاح کو اپنی سنت بنادیا۔

بیوہ کی خدمت کو جہاد کے برابر درجہ عطا فرمایا (بخاری کتاب الادب) ایک حدیث میں فرمایا میں قیامت کے دن سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا ایک عورت جہد سے مجھے پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا، تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے (سیرۃ النبی ج ۲ ص ۲۰۹)

**پڑوسی کے حقوق کی تعلیم :**

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بڑی اہمیت تھی۔ ہر عرب اپنے پڑوسی کی عزت و آبرو کے لئے لڑنے مرنے کو شرافت کا نشان سمجھتا تھا۔ اسلام نے اپنی تعلیم میں پڑوسی کے دائرے اور اس کے حقوق اور زیادہ وسیع کر دیئے۔

ایک سفر کے دو رفیق، ایک کا رخانہ کے دو ملازم اور ایک کا دوبارہ کے دو شریک بھی پڑوسی کے دائرہ میں شامل کر دیئے کیونکہ یہ بھی ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔ اگرچہ یہ وقت عارضی ہے۔

اسلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک دوست و دشمن اور مسلم اور غیر مسلم کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک بکری ذبح کی۔ ان کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ انھوں نے گھردالوں سے پوچھا، کیا تم نے اس گوشت میں سے اس یہودی پڑوسی کو گوشت بھیجا؟ کیونکہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ مجھے جبرئیل امینؑ پڑوسی کے ساتھ نیکی کرنے کی اس قدر تاکید کرتے رہے کہ میں یہ سمجھا کہ آپ اس پڑوسی کو میراث میں شریک کریں گے۔ (ابوداؤد باب حق الجار)۔

پڑوسی اگر تکلیف پہنچائے تو کیا کرے؟

ایک شخص نے حاضر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا پڑوسی مجھے تکلیف دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا، اپنا تمام سامان گھر سے نکال کر بازار میں رکھ دے۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور راستہ میں اپنا مال داسے باب ڈال کر وہیں بیٹھ گیا۔ اب جو شخص ادھر سے گزرتا وہ پوچھتا کہ تم گھر سے باہر کسوں بیٹھے ہو؟ یہ سبب بیان کرتا وہ شخص اس پڑوسی کو برا بھلا کہتا ہوا چلا جاتا۔ پڑوسی کو جب اس کا علم ہوا تو وہ اس کے پاس آیا اور اس سے معافی تلافی کر کے اسے گھر واپس لے آیا اور یہ عہد کیا کہ آئندہ میں تم کو پریشان نہیں کروں گا (تفسیر ابن کثیر سورہ نساء بحوالہ ابوداؤد ج ۱ ص ۵۷)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کی ایذا رسانی کے جواب میں ایذا پہنچانے کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے خلاف پراسن اور شریعتاً احتجاج کرنے کی ہدایت فرمائی جسے آج کل کے اصطلاح میں دھڑنا دینا کہا جاتا ہے) اور وہ پراسن احتجاج کامیاب ہوا۔



ادلا در رسول اور پڑوسی کا حق :

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی اخلاق کا آپ کی ادلا د اور آپ کے رفقاء پر گہرا اثر پڑا حضرت سیدہ کبریٰ کے متعلق آتا ہے کہ حضرت سیدہ نمازیں طویل قیام کرتیں۔

حتی تو رم قد ماہا وھی تدعو لجیروانہا فسالہا اینہا الحسن یوما امّاہ اما  
 وارانہ تدعین لجیروانہ ولا تدعین لنا؛ فقالت الجارۃ المداد  
 ”آپ کے قدم سوچ جاتے اور آپ اپنے پڑوسیوں کے لئے دعا کرتیں۔ ایک روز صاحبزادے  
 حضرت حسنؑ نے کہا اماں جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ اپنے پڑوسیوں کے لئے دعا کرتی ہیں اور  
 ہمارے لئے نہیں کرتیں۔ آپ نے فرمایا، بیٹا! پہلے پڑوسی پھر اپنا گھر۔“ (مضمون شیخ مرتضیٰ  
 المطہری، ایران، الہادی عدد ثالث ۹۳ ص ۷۰)

جانوروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق :

اسلام کے معلم اخلاق نے جانوروں کے ساتھ بھی نہایت اونچے اور شریفانہ اخلاق کا برتاؤ  
 کیا۔ ایک سفر میں آپ کے کچھ ساتھی ایک چڑیا کے بچے پکڑ لائے، چڑیا اپنے بچوں کی ماتا میں،  
 ان کے اوپر منڈلانے لگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا، اس چڑیا کے بچوں کو پکڑ  
 کر کس نے اسے بے قرار کیا ہے؟ اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔ (سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۲۴۲)۔

سفر ہی کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیثیٹیوں کے بل پر آگ کا چولہا جلایا  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فوراً حکم دیا کہ اسے جلدی بجھاؤ، جلدی بجھاؤ۔ (سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۲۴۱)  
 جانوروں کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں جن میں  
 جانوروں پر رحم کرنے اور ان کے چارہ اور پانی کا خیال رکھنے اور انہیں طاقت سے زیادہ تکلیف  
 نہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سچلی قوموں کی ایک عورت کے متعلق  
 فرمایا کہ اس نے ایک بلی پال رکھی تھی جسے اس نے باندھ دیا تھا اور اس حالت میں وہ بھوکے اور پیاسے

مرگئی تھی۔ اس فعل پر خدا تعالیٰ نے اس صورت کو جہنم کے عذاب کی سزا دے دی۔ (کتا بانیہ ص ۴۴)  
امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جانوروں پر رحم کرنے کے عنوان میں ایک واقعہ نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

ایک شخص نے ایک کتے کو پیاسا دیکھا کہ وہ زبان ڈالے ہوئے کنویں کے پاس کھڑا چاٹ رہا ہے۔ اُس شخص کو رحم آیا اور کنویں میں اتر کر اس کے لئے پانی لایا اور اسے پلایا۔ اس فعل پر خدا تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا اور اسے بخش دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ واقعہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر بھی آخرت کا ثواب ملتا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہر جاندار کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہر دو ثواب کا کام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ایک باغ میں قصائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ باغ ایک انصاری کا تھا۔

اس باغ میں ایک اونٹ تھا، یہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بلبلا یا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

فاذا جمل فلما راى النبى صلى الله عليه وسلم من وذرفت عيناها فاتاها

النبى صلى الله عليه وسلم فمسح ذفراها فسكت فقال من رب هذا الجمل؟

”وہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر چپکے چپکے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس اونٹ کے پاس آئے اور اس کی کنپٹیوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ چپ ہو گیا، آپ نے فرمایا، اس کا مالک کون ہے؟“

اس کا مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے فرمایا:

افلا تتقئ الله في هذه البهيمة التي ملكها الله اياها فاتها شكت الى الله

تجميعها وتوعيبها (ابوداؤد ج ۲ ص ۳۵۲) ————— ”کیا تم ان جانوروں کے بارے میں خدا کا

خوف نہیں کرتے جن کا خدا نے تمہیں مانکر بنایا ہے۔ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے تکلیف دیتے ہو اور تمہکا دیتے ہو“

ایک اونٹ کا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر چیخا اور آنسوؤں سے رونا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رحمت کا کھلا نشان تھا جو آپ کی صداقت کو واضح کرنے کے لئے سامنے آیا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بھی ممانعت فرمائی کہ چوپایوں اور جانوروں کو بازی گرمی کے طور پر آپس میں لڑایا نہ کر دے۔ یہ بھی ان بے زبانوں پر ظلم و زیادتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو انسانوں کی جس خدمت کے لئے پیدا کیا ہے ان سے ہی خدمت لینا چاہئے۔

**سسرال والوں کیساتھ ایک شریف داماد کے اخلاق :**  
عرب کے لوگ بیٹی کے وجود کو صرف اسی لئے ننگ و عار سمجھتے تھے کہ بیٹی کی وجہ سے ان کے گھر داماد آتا اور وہ داماد سسرال والوں سے ایسی ناجائز ناز برداری کراتا جو ایک غیر متدین انسان کی برداشت سے باہر ہوتا۔

ہندوستانی سماج کے اثر سے آج ہم ہندوستانی مسلمانوں میں لڑکی کے متعلق جو تصور ہے وہ اس کی زندہ مثال ہے۔ لڑکے والے لڑکی والوں کے ساتھ کیسا ذلت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ لڑکی والوں کا رشتہ جھکنے کا ہے۔ لڑکی کو پالیں، پوسیں، جوان کر کے لڑکے کے حوالہ کریں، حیثیت سے زیادہ جہیز کی شکل میں نذر پیش کریں اور مختلف رسموں کے مطابق یہ نذر زندگی بھر پیش کرتے رہیں اور پھر لڑکی والا ہونے کی سزا میں سمدھیانے کے بچے بچے کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہیں۔ یہ ہم مسلمانوں کی حالت ہے جو اسلام سے تعلق کا شرف رکھتے ہیں، یہی حالت عرب کے جاہل سماج کی تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب حق کی اشاعت کی خاطر عرب کے بہت سے خاندانوں کی عورتوں کو اپنے حرم پاک میں داخل کیا اور ایک شریف داماد کو سسرال والوں کے ساتھ اخلاق اور



ہمدردی کا جو اعلیٰ برتاؤ کرنا چاہئے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ آپؐ نے عرب کے عام ماحول کے مطابق نہ ناز نہ نخرے اور نہ غرور و تکبر کا مظاہرہ کیا اور نہ بیٹی والوں کو ذلیل سمجھا بلکہ ساس سسرال کی تعریف کرنا، سالیوں سے محبت کرنا، سسرال والوں کی قدر دانی کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عام شیوہ رہا۔

اپنی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کے باپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہوئے ایک روز فرمایا، عائشہ رضی اللہ عنہا! تمہارے باپ ابوبکر کی نیکیاں آسمان کے تاروں کے برابر ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ماں حضرت ام رومان کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قبر میں اتر کر انھیں لحد کے سپرد کیا اور حیرت انگیز طرح اپنی چچی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے وقت ان کا اعزاز و اکرام فرمایا اسی طرح اپنی ساس کے ساتھ بھی کیا اور ساس اور ماں کو ایک ہی درجہ میں رکھنے کی عملی تعلیم دی حضرت خولہ رضی اللہ عنہا آپ کی سالی ہیں یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔ صدر صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آواز سن کر انھیں پہچان جاتے اور بڑی بے چینی کے ساتھ اندر بلا لیتے تھے۔ آپؐ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز بخشا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دو توں خسر آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آرام منہ رہا ہیں۔

آج کی جدید دنیا عورتوں کو سوسائٹی میں باعزت مقام دینے کا نعرہ لگا رہی ہے لیکن آج سے تیرہ چودہ سو برس پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک شریف داماد بنا کر جو عملی نمونہ پیش کیا اس نے عورت کو عزت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ آپؐ کا یہ اسوہ حسنہ آج بھی دنیا کے لوگوں کو دعوت عمل دے رہا ہے۔

**دامادوں کے ساتھ ایک شریف خسر کے اخلاق:**

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے داماد ہیں تو علی و عثمان رضی اللہ عنہما کے خسر ہیں خسر ہونے کے ناطے بھی آپؐ ایک نمونہ کا کردار پیش کرتے ہیں۔ دامادوں کو اولاد کی طرح ہی سمجھتے ہیں اور ان کی ناز برداری فرماتے ہیں اور اسی کے ساتھ بے جا پاس داری سے بھی گریز کرتے ہیں۔

یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک معتدل اور متوازن عملی کردار کے مالک ہیں حضرت علیؓ کسی بات پر ناراض ہو کر چلے جاتے ہیں تو ان کو مناکر لاتے ہیں۔ علی رضہ مسجد کے فرش پر لیٹے ہوئے ملتے ہیں تو فرماتے ہیں، اے ابو تراب! (مٹی پر لیٹنے والے) کھڑے ہو جاؤ۔ داماد بھی حکم سنتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حضرت علی رضہ کے منہ سے اپنی سوتیلی ساس (حضرت عائشہ رضہ) کے متعلق کوئی کمزور جملہ نکل جاتا ہے تو آپ اسے درگزر فرماتے ہیں اور رشتہ کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہیں۔ حضرت علی رضہ جناب سیدہ کی حیات میں دوسری شادی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس پر علانیہ ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں کیونکہ علی رضہ کی مالی حالت دو بیویوں کے خرچ کو برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی، داماد بھی اپنے خسر کا حکم مانتے ہیں۔

ایک دفعہ بیٹی شوہر کی سخت مزاجی کی شکایت لے کر آتی ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت علی رضہ بھی آجاتے ہیں بیٹی سے شکایت سنتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بیٹی! تم کو خود سمجھنا چاہئے کہ کس کا شوہر اپنی بیوی کے پیچھے پیچھے خاموشی کے ساتھ چلا آتا ہے۔ بیسوت کے اس محتاط انداز سے داماد پر اثر ہوتا ہے اور وہ خود حضرت فاطمہ رضہ سے معذرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، میں اب آپ کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں کہوں گا۔

خسر اس قدر بردبار کہ بیٹی کی شکایت سن کر غضبناک نہیں ہوتے اور داماد اس قدر شریف کہ خسر کے تحمل کو دیکھ کر خود ہی شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک داماد (عثمان غنی رضہ) دولت مند ہیں اور دوسرے داماد (حضرت علی رضہ) غریب ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں دامادوں سے یکساں محبت کرتے ہیں، بلکہ غریب داماد کی دلجوئی کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

ایک روز دونوں دامادوں کو بستی (مدینہ منورہ) سے باہر لے گئے حضرت عثمان رضہ سے فرمایا، عثمان! ذرا اس چٹان پر کھڑے ہو کر مجھے دن بھر کا حساب تو بتاؤ۔ گرمی پڑ رہی تھی عرب کی

چٹان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بے حد نازک مزاج تھے، ایک ہی منٹ میں گھبرا گئے۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا نیچے اتر آؤ۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا، علیؑ! اب تم کھڑے ہو، علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔ غریب زندگی کا حساب ہی کیا ہوتا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے ایک منٹ میں سب بتا دیا۔ آپؐ نے فرمایا، تم سمجھ کہ میں نے یہ کیوں کیا؟ میں نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ قیامت کے دن وہی انسان آرام سے رہے گا جس کا حساب کتاب کم سے کم ہوگا۔ حضرت عثمانؓ رونے لگے اس تدبیر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب داماد علی رضی اللہ عنہ کو سمجھایا کہ تم اپنی نادار زندگی پر افسوس نہ کرتا، بلکہ شکر گزاری کے ساتھ اپنا وقت گزارنا۔

### دوستوں کے ساتھ ایک بہترین دوست کے اخلاق :

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندوں کو خدا کے احکام (قرآن حکیم) پر چلانے اور انکی اخلاقی زندگی بنانے آئے تھے لیکن آپؐ یہ تعلیمی اور دعوتی فرض ایک جابر و قاهر حاکم کی طرح انجام دینے پر مامور نہ تھے۔ بلکہ پیار و محبت سے دلوں کی دنیا کو بدلتا آپؐ کا مذہبی اور تاریخی فریضہ تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے آپؐ کو ایک محبوب اور پیاری شخصیت کا مالک بنایا تھا۔ جابر حاکم دُعا کے زور سے حکومت کے احکام کی پیروی کراتا ہے اور رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود گرامی سراپا محبت تھا۔ آپؐ کے سینہ میں بھی خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کی محبت ڈالی تھی اور اپنے بندوں کے دل میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کی تھی اور یہی وہ محبت کی کشش تھی جو صاف ستھری فطرت رکھنے والے انسانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف پر دانوں کی طرح جمع کر دیتی تھی اور وہ اللہ کے بندے اپنے محبوب کے ایک اشارہ پر اپنا وقت، مال اور جان سب کچھ قربان کر دیتے تھے۔

یہی سبب ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں ایک طرف ایک زاہد کی متانت اور ایک حاکم کا رعب تھا تو دوسری طرف ایک دوست کی خوش طبعی اور طرافت بھی تھی۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دیندار حلقوں میں دینداری کا یہ ناقص اور ادھورا



خیال پھیلا ہوا تھا کہ اللہ والے خشک مزاج، اکھڑ طبیعت اور ردنی صورت ہوتے ہیں اور ہنسا ہنسانہ روحانیت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ یہ خیال اس امت کے اندر آج بھی موجود ہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوہ پاک سے اس غلط تصور کی تردید کی، غور کرو! کیسی بالکمال سیرت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اپنے رفیقوں کے ساتھ مسجد میں امام ہیں تو طبیعت پر خوں و خشیت کا رنگ غالب ہے۔ انہی رفیقوں کے درمیان جب ایک جج ہیں تو سنجیدگی اور وقار کا سراپا ہیں اور عام زندگی میں انہی رفیقوں کے ساتھ ایک منہس مکھ دوست اور بہت ہی بے تکلف ساتھی ہیں۔

احادیث میں آتا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سننے بولنے میں کبھی بازاری پن نہیں آتا تھا۔ آپ سنیتے تھے تو آپ کی کچلیاں ظاہر نہیں ہوتی تھیں۔ بازاروں میں چبھ کر بولنے سے آپ ہمیشہ دور رہتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مذاق کرتے تھے تو اس میں شوخی کے ساتھ ساتھ لطافت ہوتی تھی۔

مشہور ہے کہ آپ ایک دفعہ حضرت ابو بکر اور علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ کھجوریں تناول فرما رہے تھے اور کھجوریں کھا کر اپنی ٹھنڈیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آگے ڈالتے جاتے تھے۔ کھجوریں کھا کر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا، علیؓ! آج تم نے سب سے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نہایت حاضر جواب تھے، نہایت ادب کے ساتھ بولے، ہاں حضور! آپ نے تو ٹھنڈیوں سمیت کھائی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت زیدؓ تھے یہ دیہات میں بود و باش رکھتے تھے اور شکل و صورت کے نہایت مجذوبے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ زیدؓ ہماری دیہاتی ضرورت پوری کرتے ہیں اور ہم ان کی شہری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دیہات سے سبزیوں کا لایا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بال بچوں کے لئے شہری چیزیں عطا

فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بازار تشریف لے گئے تو زائدہ کو سبزیاں فروخت کرتے دیکھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم زائدہ کے پیچھے گئے اور ان کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ دینے زائدہ بولے، کون ہے؟ مجھے چھوڑ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ چھوڑا، زائدہ کسی نہ کسی طرح سمجھ گئے کہ میرے ساتھ یہ محبت بھری شوخی میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہ محسوس کرتے ہی زائدہ رضہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ اقدس کے قریب ہوتے لگے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی سمجھ گئے کہ زائدہ نے مجھے پہچان لیا۔ اب آپ نے پیار بھرے نہج میں فرمایا: من یشری هذا العبد؟ ”اس غلام کو کون خریدتا ہے؟“

زائدہ رضہ بولے، میرے آقا! یہ مال تو بہت کھوٹا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، زائدہ! نہیں ایسا نہیں، خدا کے نزدیک تم بہت قیمتی ہو۔

ایک روز آپ کی چھوٹی جان حضرت صفیہ رضہ آپ کے پاس آئیں اور بولیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم! میرے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہشت کی زندگی عطا فرمائے ادع اللہ ان یدخلنی الجنة۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا، چھوٹی جان! ان الجنة لا یدخلها عجز۔ ”جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہوگی“

حضرت صفیہ رضہ یہ جملہ سنتے ہی رونے لگیں۔

حضرت صفیہ رضہ بہت سادہ خاتون تھیں اور پھر ایک صاحب ایمان آدمی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کیے کر سکتا تھا، ورنہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوزخ اور جنت کے لئے خدا کا قانون عام ہے۔ قرآن تو صاف صاف کہہ رہا ہے۔

انّ الابرار یبقیٰ نعیم وانّ النجّار یبقیٰ جحیم۔ ”تمام نیک لوگ بوڑھے ہوں یا جوان جنت میں جائیں گے اور تمام بُرے لوگ دوزخ میں“

لیکن حضرت صفیہ رضہ کی سادگی دیکھو اور پھر یقین کی مضبوطی کہ ادھر ایک بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے منہ سے نکلی، ادھر صفیہ رضی اللہ عنہا پر اثر کر گئی اور صفیہ رضی اللہ عنہا سنجیدہ ہو کر جانے لگیں۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا، میری چھوٹی بیوی جان سے کہہ دو کہ خدا تعالیٰ ہر ایمان والی بڑھیا کو جوان بنا کر جنت میں داخل کرے گا اور اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کر دے گا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پاک تلاوت فرمائی:

إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنثَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا يُحِبُّنَّ اللَّهَ تَعَالَى (سورہ واقعہ)

”ہم نے ان عورتوں کو اچھی اٹھان پر اٹھایا، پھر دوشیزہ، محبت کرنے والیاں اور ہم عمر“  
یہ دونوں واقعے علامہ بیجوری نے شمائل ترمذی کی شرح ص ۳۳ پر نقل کئے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کا ایک واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی منقول ہے کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا، عائشہ! اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ تو اس میں تمہارا کیا حرج ہے؟ فائدہ ہی فائدہ ہے؟ میں تم کو اپنے ہاتھوں سے غسل دوں گا، کفایت کا جنازہ کی نماز پڑھاؤں گا اور پھر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دوں گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک سورت کی طرح حساس تھیں۔ بگڑ کر بولیں، جی ہاں، یہ سب کچھ تو آپ کریں گے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو کریں گے کہ اسی دن میرے کمرے میں کسی دوسری حرم کے ساتھ آرام فرمائیں گے۔ حضور! کیا میں آپ پر دو بھر ہو گئی ہوں؟ حضور اپنی محبوبہ رقیہ حیات کے اس خفگی بھرے جواب پر ایک دم منہس پڑے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شگفتہ مزاجی کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دل بھی آپ سے کھل گیا اور یہ مسرت بھی آپ کے ساتھ شوخی کی باتیں کر لیا کرتے تھے اور آپ اسے ناپسند نہیں کرتے تھے۔ مزوہ تبرک کا واقعہ ہے کہ آپ ایک چھوٹے سے خیمہ میں تشریف فرما تھے کسی ضرورت سے ایک صحابی حاضر خدمت ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا، اندر آ جاؤ صحابی بولے، سرکار! یہاں پر آ جاؤں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ جملہ سن کر مسکرانے لگے۔

صحابی کے اس بے حد لطیف تعریفی تعلق کی خیمہ تو اتنا چھوٹا ہے اور آپ مجھے اندر بلا رہے ہیں۔



رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ہدایت فرمائی۔

لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذي (ترمذی)

”مومن نہ کسی پر لعن کرتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش گوئی سے پیش آتا ہے“

مہمانوں اور میزبانوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

مہمان نوازیؑ بوں کی قومی خصوصیات میں داخل ہے لیکن رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان نوازی کی جو شاندار مثال قائم کی وہ اپنی جگہ نمایاں شان رکھتی ہے۔ اُس وقت کی بات ہے جب مدینہ منورہ کے یہودی دعوتِ اسلامی کو ناکام بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے میں نہ برویا جارہا تھا۔ آپؐ کو قتل کرنے کی ناپاک سازشیں ان لوگوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں۔ ان اشتعال انگیز حالات میں ایک یہودی سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ پاک دل پیغمبرؐ نے مہمانوں کی تواضع میں اپنی چادر پاک زمین پر ڈال دی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس شریفانہ فعل پر اپنی توجہیں محسوس کی جس محبوب آقاؐ کی چادر کو وہ آنکھوں سے لگاتے ہوں اسے دشمن کے پیروں کے نیچے دیکھیں۔ بولے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دشمن خدا کی اتنی عزت افزائی؟ شریف میزبان نے جواب دیا، میرے رفیق! یہ شخص اپنی قوم کا سردار ہے، اس لئے ہمارے ہاں بھی اسی حیثیت کے مطابق عزت و احترام کا حق دار ہے۔

اسی طرح ابن سینا کے بادشاہ نجاشی کے پاس سے ایک ڈپوٹیشن آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شاہی وفد کو اپنا مہمان بنایا اور اس کی مہمان داری کے فرائض خود انجام دیئے۔ صحابہ کرام نے ہر چیز چاہا کہ یہ خدمت وہ انجام دیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ فرمایا اور جواب میں کہا: ان لوگوں نے میرے رفیقوں کی خدمت کی ہے جب وہ ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اس لئے آج میں ان کی خدمت کے فرائض خود ہی انجام دوں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمان نوازی کا ایک عجیب واقعہ امام ترمذی نے ابواب الاطعمہ

میں حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے؛ وہ فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک غیر مسلم یہاں آیا۔ آپؐ نے اس کے لئے بکری کا دودھ منگایا، وہ مہمان سارا دودھ پی گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دودھ لانے کا حکم دیا۔ وہ مہمان پھر سارا دودھ پی گیا اور اس طرح سات دفعہ سات بکریوں کا دودھ لایا گیا اور وہ آنے والا سب کا سب دودھ پی گیا اور سیر ہو کر چلا گیا۔

دوسرے دن وہ مہمان صبح کو پھر حاضر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر شرف باسلام ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع کے لئے پھر بکری کا دودھ منگایا، اس مرتبہ بھی مہمان نے سارا دودھ پی لیا مگر جب دوسری مرتبہ لایا گیا تو کچھ دودھ پیا اور کچھ چھوڑ دیا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا: **السُّومَنُ يَشْرَبُ فِي مَعَى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَشْرَبُ فِي سَبْعَةِ امْعَاءَ**۔  
”مومن ایک آنت میں کھاتا پیتا ہے اور کافرسات آنتوں میں“

مہذب یہ کہ مومن سب وقعات کے ساتھ کھاتا پیتا ہے اور کافر ص و بوس کے ساتھ۔  
اُمت کو ہدایت فرماتے ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے“

اور اپنے طرزِ عمل سے تبایا کہ مہمان مسلم ہو یا غیر مسلم سب کا یکساں اعزاز کرنا چاہئے  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہمان کی حیثیت سے:

اب اس فیاض و سخاوتِ میزبان کو مہمان کے روپ میں دیکھو۔ آپؐ مہمان بن کر کہیں تشریف لیجاتے ہیں تو ایک طرف سادگی سے پیش آتے ہیں اور دوسری طرف میزبان کی سالت پر بھی نظر رکھتے ہیں

آپؐ کے ایک ایرانی پرہوسی نے آپؐ کی دعوت کی۔ آپؐ نے بے تکلفی سے فرمایا، میرے ساتھ عائشہؓ نہ بھی ہوں گی۔ اس شخص کے گھر صرف ایک آدمی کا انتظام تھا۔ اس نے عرس کیا، میں مشورہ کروں یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ دوسری دفعہ پھر آیا اور آپؐ کی دعوت کی، آپؐ نے پھر وہی جلد دہرایا۔ تیسری دفعہ اس نے دونوں کی دعوت قبول کر لی۔ بات یہ تھی کہ کئی دن سے آپؐ کی رفیقہ حیات نے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ آپؐ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ تنہا جا کر دعوت کھالیں۔ ادھر اس شخص کے ہاں بھی کھانے کا

انتظام تھوڑا تھا۔ وہ بھی بار بار اپنے گھر جاتا اور بیوی سے مشورہ کرتا۔ دونوں طرف کس قدر سادگی، شرافت ہے اور محبت کا خلوص ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا، کسی کا ہدیہ واپس نہ کیا کرو، اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

”تھا دو انتخابوا۔۔۔۔۔“ آپس میں بدیوں کا لین دین کیا کرو، محبت زیادہ ہوگی۔“

ایک بے تکلف، مہمان کی حیثیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کردار فطرت انسانی کے عین مطابق ہے کہ جو چیز فطری ذوق کے مطابق نہ ہوتی اسے طبیعت اور مذاق کے خلاف بردہتی کھانے کے بجائے واپس کر دیتے۔

چنانچہ ہجرت کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوالیوب انصاری کے دولت کردہ پر مہمان تھے تو ان دنوں ایک روز کھاتے میں لہسن ڈال دیا گیا، وہ کھاتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا۔ آپؐ نے اسے واپس کر دیا۔ ابوالیوب انصاری گھبرائے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وجہ دریافت کی۔ آپؐ نے فرمایا اس کھانے میں لہسن تھا۔ انھوں نے پوچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا لہسن حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا حرام تو نہیں مگر مجھے اس کی بو پسند نہیں یہ بولے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم (آج سے مجھے بھی اس کی بو نا پسند ہے) (مسلم شریف ج ۱ ص ۱۸۲)۔

ایک سائل کے جواب میں ابوالیوب انصاری نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اقدس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ”آپؐ نے کبھی کسی کھانے کی آزمائش نہیں کی اور جو کھانا پیش کیا گیا کبھی اس کی بُرائی نہیں کی (وفاء الوفا ج ۱ ص ۱۶۰)۔“

مطلب یہ کہ اگر کوئی کھانا پسند نہیں آتا تو آپؐ اسے واپس کر دیتے مگر اس میں عیب نہ نکالتے تاکہ میزبان کی دل آزاری نہ ہو۔ یہ بات بھی نہیں ہوتی کہ آپؐ اپنے مذاق لطیف کے خلاف ہر چیز تناول فرما لیتے۔

گاہکوں اور خریداروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوداگر اور تاجر کی حیثیت سے زندگی کا بڑا حصہ گزارا



اس تجارتی زندگی میں آپ ایک بلند اخلاق تاجر بن کر رہے، دیانتداری، وعدہ کا پاس اور نرمی اور پیار کے رویہ میں آپ نے اس قدر شہرت پالی تھی کہ آپ کو ہر پہلو اور براہ ”امین“ کہتے تھے۔  
حضرت خدیجہ کبریٰ سے ان کے غلام میسرہ نے سفر سے واپس آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی اخلاقِ حسنہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ نوجوان نہایت بلند اخلاق کا مالک ہے اور ایسے شخص کے ذریعہ تجارت بہت کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے چنانچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان خوبیوں کی وجہ سے آپ کو زندگی کا مستقل رفیق بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

آپ نے دکانداروں کو اس انداز سے نرمی اور محبت کی نصیحت فرمائی۔

رحمہ اللہ رجل اذا باع واذا اشتراى واذا اتفقوا ————— ”خدا تعالیٰ

اس دکاندار پر رحم کرے جو خرید و فروخت اور قرضے کے تقاضے میں نرمی اختیار کرے۔“  
داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبد اللہ اس شان سے جو ان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ بامروت، سب سے زیادہ با اخلاق، پیوسروں کی خبر گیری کرنے والے، سب سے زیادہ حلیم و بردبار اور سب سے زیادہ صادق دامن، ٹھیکے سے دور رہنے والے، فحش و دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے اور اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام ”الامین“ رکھا تھا۔ (خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۹۱)۔

عبد اللہ بن حنظلہ کا بیان ہے کہ میں نے رسالت سے پہلے ایک دفعہ محمد بن عبد اللہ کے ساتھ ایک معاملہ کیا اور میرے ذمہ آپ کا کچھ باقی رہ گیا، میں نے آپ سے عرض کیا میں ابھی لے کر آتا ہوں اتفاق سے میں مہرجانے لے بعد عبور کیا۔ تین دن کے بعد یاد آیا کہ میں آپ سے واپسی کا وعدہ کر لے آیا تھا۔ باد آتے ہی میں فوراً اس مقام پر پہنچا جہاں آپ سے بات ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھا کہ آپ اسی مقام پر میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔

آپ نے مجھے دیکھ کر صرف اننا کہا، تم نے مجھے تکلیف دی میں تین دن سے اسی جگہ تیار انتظار کر رہا ہوں۔ (سیرۃ المصطفیٰ ج ۱ ص ۱۷، بحوالہ ابو داؤد)۔

عبداللہ بن سائبؓ فرماتے ہیں کہ عہد جاہلیت میں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تجارت میں شریک ہو کر کام کر چکا ہوں۔ نبوت کے بعد جب میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا: سائب! مجھے پہچانتے بھی ہو؟

میں نے عرض کیا، حضور! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیوں نہیں۔

کنت شریکی فتعم الشریک لا تدارى ولا تماری (خاتم کبریٰ ج ۱ ص ۹۱)

”میں آپ کا شریک تجارت تھا اور آپؐ کیا ہی اچھے شریک تھے۔ نہ کسی بات کو ٹماتے تھے اور نہ کسی بات پر جھگڑا کرتے تھے۔“

ایک صحابی قیس بن سائبؓ میں جن کی عمر ۱۶ سال کی ہوئی ہے، ان کا بھی یہی بیان ہے کہ میں نے بھی آپؐ کے ساتھ شریک تجارت رہ کر کام کیا ہے اور آپؐ کو ایک شریف ساتھی پایا ہے۔ (اصابہ ترجمہ قیس بن سائب)

محنت کے کاموں میں اپنے رفیقوں کے ساتھ شرکت:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑی عزت کے مالک تھے۔ آپؐ کے ماننے والے آپؐ کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ کسی نبی اور کسی سلطان کے ماننے والوں کو اپنے پیشوا اور بادشاہ کی اس قدر عزت کرتے نہ دیکھا گیا۔

عزت و عظمت کے اتنے عظیم مقام پر فائز ہونے کے باوجود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں اس قدر کسری نہ تھی کہ آپؐ محنت و جنگش کے کاموں میں اپنے رفقاء کے ساتھ گندے سے کنہی ملا کر کام کرتے تھے رسول ربی کے سب سے عظیم مرتبہ پر فائز ہونے سے پہلے جس جنگش نوجوان نعرہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں بکریاں چراتے دیکھا، کعبہ کی تعمیر کے وقت اپنے بڑوں کے ساتھ مہر پھیراٹھا اٹھا کر لاتے دیکھا اس محنت پسند نوجوان کو رسول بننے کے بعد بھی مزدوروں میں ایک مزدور دیکھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کے بعد جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو سب سے

پہلے قبا کی بستی میں قیام فرمایا۔ آپ یہاں چودہ دن ٹھہرے اور اس عرصہ میں خدائی عبادت کے لئے سب سے پہلی مسجد کی اپنے ہاتھ سے بنیاد رکھی۔

یہ مسجد قبا کی تعمیر کا منظر ہے: آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقوں کے ساتھ بھاری بھاری پتھر اٹھا کر لا رہے ہیں۔ بھاری پتھر کے بوجھ سے آپ کا جسم نازک خم کھا رہا ہے۔ غذا کا رفق دوڑ کر جاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں، ”ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ تکلیف نہ فرمائیں، ہم لگ کافی ہیں“

خدا کی زمین پر خدا کا پہلا گھر (خانہ خدا) بنایا جا رہا ہے، خدا کے بندے، آقا اور غلام خوشی سے بھرے نہیں ہمارے ہیں یہ راج بھی ہیں اور مزدور بھی ہیں سب مل جل کر کام کر رہے ہیں اور خوشی اور فخر کے جوش میں اپنے مالک کی بندگی کا ترانہ گاتے جاتے ہیں۔

افلح من یصل المساجد ۱ و یقرء القرآن قائماً وقاعدا ۱

ولا یمیت اللین عنہ راقدا ۱

(ترجمہ) ”کامیابی اس شخص کے لئے ہے جو خانہ خدا تعمیر کرے۔ اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور راتوں کو عبادت کے لئے جائے۔“

کیسا عجیب سماں ہو گا اور کس قدر روح پرور نظارہ ہو گا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر طرف کے ساتھ صحابہ کرام کی آوازیں آواز مل رہے ہیں۔ اور خدا کے گھر کی تعمیر میں مل کر کام کر رہے ہیں۔

مسجد قبا کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کا کام شروع کیا محنت کے اس کام میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفیقوں نے مل جل کر کام کیا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ ایک ایک پتھر لا رہے تھے اور حضرت عمار بن یاسرؓ دو دو پتھر لا رہے تھے۔ اپنے اس نہ ہند رفیق کی اس مشقت کو دیکھ کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ترس آگیا۔ آپ عمارؓ کے پاس آئے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے عمارؓ کی مٹھی جھاڑتے ہوئے عمارؓ کی حق پرستی پر ایک پیشین گوئی ارشاد فرمائی اور کہا:



عمر! تمہیں اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے تمہیں ایک نافرمان گروہ قتل کرے گا۔  
محنت اور مشقت کے اس موقع پر بھی جی بہلانے کے لئے نہ کسی قسم کی بیہودہ گوئی ہے اور فحش  
مذاق ہے بلکہ خداوندِ عالم کا ذکر ہے اور اس کی جناب میں وہ ادب و التبا ہے۔

لَا عِيشَ إِلَّا عِيشَ الْآخِرَةِ      اللَّهُمَّ ارْحَمْ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ  
(ترجمہ) آخرت کی ابدی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ اے اللہ! انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما۔  
مسجد نبوی کی تعمیر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر اٹھاتے دیکھ کر صحابہ کرام چلا اٹھے ہیں اور  
کہتے ہیں ۱

لَنْ يَقْدَرُوا وَالتَّبِيُّ يَعْمَلُ      لِذَاكَ مَنَا الْعَمَلُ الْمَصْنُوعُ  
(ترجمہ) اگر خدا کے نبی مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے اور ہم میٹھے دیکھتے رہے تو ہمارا سارا کیا کرانا  
ہوا۔

خدا کے مقدس طہروں کی تعمیر میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مزدور کی طرح کام کرتے  
ہوئے دیکھنے کے بعد اب میدانِ جنگ میں حملہ آور دشمنوں سے شہر کا بچاؤ کرتے ہوئے خندق کے کام  
میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک محنت کش مزدور کی طرح دیکھو۔

خندق کی لڑائی، عرب کے تمام قبیلوں کا مدینہ منورہ پر متحدہ تھی، یہ سب مل کر مدینہ کی پُر امن  
بستی کو اپنے نایاب قدموں سے روند ڈالنا چاہتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حملے  
سے شہر کی حفاظت کرنے کا انتظام فرما رہے تھے۔

اس حملہ کے موقع پر حضرت سلمان فارسی نے خندق کھود کر شہر کے بچاؤ کی تجویز رکھی، رسول پاک  
صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق کیا شہر سے باہر تشریف لائے خندق کی حدیں خود قائم کیں، دس دس آدمیوں  
پر دس دس گز زمین تقسیم کر دی گئی، پانچ گز گہری خندق کھودنے کا پروگرام ہے۔ تین ہزار مجاہد صحابہؓ



مسجد میں چلے جاتے تھے۔“

اپنے رفیقوں کو کسبِ معاش کا طریقہ سکھایا:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بھلائی اور کامیابی کا صرف روحانی راستہ بتانے نہیں آئے تھے بلکہ روحانیت کے ساتھ معیشت کی کامیابی کے طریقے بتانے اور ان پر چلانے کا کام بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا۔

اور اسی کو آپ نے تکمیلِ اخلاق کا نام دیا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن تھا، چنانچہ آپ کی زندگی میں جہاں یہ واقعہ نظر آتا ہے کہ آپ نے ایسے ایک رفیقِ خاص حضرت معاذ بن جبلؓ کو ایک روز دن کے وقت مسجد میں پریشان اور غموم بیٹھے دیکھا آپ ان کے پاس گئے اور ان سے پوچھا۔

مالی ارنٹ یا معاذ مغموماً حزیناً \_\_\_\_\_ ”اے معاذ! میں تم کو اس وقت پریشان اور غمگین کیوں دیکھ رہا ہوں؟“

معاذ بولے:

لزم متنی هموم و غموم یا رسول اللہ \_\_\_\_\_ ”حنورا! مجھے غموں اور پریشانیوں نے گھیر لیا ہے۔“

آپ نے معاذ کو رنج و غم کا ایک روحانی علاج بتاتے ہوئے کہا: معاذ! تم خدا تعالیٰ سے اس طرح دعا کیا کرو۔

اللهم اعننی علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک \_\_\_\_\_ ”اے الہی! اپنا ذکر و شکر

کرنے اور اچھی طرح اپنی عبادت کرنے میں میری مدد فرما۔“

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ چند دن کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذؓ نظر آئے، آپ نے معاذ رضی اللہ عنہ کا حال پوچھا، معاذ رضی اللہ عنہ نے خدا کا شکر ادا کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ خدا نے میری پریشانیوں کو دور کر دیا۔



خدا تعالیٰ کے ذکر و شکر کی کثرت، یہ ایک کامیاب روحانی معلم کی طرف سے رنج و غم کا بیخوار علاج تھا جس پر معاذ اللہ عمل کیا اور رنج و غم سے نجات حاصل کر لی۔

اب اسی کے ساتھ دوسرا واقعہ سنئے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پریشان حال اور غم روزگار سے تنگ صحابی کو روزگار اور کسب معاش کا طریقہ سکھایا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک انصاری مسلمان نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، آپؐ نے اس سے پوچھا، تمہارے پاس کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضور! میرے پاس ایک بڑی چادر اور ایک کھانے پینے کا پیالہ ہے حضور! اگر مصلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پیالہ منگوا لیا اور اس پیالے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے مجلس میں دو درہم میں نیلام کر دیا۔ پھر اس انصاری سے کہا کہ تم ایک درہم کا کھانا خرید کر بال بچوں کے پاس پہنچا دو اور ایک درہم کلہاڑی خرید کر آؤ، اس انصاری نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی اور ایک کلہاڑی لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلہاڑی میں اپنے ہاتھ سے لکڑی کا دستہ ڈالا اور انصاری سے کہا: اذهب فاحطب ولا ادینک خمسة عشر مائاً۔ ”جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور دیکھو! میں تمہیں پندرہ دن تک یہاں کہیں نہ دیکھوں۔“

وہ انصاری اسی وقت کام میں لگ گئے۔ لکڑیاں جنگل سے کاٹ کر لاتے اور بازار میں فروخت کرتے، دو مہینہ کے بعد یہ انصاری حضور کے پاس آئے اور انھوں نے اپنی آمدنی کا حساب حضور کے سامنے پیش کیا، ان کے پاس اس وقت کھاپی کر دس درہم بچے ہوئے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حلال اور باعزت نفع کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اپنے رفیق سے فرمایا: هذا خیر لك من ان تجئ المسئلة نکته فی وجهك یوم القیامة۔ ”یہ محنت کی کمائی اس سے بہتر ہے کہ بھیک مانگنا تمہاری پیشانی پر ایک بد نما داغ بن جائے۔“

اور قیامت کے دن تمہاری پیشانی پر ظاہر ہوتا۔“ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

امام بخاری نے حضرت زبیر بن عوامؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو محنت اور مشقت کی تعلیم دیتے ہوئے اس کی فضیلت سے آگاہ فرمایا۔

”تم میں سے کوئی شخص لکڑیوں کا ایک گٹھا باندھ کر جنگل سے لائے اور اسے بازار میں فروخت کرے اور اس طرح خدا تعالیٰ اس کی آبرو بچالے تو یہ اس صورت سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور لوگ اسے بھیک دیں یا انکار کر دیں“

ازواجِ مطہرات کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

میاں بیوی کا تعلق انسانی زندگی کا نازک ترین شعبہ ہے، اسلام سے پہلے ”خدا پرست“ لوگ اس شعبہ کی نزاکت سے گھبرا کر تارک دنیا سو فی ہوجاتے تھے کیونکہ بیکہ وقت نفسانی اور روحانی دونوں تقاضوں کو پورا کرتا آسان کام نہیں ہے۔

ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کامل و مکمل رسول کی حیثیت سے اس مشکل کام کو آسان کر کے دکھایا اور ذکر و عبادت کے روحانی کاموں کے ساتھ بال بچوں کی رفاقت میں خوشحال اور پر مسرت زندگی بسر کرنے کی شاندار مثال قائم کی جسٹور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خیرکم خیرکلاہلہ۔۔۔۔۔۔ ”تم میں بہترین انسان وہ ہے جو اپنے بال بچوں کے لئے اچھا ہو“

مطلب یہ ہے کہ اس دور میں انسانیت بالغ ہو چکی ہے اور اپنے کمال کو پہنچ رہی ہے اس دور میں اچھائی کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ انسان گھریلو زندگی سے الگ تھلگ رہ کر ذکر و عبادت میں وقت گزارے بلکہ آج کا اچھا انسان وہ ہے جو اخلاق و روحانیت کے ساتھ اپنے گھروالوں کے ساتھ بھی اچھا اور بہتر ثابت ہو۔

سیرت کی کتابوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک تاثر نقل کیا گیا ہے۔ ایک صحابی نے سوال کیا، ام المؤمنین! آپ کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کونسا واقعہ زیادہ تعجب انگیز ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس واقعہ نے

سب سے زیادہ حیرت میں ڈال دیا کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے حجرے میں آرام فرما تھے اور میری باری کی شب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت ہی مسرت و اطمینان کی شب ہوتی تھی، کچھ رات گزرنے کے بعد میری آنکھ کھلی اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر سے غائب پایا میں گھبرا کر اٹھی تو کیا دیکھا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف مصطفیٰ سچھائے خدا کی جناب میں سر بسجود ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس واقعہ کو تعجب انگیز اس لئے کہا کہ مسرت و شادمانی کی ساعتوں میں بھی حضور خدا کے ذکر سے غافل نہیں ہوتے تھے اور خالق و مخلوق دونوں کے ساتھ بیک وقت آپ کا تعلق قائم رہتا تھا۔ خَلْق سے تعلق حق سے غافل نہیں کرتا تھا اور حق سے رشتہ خَلْق سے بے خبر نہیں کرتا تھا۔

### عورت کی عزت کا عملی اعلان :

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس دور میں تشریف لائے اس وقت عورت کو بر قسم کے تمدنی حقوق سے محروم رکھتا تھا، یہ غریب معاشرہ میں صرف مرد کی محکوم اور غلام بن کر رہ گئی تھی اس وقت اسلام نے عورت کی عزت کو بحال کرنے کے لئے ایک طرف قرآن کریم میں کتابی احکام نازل کئے اور دوسری طرف اپنے رسول کی گھریلو زندگی کا عملی نمونہ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔

قرآن کریم نے اعلان کیا ————— وَكُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ —————

”اور ان عورتوں کے مردوں پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کے عورتوں پر ہیں“ ————— تفصیل

میں جا کر دیکھو، اسلام نے عورتوں کو وسیع تمدنی اور معاشی حقوق عطا کئے، معاشرہ اور سماج

میں عزت اور شرف کے تمام مراتب پر عورت کو فائز کیا اور ان مراتب کی حفاظت کے لئے

اخلاقی اور قانونی ہدایات میں پائیدار ضمانتیں مہیا کیں البتہ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان

فطرتی طرز سے پیدا کئے ہوئے فرق کو ملحوظ رکھا اور وہ فرق یہ ہے کہ مرد کے اندر فطری

طور پر فعل و تاثیر کی قوت ہے اور عورت کے اندر انفعال اور اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے

اور قدرت کا یہ سارا نظام اسی اصول پر چل رہا ہے، یہاں ہر شے کا ایک جوڑا ہے ————— دَمِنْ



کَلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا ذَوْ جَيْنٍ ————— یعنی ہم نے ہر شے کو جوڑا جوڑا کر کے پیدا کیا ہے اس جوڑے میں ایک فاعل ہے اور ایک منفعِل ہے، ایک اثر ڈالتا ہے اور دوسرا اثر قبول کرتا ہے ایک شے میں سختی ہے اور ایک میں نرمی ہے، ایک میں گرمی ہے اور ایک میں سردی ہے ————— یہی ”قانون زوج“ اس نظام ہستی کو چلا رہا ہے، اگر کدال میں سختی اور زمین میں نرمی نہ ہوتی تو کھیتی کا کام نہ ہو سکتا، لیکن قدرت کے اس نظام میں نرمی اور سختی دونوں کی ایک حیثیت ہے، یہ بات نہیں ہے کہ سختی اور گرمی کو فضیلت حاصل ہو اور اس کے مقابلے میں نرمی اور سردی کا درجہ کم تر ہو، قرآن کریم نے عورت کی اسی فطری حیثیت کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے —————

نِسَاءٌ كَاحْرَتٍ تَقُومُ ————— ”تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، مرد کی برتر حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے قرآن نے کہا —————

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا آفَضُوا مِنْ أَمْرِ الْيَوْمِ (سورہ نساء) ————— ”مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں، اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے اور اس بناء پر کہ وہ مردان پر (مہر اور نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ مرد کی اس سرداری کا مطلب یہ ہوا کہ مرد اپنے خاندان میں غالب اور عورت مغلوب ہے خاندان کا محافظ ہے، اخلاق و معاملات کا نگران ہے، اس کے بیوی بچوں پر قانونِ الہی کے اندر اس کی اطاعت فرض ہے، اس پر خاندان کے لئے روزی کمانے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔

بعض قوموں نے عورتوں کو مردوں پر سرداری کا درجہ دیا، مگر یہ فطرتِ الہی کے بالکل خلاف تھا اس لئے ایسی قومیں تہذیب و تمدن کے میدان میں کسی اعلیٰ مرتبہ پر نہیں پہنچ سکیں ————— اکثر قوموں نے مرد کی سرداری کا اصول تسلیم کیا مگر اس سرداری میں اعتدال اور میانہ روی قائم نہ رہی اور مرد حاکم مطلق اور آقا بن بیٹھا اور عورت ایک لونڈی اور مظلوم باندی بن کر رہ گئی جو مرد کی خدمت کرتی اور اس کے لئے حیرانی خواہش کی تسکین کا سامان بنتی اور لبس۔

یہ طریقہ بھی فطرتِ الہی سے بنادیا ہے۔ اس پر بھی جو قومیں چلیں وہ نقصان میں رہیں۔ مغربی تمدن نے تیسرا راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان برابری اور مساوات قائم کی جائے، یورپ ابھی اپنے اس عمل میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بھی مرد اور عورت، دونوں کی فطرت کے مطابق نہیں ہے، لیکن یورپ نے عورت کو عورت کے فطری دائرہ سے تھوڑا بہت جو اوپر اٹھایا ہے اس کا نتیجہ بھی یورپ کے معاشرہ میں نہایت تباہ کن نکل رہا ہے، اسلام نے انتہا پر ندری کے ان تمام طریقوں سے ہٹ کر وہ راستہ اختیار کیا جس کی طرف فطرتِ انسانی رہنمائی کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مرد میں فعل کی قوت ہے اس کو اسی کے مطابق خاندان کا نگران، کمانے والا، کھانے والا اور حفاظت کرنے والا قرار دیا جائے اور عورت میں قبول کرنے (انفعال) کی صلاحیت ہے اس لئے اسے اچھی ماں، اچھی بیوی اور امورِ خانہ کا ذمہ دار قرار دے کر ملکہ و خانہ بنایا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک طاقت اور فضیلت مرد کے اندر ہے جو عورت کے اندر نہیں ہے اور ایک طاقت اور فضیلت عورت کے اندر ہے جس سے مرد کو محروم رکھا گیا ہے، اور اس لحاظ سے مرد اور عورت زندگی کی دو اہم ضروری کرداریاں ہیں۔

### بیوہ عورت سے شادی اور عورت کی عزت کا اعلان :

اب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلی شادی چالیس سالہ بیوہ خاتون حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کی حالانکہ آپ عرب کے ۲۵ سالہ حسین جوان تھے، بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے، عرب کی اعلیٰ سے اعلیٰ دوشیزہ اس صاحبِ جمال نوجوان کے لئے موجود تھی اور عرب میں بیوہ عورت ایک نہایت بڑی چیز سمجھی جاتی تھی جسے ایک کنوارا نوجوان اپنے لئے کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ماحول میں ایک بیوہ عورت سے شادی کر کے ایک طرف عورت کی عزت کو بجالایا اور دوسری طرف یہ تباہی کہ عورت نہ جوانی کا نام ہے اور نہ

جسمانی حسن کا، بلکہ عورت خدمت، عفت اور عہدت کا نام ہے، اسی لئے حضور ارم علیہ السلام نے بہترین عورت، نیک عورت کو قرار دیا ہے، حسین و جمیل اور مالدار کو بہترین عورت نہیں فرمایا۔ حدیث اس طرح ہے۔

خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ ————— ”دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے“

### عورت کے حقوق کا عملی اعلان:

اسلام نے عورت کی عزت کو بجا کرتے ہوئے، اسے ہر قسم کے مکمل معاشی تمدنی اور سماجی حقوق عطا کئے، ان حقوق میں ایک ردی کپڑے اور مکان کا حق ہے جو مرد کے اوپر واجب ہے، عرب اپنی عورتوں کو اتنا دبا کر رکھتے تھے کہ وہ ردی کپڑے کے جائزہ حق کے لئے آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں، حضور ارم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو اپنے حق کے لئے زبان کھولنے کی آزادی دے رکھی تھی تاکہ عام عورتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل اپنے حق کے لئے زبان کھولنے کی جرأت پیدا ہو اور اس طرح عورتوں کی مظہریت کا سلسلہ بند ہو جائے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ سے ملنے آئے، درودِ دولت کے قریب آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ازواجِ مطہرات کی آوازیں سنیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور سے ملنے کی اجازت چاہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندر بلایا، اس وقت آپ مسکرا رہے تھے، آپ کی مسکراہٹ کو دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، حضور! خدا تعالیٰ آپ کو بہت سارے کھے، اس وقت آپ کے سینے کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا، عمر! تمہارے آنے سے پہلے میری ازواجِ ردی پر اور گزارے میں کمی کی شکایت کر رہی تھیں، لیکن عمر رضی اللہ عنہ! تمہاری آواز سن کر یہ سب دیک دیک کر اندر بیٹھ گئیں، اس پر مجھے سنسی آگئی، خدا تعالیٰ نے عمر رضی اللہ عنہ! تمہیں ایسا دیدہ بہ عطا کیا ہے کہ شیطان بھی اس راستے سے بھاگ جاتا ہے جس سے تم گذرتے ہو۔



حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول کی حیثیت سے واجب الاحترام ہیں، آپ اپنی عورتوں کو زبان کھولنے پر تنبیہ کر سکتے تھے، مگر معاشرہ کی اصلاح کے لئے آپ نے اپنی بیویوں کو گھریلو تنگی ترشی کے خلاف شکایت کرنے کی آزادی عطا فرمائی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی باتوں کو سنا اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش فرمائی۔

یہ واقعہ اوپر گزر چکا ہے کہ آپ نے ایک پڑوسی کی دعوت میں تنہا شریک ہونے سے انکار کر دیا اور جب پڑوسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دعوت میں شریک کیا تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت قبول کی، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا کہ شوہر کو عورتوں کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات زندگی کا اسی طرح خیال رکھنا چاہیے جتنا وہ اپنی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں بھوک کی بیٹھی تھیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کب روا ہو سکتا تھا کہ آپ تنہا جا کر اپنا پیٹ بھر لیں۔

نان و نفقہ میں اضافہ کیا :

عنانِ نبوت سے شہ سبجری تک ۱۸، ۱۹ سال کا زمانہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھروالوں کے لئے انتہائی عزت اور تنگ دستی کا زمانہ تھا، سات ہجری میں خیبر فتح ہوا اور اس کی آمدنی نے مسلمانوں کے معاشی حالات کو سنبھالا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھروالوں کے نان و نفقہ کی طرف توجہ فرمائی اور ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ، انہی دستِ کھجور اور بینے دستِ جو مقرر فرمائے ایک دستِ کا وزن پانچ من ڈھائی سیر بنتا ہے اس حساب سے انہی دستِ کھجور چار سو پانچ من اور بیس دستِ جو ایک سو ایک من ہوتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کا جو نان و نفقہ مقرر کیا وہ ایک اچھے اوسط درجہ کے خوشحال گھرانے کی گزراوقات کے لئے بہت کافی تھا، ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینہ میں ایک من اور سال میں بارہ من جو یا کھجور در کی مقدار کم نہیں ہوتی، پھر حضور کے مقرر کئے

ہوئے نفقہ سے تو کئی سو من کی مقدار فاضل بچتی تھی، جو ہر خاندان کی زندگی کو خوش بنانے کے لئے کافی تھی۔

مزید اضافہ کے لئے مطالبہ کی شدت :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالی فتوحات کے بعد بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے گھروالوں کے خرچہ میں اضافہ کیا، مگر اس کے باوجود سترہ سو میں ایلا کا واقعہ پیش آیا، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی ازواج مطہرات نے گذراوقات کے لئے مزید نان و نفقہ کا مطالبہ کیا۔ اور حضور کو اس سے سخت ناگواری ہوئی اور آپ ناراض ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔

اس واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ منافقین اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرنے کے لئے جہاں سیاسی سازشیں کرتے تھے وہاں یہ نصیب گردہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کو سکون و راحت سے محروم کرنے کی بھی کوشش کرتا رہتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف تہمت کا واقعہ مشہور ہے، کس طرح ایک پاکدامن عورت پر الزام لگا کر خاندان ابو بکر رضی اللہ عنہ اور خاندان نبوت کو بدنام کرتے اور دونوں برے خاندانوں کے درمیان جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بردباری نے اس سازش کو ناکام بنایا۔

اسی طرح ان منافقین نے ”ام جلاح“ نامی ایک عورت کو مستقل طور پر اس کام کے لئے چھوڑ رکھا تھا کہ وہ ازواج مطہرات کے درمیان شرارت پھیلاتی رہے اور ایک کو دوسری کے خلاف بھڑکاتی رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، عوب کی معمولی عورتیں نہ تھیں بڑے بڑے سرداروں کی ردکیاں تھیں، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا قریش کے سردار ابو سفیان کی صاحبزادی تھیں، حضرت جبرینہ خاندان بنی مسطلق کے سردار کی ردکی تھیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے رئیس غنم کی ردکی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے بڑے باپ کی بیٹیاں تھیں۔ اس وجہ سے ان تمام بیویوں کے درمیان فطری طور پر کچھ نہ کچھ باہمی رقابت

غزور رہتی ہوگی اور ہر زوجہ پاک اپنے سردار و آقا کی قربت حاصل کرنے میں دوسری سے آگے بڑھنا چاہتی ہوگی۔

اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک کے آخری دور میں خدا تعالیٰ کی طرف سے انعامات کی بارش شروع ہوئی تھی اور فتوحات کے سلسلہ نے دور اول کی ناداری اور افلاس کو ختم کر دیا تھا۔

ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے گھر کے خرچہ میں فراخی کا مطالبہ شروع کیا اور اس میں اس درجہ زور دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی اور آپ ناراض ہو کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بالا خانہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔

صاحبہ کرام رضی اللہ عنہا نے یہ وقت مہر کے پاس بیٹھ کر دور و گرد گزارا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھاگ دوڑ کی کہ حضورؐ اپنی ازواجِ مطہرات کو معاف کر دیں مگر آپؐ کی ناگواری ایک مہینہ تک قائم رہی اور پھر آیت ”تخیر“ نازل ہوئی، سرکار نے اس آیت کی روشنی میں ازواجِ مطہرات کو اجازت دی کہ اگر وہ زندگی کا عیش چاہتی ہیں تو مجھ سے علیحدگی طلب کر لیں میں انہیں علیحدہ کر دوں گا، البتہ جو اس تنگی ترشی کو برداشت کریں وہ میرے حرم میں رہ سکتی ہیں۔

حضرات اہبات المؤمنین و المؤمنات کی زبان سے اختیار (نکاح) میں رہو یا طلاق لے لو کی بات سن کر ترپ اٹھیں اور سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم کسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔

مہر و عہد صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت تعمیر و ترقی کے دور سے گزر رہی تھی، اس دور میں امت کے بادی اور امیر کے لئے ضروری تھا کہ اپنی ذاتی زندگی میں سادگی اور قربانی اختیار کریں چنانچہ آپؐ نے زایدانہ زندگی اختیار کی اور بیویوں کے اصرار پر بھی اپنے گھر میں عیش کی زندگی کو نہ آنے دیا لیکن اسی کے ساتھ عورت کو جو حق حاصل تھا کہ درجائزہ حد تک آرام و راحت کی خواہش کرے۔ آپؐ نے اس حق سے اسے محروم کرنے کی کوشش نہ کی اور اختیار دے دیا کہ چاہے وہ آپ کے



ساتھ سادہ زندگی گزارنے کو ترجیح دیں، یا علیحدگی اختیار کریں، ازواج مطہرات، نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کے شرف و اعزاز کو پسند کیا اور عیش کی زندگی کا خیال چھوڑ دیا، اور اس طرح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بیویاں دونوں خرقہ امتحان الہی یہ میاب ہو گئے ازواج مطہرات کے مطالبہ کا سبب :

ایلاہ کے واقعہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھت سے فیض حاصل کرنے والی خواتین (ازواج پاک) نے حضور کے فراخ دلانہ خرچہ کے باوجود اقتاد کا مطالبہ کیوں کیا؟ کیا آپ کی بیویاں عیش کی زندگی بسر نہ کرنا چاہتی تھیں، یا اس کا سبب دوسرا تھا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے جو کہتا ہے کہ بعض کی نیت یہ ہو کہ جب خدا تعالیٰ نے مال و دولت کی وسعت عطا فرمادی ہے تو پھر ہم کیوں نہ عیش و آرام کی زندگی گزاولیں، لیکن ازواج مطہرات میں کثرت ایسی قناعت پسند خواتین کی تھی جن کی طرف اس خیال کو منسوب کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور اس مطالبہ کا یہی سبب نظر آتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا اور فرمایا :

وَيُؤْتِيهِمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَكَوْنًا بِهِمْ خَصَاَصَةً" یہ رفتار رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، باوجودیکہ انھیں خود تنہا ہوتی ہے" (سورہ حشر)

مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یا کہ بیویاں قریبی ضرورتوں کے لئے اس قدر خیر خیرات کر دیتی تھیں کہ ان کے اپنے گزارہ کے لئے ان کے پاس بہت کم بچتا تھا، قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام رفیقوں کے والوں اور بدمصاحبوں کے اسی ایثار کی تعریف کی ہے۔

بس دقت کا یہ واقعہ ہے اس وقت مسلمانوں کی عام معاشی حالت، اس درجہ خستہ تھی کہ ایک اوسط درجہ کے مہاجر خاندان کی آمدنی نصف دنیا رسانی پانچ درسم روزانہ کے قریب تھی، زیب

خاندانوں کا حال اس وقت کیا ہوگا؟ — اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایسی حالت میں مالدار صحابہ کرام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروالے زبردست اہلکار اور قربانی سے کام لے کر عام مسلمانوں کی مدد کرتے تھے، ازدواج مطہرات میں حضرت زینبؓ بہت فیاض خاتون تھیں، ان کے متعلق آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویوں کا وظیفہ دس ہزار درہم سالانہ مقرر فرمایا اور جب یہ وظیفہ حضرت زینبؓ نے پاس پہنچا تو آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحم فرمائے، انھوں نے اتنی بڑی رقم میرے پاس کیوں بھیج دی، میری دوسری بہنوں میں ایسی یا سہمت بہنیں موجود ہیں جو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس رقم کو تقسیم کر سکتی تھیں، وظیفہ لانے والے نے عرض کیا، اے ام المؤمنین! یہ تو آپ کی ذاتی ضرورت کے لئے ہے تو آپؐ فرمایا، اچھا، اسے یہاں ڈال دو، پھر اپنے خادم سے کہا، اس پر کپڑا ڈال دو اور کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر رقم نکالنی شروع کر دو، پھر ایک ایک ضرورت مند خاندان کے لئے آپؐ نے علیحدہ علیحدہ رقم نکھرائی — آخر میں خادمہ نے کہا، سیدہ! میں بھی تو ہوں، تو آپؐ نے فرمایا، اچھا اب جھک پڑے کے نیچے بے وہ تیرا ہے، خادمہ نے کپڑا اٹھایا تو اس میں صرف پچاس درہم باقی تھے۔ (سیرت مبارکہ مولانا محمد میاں ص ۳۳)۔

یہ واقعہ حضرت زینبؓ جیسی فیاض خاتون کا ہے، آپ کے علاوہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروالوں، ازدواج مطہرات اور اہل بیت کے اندر غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد اور اعانت کا یہی جذبہ موجود تھا، جس کی وجہ سے ازدواج مطہرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید نان و نفقہ کا مطالبہ کرتی ہوں گی اور اسی سبب سے ایلا کا واقعہ پیش آیا ہوگا۔  
مرد کے لئے طلاق کا حق:

اسلامی شریعت نے مرد کو حق دیا ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے کر علیحدہ کر دے، لیکن اسی کے ساتھ اس قانونی حق کو بہت سی اخلاقی یا بنیادیوں میں جکڑ دیا ہے تاکہ مرد اپنے اس حق کو ضرورت کے وقت استعمال کرے، بلا ضرورت عورت کو پریشان کرنے کے لئے استعمال نہ کرے، رسول پاک

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھریلو طرز عمل سے اس معاملہ میں امرت کی نہایت اعلیٰ رہنمائی فرمائی بہت عائشہ رضہ جیسی محبوب اور دانش ور رفیقہ حیات کے خلاف منافقین نے نہایت خوفناک سازش کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف اپنی ذاتی عزت کا خیال اور دوسری طرف اپنے پیار غار سدیدِ اکبر رضہ کی آبرو کا خیال، \_\_\_\_\_ بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ حضرت عائشہ رضہ ایک سفر میں قافلہ سے بچھڑ گئی تھیں اور اگلی منزل پر تلاش کرتے والے صحابی رضہ کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آملی تھیں، دشمنوں نے اتنی سی بات کا تین گڑ بنا دیا تھا اور شرمناک افواہوں سے آسمان وزمین ایک کر دیئے تھے۔

سرکارِ اقدس کو اس پر دو پگینڈہ سے بے حد صدمہ ہوا، حضرت عائشہ رضہ اس صدمہ سے بیمار پڑ گئیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک صحابی اور ایک ایک گھر والے کو بلا کر اس الزام کی تحقیق فرماتے، خود بھی بیوی کے کہیکڑ پر بھروسہ تھا، مگر پر دو پگینڈہ کا اتنا زور کہ آپ اندر ہی اندر غم میں لھلتے رہتے۔

دوسرا کوئی ہوتا تو اس زور شور سے متاثر ہو کر بیوی کے ساتھ بہت کچھ کر گزرتا، بدسلوکی سے پیش آتا، طلاق دے دیتا، لیکن آپ ایک شریف، شوہر کی طرح بردباری کے ساتھ تحقیق حال کرتے رہے، محسن دشمنوں کے الزام پر بیوی کو مجرم نہ قرار دیا، دل میں ایک وفادار بیوی کی جو عزت تھی، اس میں فرق نہ آنے دیا، تاکہ دنیا سمجھ لے کہ عورت کا ناموس بھی مرد کے ناموس کی طرح قابلِ احترام ہے، وہ پیر کی جوتی کی طرح حقیر نہیں ہے اور نہ ہی پیدائشی گناہ گار ہے۔ یہاں تک کہ کئی مہینہ کے شور و غل کے بعد وہی الہی نازل ہوئی اور اس نے حضرت عائشہ رضہ کی پالہ امی کا اعلان کیا اور منافقین کی سازش کا پردہ چاک کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، عدال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز خدا کے نزدیک طلاق دینا ہے۔ مطلب یہ کہ مرد اپنے اس جائز حق کو اگر بلا ضرورت اور بے موقعہ استعمال کرے تو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ناپسندیدہ لوگوں میں شامل ہو گا۔

## عورت کی طرف سے علیحدگی کی خواہش:

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے عورت کو نکاح کے رشتہ سے علیحدہ ہونے کا اختیار نہیں دیا، یہ حق صرف مرد کو دیا گیا ہے اور یہ بات مرد و عورت کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے عورت کی فطرت اور اس کے مزاج میں دوسروں کی طرف، جھکنے اور مائل ہونے کی کمزوری اور نرمی موجود ہے۔ عورت کی رائے میں اسی بنا پر سختی اور درد راندیشی نہیں ہوتی۔ عورت محبت اور دشمنی دونوں کے معاملہ میں نہایت حساس اور جذباتی واقع ہوتی ہے، اگر عورت کو طلاق کا اختیار دیدیا جاتا تو نکاح کا رشتہ ہر وقت خطرہ میں رہتا، شوہر کی طرف سے ذرا سی تکلیف اسے بے زار کر دیتی اور غیر کی طرف سے معمولی سا جھکاؤ اسے اپنی طرف کھینچ لیتا۔

## عورت پر اخلاقی کنٹرول کی سختی:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں عورت کو سماج کے ظلم و زیادتی سے بچا کہ اس کی عزت بحال فرمائی وہیں عورت پر مرد کے اخلاقی کنٹرول کو بھی لازم قرار دیا ہے تاکہ عورت جذبات میں بہہ کر اتنی آزاد نہ ہو جائے کہ کلبوں میں تنگی ناچنے لگے اور مرد کو جوتی کی نوک پر مار کر اسے "زن مرید" بن کر رہنے پر مجبور کر دے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دشمن بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کس قدر محبت تھی مگر جب آپ ان کی طرف سے کوئی نامناسب بات دیکھتے تو انہیں پوری سختی سے تنبیہ فرما دیتے کسی قسم کی سوء رعایت نہ فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ میرے منہ سے اپنی سونہلی حضرت صفیہ کے متعلق ایک ناپسندیدہ جملہ نکل گیا جسور استے ہی بگڑ گئے، یا تو آپ محبت سے التفات فرما رہے تھے یا آپ کا چہرہ انور غصہ سے سرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا — عائشہ رضی اللہ عنہا نے وہ بات کہی ہے کہ اگر اسے سمندر میں ڈال دیا جائے تو سمندر کا پانی کڑوا ہو جائے۔

غزوہ تبوک سے صحیح سلامت واپس آنے کی خوشی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے گھر کو سجایا اور



دروازہ پر ایک تصویر دل والا پردہ لٹکا دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب واپس تشریف لائے اور اپنے مکان پر وہ پردہ لٹکا دیکھا تو آپ حضرت عائشہ رضی پر سخت ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا، عائشہ رضی! خدا تعالیٰ نے ہمیں اس لئے روپیہ پیسہ کی نعمت سے نہیں نوازا کہ ہم اسے اینٹ پتھر کی آرائش پر خرچ کریں۔

**بیوی کے مذاق پر تبسم کا اظہار:**

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ادھر گزر چکا ہے کہ آپ نہایت منہیں مکھ انسان تھے، بیویوں کے ساتھ بھی اور دوستوں کے بھی، آپ کا عام برتاؤ نہایت سادہ اور بے تکلف تھا، آپ خود بھی اپنی بیویوں کے ساتھ مزاح فرماتے تھے اور ان کے مزاح سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج میں حضرت سودہ رضی بڑی خوش طبع خاتون تھیں۔ ایک روز انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، سرکار! میں رات کو آپ کے ساتھ نماز میں شریک تھی، آپ نے اس نماز میں رکوع کو اتنا لمبا کر دیا کہ مجھے رکوع میں جھکے جھکے اپنی نکسیر بھینٹنے کا شبہ ہو گیا اور میں دیر تک اپنی ناک پکڑے رہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سودہ رضی کے اس مزاحیہ کلام پر منہیں پڑے۔

**بیوی کے منہ سے میکے والوں کی تعریف:**

عام طور پر شوہر اپنی بیوی کے منہ سے اس کے میکے والوں کی تعریف سنا پسند نہیں کرتے، اور لڑکی کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے ماں، باپ اور بہن بھائیوں کے گن گاتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ واقعہ بھی پیش آتا تھا اور آپ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی بیویوں سے ان رشتہ داروں کی تعریف سنتے تھے اور خود بھی تعریف کے قابل باتوں کی تعریف کرتے تھے۔

حضرت ام حبیبہ رضی تے ایک روز دعا مانگی:

اللَّهُمَّ مَتِّعْنِي بِرَدِّ رَجُلٍ رَسُولِ اللَّهِ وَبِأَيِّ سَفِينٍ وَبِأَيِّ مَعَادِيَةِ رَحْمَةٍ

”خداوند! میرے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باپ ابوسنیان اور میرے بھائی معاویہؓ کا سایہ مجھ پر دراز رکھیو۔“

”ام حبیبہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کے ساتھ اپنے باپ اور بھائی کے سایے کی درازی کے لئے دعا کی، اور اپنے باپ اور بھائی کو بڑا اعزاز دیا، حالانکہ ادب و محبت کا تقاضا یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی کے بعد ہر سرپرستی اور ہر محبت سے بے نیاز کا اظہار کیا جاتا، مگر اس کا تعلق ایک عورت کی نفسیات سے ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سویر ادب پر ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا، صرف اتنا کہا:

ام حبیبہؓ! عمر میں تو سب کی اللہ کے ہاں مقرر ہو چکی ہیں، دعا کرنی تھی تو عذاب جہنم سے نجات پانے کی دعا کرتی۔ (مسلم شریف)

اد پر تفصیل سے گزر چکا ہے کہ آپؐ ایک شریف داماد کی حیثیت سے سسرال والوں کی عزت کرتے تھے اور ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے تھے، اپنی زبان سے سسرال والوں کی تعریف فرماتے تھے، پھر بھلا بیوی کے متہ سے سسرال والوں کی تعریف آپؐ پر کیے گراں گذر سکتی تھی۔

## تعداد ازواج کا سبب

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد پر بعض مخالفین نے طرح طرح کے شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ چند سطور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج پر لکھی جائیں۔

تاریخ نے تسلیم کیا ہے کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی سب سے عظیم روحانی، اصلاحی اور انسانی شخصیت کے مالک تھے، آپؐ نے صرف ۲۳ سال کی قلیل مدت میں ایک بگڑی ہوئی قوم کو مکمل طور پر بدل ڈالا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کی شخصیت میں ایک طرف روحانی، اخلاقی،

اور ذہنی قوت بدرجہ کمال موجود تھی اور دوسری طرف آپ جسمانی قوت میں شان امتیازی رکھتے تھے، انہی دونوں رباطی اور ظاہری قوتوں کے کمال نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کامل بنادیا۔ روحانی قوت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کی دنیا کو بدلا اور جسمانی قوت سے جبر و شرارت کرنے والوں کے ظلم و ستم کو برداشت کیا اور آخر میں ان قوتوں کی سرکوبی کی، ایسا شجاع بہادر انسان اور پھر اخلاقی طور پر ایسا نیک چلن نوجوان بھرپور جوانی کے ۲۸ سال صرف ایک بیوہ خاتون کے ساتھ نہایت دلجمعی اور محبت کے ساتھ بسر کرتا ہے اور جب ۵۳ سال کا ہوتا ہے تو پہلی رفیقہ حیات کے جدا ہو جانے پر دوسری شادیاں کرتا ہے۔

حضرت خدیجہ کبریٰ کے بعد آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کی اور پھر اس کے بعد ۳ ہجری سے ۱۰ ہجری تک ۴ سال میں عرب کی مختلف معزز بیوہ عورتوں کو اپنے نکاح میں قبول فرمایا :

غور کرو، عمر ڈھل چکی ہے، طبعی طور پر قوی میں انحطاط اور اتار ہو رہا ہے، زندگی بڑی بڑی اہم انفرادی، اجتماعی اور سیاسی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، دشمنوں کے پورے حملوں کی روک تھام کے لئے مسلسل جنگیں ہو رہی ہیں اور ان کی قیادت ایک کامیاب جنرل کی حیثیت سے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ پھر زندگی غریبہ گزر رہی ہے، گھر میں توفاتے ہوئے ہیں، مگر یہاں میدان جنگ میں بھی پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت آرہی ہے، نفس کشی کا یہ حال ہے کہ کئی کئی دن پیٹم روزے رکھے جاتے ہیں اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدا کی عبادت کی جاتی ہے، اور اس قدر جنگا کشی کے ساتھ کہ نماز میں کھڑے کھڑے قدم مبارک سُوجھ جاتے ہیں۔

پھر کیا ایسی مشغول جسمانی راحتوں سے محروم، انقلابی مہنگاموں میں گھری ہوئی ایک ۵۳ سالہ عمر کی شخصیت پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں نفسانی ہوس کا جذبہ کا رفرما ہوگا؟ ————— نہ عقل اس شبہ کو تسلیم کرتی ہے اور نہ انسانی زندگی کا تجربہ ایسے پاکباز انسان پر حیوانی خواہش کے غلبہ کا امکان تسلیم کر سکتا ہے۔

پھر آپ سوال کریں گے کہ اگر یہ بات تھی تو آپ نے اتنی کثرت سے شادیاں کس بنا پر کیں؟  
 اور خدا تعالیٰ نے آپ کو شادیوں کے عام قانون (ایک سے چار تک) سے زیادہ شادیاں  
 کرنے کی اجازت کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حقیقی مقصد عورتوں و مردوں  
 میں خدا کے دین کی اشاعت تھی، اس مقصد کے لئے آپ نے جس طرح مردوں کی ایک بڑی جماعت  
 زندگی کے مسائل کی تعلیم اور دعوت کے لئے تیار کی اسی طرح عورتوں کے ایک سمجھدار گروہ کی  
 ضرورت تھی جو عام مسائل زندگی کے ساتھ عورتوں کے خاص مسائل اور گھریلو زندگی کے نازک  
 معاملات کی تعلیم و تربیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل قریب ہو کر حاصل کرے اور پھر قوم  
 کی عام عورتوں کو اس تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے۔

ظاہر ہے کہ گھریلو اور ازدواجی زندگی کے خاص مسائل ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
 کے حرم پاک میں شریک ہو کر ہی سیکھ سکتی تھی، ایک عام عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی بے تکلف  
 نہیں ہو سکتی تھی کہ گھریلو زندگی کے مخصوص معاملات کی تربیت حضور سے حاصل کر سکتی۔

تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور  
 حضرت سودہ رضی اللہ عنہا جیسی دانشور اور با اثر عرب خواتین نے اپنی ذہانت، تجربہ اور خلوص سے عرب  
 خواتین پر بڑا اثر ڈالا اور اس طرح مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں میں بھی اسلام بہت جلد پھیل گیا۔  
 شادی بیاہ کے معاملہ میں کفو اور جوڑ کا سوال؛

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی نے شادی بیاہ کے معاملہ میں کفو اور جوڑ کے  
 سوال کو بھی ہمیشہ کے لئے صاف کر دیا، آپ کے حرم میں جہاں ایک طرف حضرت عائشہ اور حضرت  
 حفصہ جیسی قریشی خواتین شامل تھیں وہیں دوسری طرف حضرت صفیہ بھی تھیں جو ایک یہودی  
 سردار کی لڑکی تھیں مگر جنگی قیدیوں میں بطور باندی کے لائی گئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے انہیں آزاد کر کے اپنے حرم میں داخل کیا تھا، اسی طرح حضرت ماریہ قبطیہ فرعون کے خاندان



سے تھیں اور یا ندی کے طور پر لائی گئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حرم میں داخل کرنے کا شرع انھیں نبشتا تھا۔

عرب کے خیالات کے مطابق لونڈی غلام نہایت گھٹیا درجہ کی مخلوق تھی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں عورتوں کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حفصہ رضی اللہ عنہا کے برابر درجہ دے کر حسب نسب کی ادنیٰ سیج کے تصور کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

یہی حقیقت ہمیشہ کی ادب و نیچ کی بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ حضرت  
سودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح فرمایا اور یہ دونوں بیویاں کھالوں کے دھونے اور رنگنے کا کام کرتی  
تھیں۔۔۔۔۔ حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ جس وقت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم میرے  
مکان پر نکاح کا پیغام دینے تشریف لائے اس وقت میں ایک کچی کھال کو دھو رہی تھی، میں نے  
کیڑے کے پتوں سے ہاتھ دھو کر آپؐ کو اندر آنے کی اجازت دی اور آپؐ کے لئے چمڑے کا  
ایک گدّہ اڈال دیا اور آپؐ اس پر تشریف فرما ہو گئے۔۔۔۔۔ آج کھالوں کے دھونے  
کا کام بہت گھٹیا شمار کیا جاتا ہے، لیکن اگر ہم حضورؐ کی ان بیویوں کے بارے میں حقارت کا ادنیٰ  
تصوّر نہ کریں تو یہ سخت ترین گناہ کی بات ہوگی۔

کفو کا مسئلہ محدثین اور فقہاء کی نظر میں

متاخرین فقہاء نے کفو اور جوڑے مسئلہ کو بہت زیادہ پھیلا دیا ہے اور ذات پات اور پیشوں کی اس طرح درجہ بندی کی ہے کہ اس سے جاہلی دور کی اوپن نیچ کا تصور پیدا ہونے لگا ہے، حالانکہ محدثین میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی شارحین نجاری نے تصریح کر دی ہے کہ:

\_\_\_\_\_ باب کے مختلف قبیلوں کے درمیان نسب کے لحاظ سے اوپن نیچ اور عرب اور عجم کے درمیان قوی امتیاز اور مختلف پیشوں کے لحاظ سے تحقیر و تذلیل کا تصور کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔۔ (تفصیل کے لئے فتح الباری ج ۱ ص ۱۰۸ اور مفتی محمد نجاری ج ۱ ص ۳۷۸ کا مطالعہ کیا جائے)

ان محدثین نے ثابت کیا ہے کہ جس حدیث سے بعض فقہار نے استدلال کیا ہے وہ ضعیفہ اور موضوع ہے۔

صحابہ میں عبداللہ ابن مسعودؓ، تابعین میں ابن سیرینؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہی مسک تھا۔ فقہاء میں امام مالکؒ نے وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ کفارة کا اعتبار صرف دین میں ہوگا اس کے بعد تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی شمار ہوں گے۔

فقہاء اخلاف میں امام اعظمؒ کی پہلی رائے امام مالکؒ کے موافق تھی، بعد میں امام صاحبؒ نے اپنے شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے سے اتفاق کر لیا اور تسب اور پیشوں میں کفارت کو تسلیم کر لیا، لیکن بعد کے حنفی فقہاء نے اس کی تشریح کر دی ہے کہ آئمہ اخلاف کا یہ مسک کسی حدیث پر مبنی نہیں ہے۔

بحر الرائق نے لکھا ہے:

لان الناس يتفاخرون بشرف الحرف ويتبعون بدناءتها ص ۱۳۱ —

”یعنی اس دور میں لوگ نسی تفاخر اور پیشوں میں اونچ نیچ کے تصور میں مبتلا ہو گئے تھے ان حضرات نے گھریلو زندگی کو کشیدگی سے بچانے کے لئے مصلحتاً یہ رائے دی کہ شادی بیاہ میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان نسب اور پیشہ کے لحاظ سے برابری کا لحاظ رکھا جائے۔“

اس رائے کا یہ مطلب نہیں کہ آئمہ اخلاف نسب و پیشہ میں اونچ نیچ کو تسلیم کرتے گئے تھے۔

اس لئے بعد کے علماء اخلاف نے کفو کے مسئلہ میں جو غلو اور افراط سے کام لیا ہے وہ متقدّمی فقہاء اخلاف کی صحیح ترجمانی نہیں، موجودہ دور کے دو بڑے حنفی عالم اور مفتی (حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ) نے کفو کی اس درجہ بندی کی تردید کی ہے اور اسے اسلامی تعلیم کے خلاف کہا ہے۔ راقم نے اس مسئلہ پر علیحدہ ایک کتابچہ لکھا ہے اسے دیکھا جائے بیویوں کی دلجوئی کے چند واقعات:

حنور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے ساتھ بہت دل جوئی اور محبت کے ساتھ پیش

آتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں سب سے کم عمر رکھتی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خوش کرنے کے لئے ان کی سہیلیوں کے پاس گرہیاں بھیجتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جو گرہیاں تھیں ان میں ایک گرہیا گھوڑے نما تھی جس کے اوپر دو پر بھی لگے ہوئے تھے (آج کل کے براق جیسی ہوگی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا عائشہ رضی اللہ عنہا یہ پردار گھوڑا کیا ہے؟ ————— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے برحسبہ جواب دیا، کیا حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے کے پر نہیں تھے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر سنہنے لگے (ابوداؤد) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے موقع پر حبشی سپاہیوں کو نیزہ بازی کے کرتب دکھائے اور اپنی آڑ میں انہیں لئے کھڑے رہے (بخاری)

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان کچھ رنجش ہو گئی۔ اور دونوں میاں بیوی نے اس معاملہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ثالث بنایا، بیان دیتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پہلے تم بیان دیتی ہو یا میں بیان دوں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پہلے آپ ہی بیان کیجئے، مگر سچ بول لئے گا۔ ————— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ جملہ بے تکلفی اور نسوانی ناز کے طور پر کہا لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ایمانی عقیدت جوش میں آگئی، غصہ پڑا کہ بیٹی کے ایک طمانچہ مارا اور فرمایا۔ اے تنس کی دشمن! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ بھی بول سکتے ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مارے خوت کے باپ کے غصہ سے بچنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ کے چھپے آگئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خسر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو روکا اور فرمایا، ابو بکر ہم نے تمہیں اس مار پیٹ کے لئے نہیں بلایا تھا یہ بے جا دلجوئی پر وحی الہی کی ناراضگی:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی سیرت نے ہدایت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔

لے یہ مینوں واقعات میاں بیوی کے حقوق از مفتی عبدالغنی صاحب مدرسہ امینہ سے لئے گئے ہیں

جس طرح عورتوں کے ساتھ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں موجود ہے اسی طرح آپ کی زندگی نے یہ بھی بتایا ہے کہ بیوی کے ساتھ محبت خدا کی مرضی کے حدود میں رہتی ضروری ہے، ورنہ وہ محبت معصیت ہوگی، ایک دفعہ چند بیویوں کی خاطر داری کے خیال سے آپ نے شہد نہ پینے کا عہد کر لیا اور ایک دفعہ ازدواجِ مطہرات نے سوکنا پے کا مظاہرہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا اور آپ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ سے علیحدہ رہنے کا عہد کر لیا خدا تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی اور سورہ تحریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ  
 "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم نے وہ چیز اپنے اوپر کیوں حرام کر لی جسے

خدا تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کر رکھا ہے، محض چند بیویوں کی رضا جوئی کے لئے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آسمانی تنبیہ کے بعد اپنا عہد توڑا اور اس کا کفارہ ادا کیا، یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں امت کو ہدایت دینے کے لئے پیش آیا، ورنہ اپنی فطرت کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسان کی خاطر ایسا کوئی فعل نہیں کر سکتے تھے جو خدا کی مرضی سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

غلبہ توحید کے جوش میں حضرت عائشہ رض کا سوء ادب:

حضرت عائشہؓ نے منافقین نے تہمت کا جو طوفان اٹھایا، اس کی صفائی اور برائے خدا کی طرف سے ایک مہینہ کے بعد نازل ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورہ نور کی وہ آیات لے کر حضرت عائشہؓ کے پاس آئے جو اپنے میکہ آئی ہوئی تھیں، آپ نے حضرت عائشہؓ کو وہ خوشخبری سنائی، آپ کی ساس حضرت اُمّ رومانؓ نے بیٹی سے کہا قومی الی رسول اللہؐ

"بیٹی! بکھڑی ہو جاؤ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو" حضرت عائشہؓ

نے فرمایا، اماں! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ کیوں ادا کروں، اس خدا کا شکر کیوں نہ ادا کروں جس نے میری پاکدامنی کا اپنے کلام میں اعلان فرمایا ہے۔



حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس مذاقِ تہجد کی جو سختی تھی، یہ اس کا اظہار تھا، اسی لئے  
 بظاہر سورۃ ادب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہیں ہوئے بلکہ آگے بڑھ کر محبت میں حضرت عائشہ  
 کا ہاتھ پکڑ لیا، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں بھری ہوئی تھیں، کیوں کہ اس تہمت کے دوران حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے کم ہو گئی تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ  
 علیہ وسلم کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جھٹک کر پھڑپھڑایا، لیکن یہ سختی ان کے والد حضرت ابو بکر صدیق کو گوارا  
 نہیں ہوئی اور انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تنبیہ فرمائی۔  
 (تفسیر ابن کثیر سورۃ نور)



۵

تجھ میں حور و قصور رہتے ہیں  
 میں نے مانا ہر دور رہتے ہیں  
 میرے دل کا طواف کر جنت  
 میرے دل میں حضور رہتے ہیں  
 صلی اللہ علیہ وسلم



# رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالیاتی ذوق

صحت، صفائی، ظرافت، لباس و معاشرت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح روحانی اخلاق میں نہایت اعلیٰ اور بلند ذوق رکھتے تھے، اسی طرح ظاہری اور جسمانی جمال میں بھی آپ نہایت اونچے اور معیاری مذاق کے مالک تھے ایک حدیث، قدسی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ وَ يُحِبُّ الْجَمَالَ ————— ”خدا تعالیٰ ذاتِ حسن و جمال کے کمالات کا سرچشمہ ہے اور وہ اپنی مخلوق میں بھی جمال کو پسند کرتا ہے۔“

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی خدا تعالیٰ کے اخلاق کا عکس جمیل تھی اس لئے آپ کے اندر بھی جمالِ باطنی اور جمالِ ظاہری دونوں بدرجہ کمال موجود تھے، آپ دوسروں کے اندر بھی یہی ذوق دیکھنا پسند کرتے تھے۔

امت کو جمال پسندی کی ترغیب:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو بھی لباس اور شکل و صورت میں حسن و جمال کے راہِ رہنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

احادیث میں آتا ہے: —————

ان النبي كان يأخذ من لحيتهم من عرضها وطولها (شرح ابن عربی ج ۱ ص ۲۱۹)

”حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک کو طول اور عرض دونوں میں تراشا کرتے

تھے۔“ ————— یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل تھا، صحابہ کرامؓ کو بھی آپ حسنِ ہیئت کے ساتھ

رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔

ایک روز آپ مسجدِ پاک میں رونق افروز تھے کہ ایک صحابی آئے جن کی سر اور داڑھی کے







دنیا، نزارا دکشادہ ہونا ————— کے آتے ہیں اور اس کا مطلب بھی قریب قریب وہی بنتا ہے جو قصہ کا بیان کیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کہیں کو دسے دلچسپ لینے پر یہود نے اعتراض کیا ہو کہ یہ ہی ہو کر ہزہ بازی کے کرتب دیکھتے ہیں اور اپنی اہلیہ کو دکھاتے ہیں، اس کے جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ اسلام میں اتنی تنگی نہیں اس میں شادگی اور نرمی ہے۔

**صحت جسمانی اور ورزش کا خیال:**

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے روحانی انسان تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ اپنے جسم کی صحت اور طاقت کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ بچپن میں آپ نے تیرنا سیکھ کر مدینہ میں اپنے ننھیال مکان کے سامنے سے جب آپ گزرا کرتے تو ایک تالاب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے ————— ”میں نے اس تالاب میں تیرنا سیکھ لیا ہے اور میں اسی میدان میں انہی رک کی کے ساتھ کھیل کرتا تھا“ (ابن سعد ج ۱ ص ۳۷)

زکاتہ عرب کا مشہور پہلوان تھا یہ ایک روز مکہ کی ایک گھاٹی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گیا، آپ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا، وہ بولا ————— محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ پر حق ظاہر ہو جائے تو میں آپ کی صداقت کو تسلیم کر لوں گا، وہ پہلوان آدمی تھا، علم اور دلی سے اُسے کیا واسطہ تھا، آپ نے اُسی کے ذہن کے مطابق فرمایا ————— اچھا اگر میں تجھے زیر کر دوں تو تو مجھے نبی مان لے گا۔ اُس نے اقرار کر لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارہو گئے دو گز کشتی ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاتہ کو زیر کر دیا، زکاتہ کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) روحانی آدمی ہیں ان میں جسمانی طاقت کہاں ہوگی؟“ لیکن اس کی رائے غلط تھی، وہ پھر کھڑا ہوا اور بولا ————— ایک دفعہ اور لڑوں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر لڑے اور پھر اُسے زیر کر دیا، اب اسے یقین آیا کہ میں ”محمد“ سے نہیں جیت سکتا، حضور نے عہد یاد دلایا، زکاتہ عہد سے پھر لیا اور لکھا ہوا چھوڑا ————— تم جادوگر ہو ————— بڑے جادوگر (ابن اسیر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہسواری کا اور تیر اندازی کا بہت شوق تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ اس کو ترغیب دیتے تھے اور شوق دلاتے تھے اور اپنے سامنے لوگوں سے مشتق کرتے تھے، ایک غزوہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فیر سنبھلی، راستہ میں آپ نے صحابہ کو حکم دیا سب آگے بڑھ جاؤ سب آگے بڑھ گئے، آپ پیچھے رہ گئے، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ اے عائشہ درڑ کائیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تیار ہو گئیں، آپس میں دوڑ ہوئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پیچھے رہ گئیں، حضور بھاری تھے، یہ نکل گئیں کئی سال کے بعد پھر اسی قسم کا موقع آیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اب میں بھاری ہو گئی تھی، اب جو ہم دونوں دوڑے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اس پر فرمایا:

”عائشہ —۔۔۔ یہ اُس کا جواب ہے“ (سیرت عائشہ بحوالہ ابو داؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا —۔۔۔ ”قوی مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے“ (مسلم کتاب التدر باب فی الامار بالحق و ترک البعز)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کی صحت اچھی ہوگی تو خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت اچھی مل کر سکے گا۔ —۔۔۔ صحت خراب ہوگی تو اس میں سستی و کاہلی ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام زندگی غریبانہ ری ہے مگر آپ کی زندگی میں ”اچھے کھانے“ اور اچھے پہننے کا نمونہ بھی موجود ہے اور ایک مکمل زندگی میں اس کا ہونا بھی ضروری تھا، چنانچہ آپ نے دودھ اور کھجوریں استعمال فرمائیں اور امت کو بتایا، یہ بہتر ہی کھانا ہے —۔۔۔ سبز یوں میں کدو کی بڑی تریف فرمائی اور کہا اس سے غلگین قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے —۔۔۔ خرفہ کے ساگ کے متعلق فرمایا، یہ در در کے لئے بہت مفید ہے —۔۔۔ کچے لہسن اور پیاز سے آپ ہمیشہ دُور رہے ہستانی، ستھرائی کو ایمان کا جز قرار دیا۔ لباس کے بارے میں فرمایا، سفید کپڑوں سے حکم دو قرار دیتا ہے۔

عام طور پر دنیا کا یہ خیال تھا کہ میلے کپڑے اور اول جادول ہیئت رکھنے والے لوگ بڑے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو اپنے عمل سے غلط قرار دیا، آپ ہمیشہ سادہ سادہ رہتے تھے، بالوں میں کنگھی اور آنکھوں میں سرمہ لگانے کا اہتمام رکھتے تھے —۔۔۔

# حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس

آدمی کی شخصیت کا واضح انہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی وضع قطع، قسرد و طول، رنگت، معیار، صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو تبادیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے نبی اکرم کے لباس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء نے جو معلومات دی ہیں وہ بڑی حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس کے معاملے میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی۔

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ لِبَاسًا يُؤَارِي سُوَا تِكُمُ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَى ذَٰلِكَ خَيْرٌ (سورہ اعراف: ۳۲) ————— ”اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے ستر ڈھانکنے والا اور تمہیں زینت دینے والا لباس تمہارے لئے مقرر کیا ہے اور لباسِ تقویٰ بہترین ہے۔

لباس کا دوسرا پہلو ————— سوا بیل تقیکم الحد و سوا بیل تقیکم یا سکم ————— ”تمہیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لئے قمیص اور زریں فراہم کیں“ (سورہ النمل) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس سادہ تھا۔ زینت بخش تھا اور بایں ہمہ لباس تقویٰ تھا، اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا، وہ چند کڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی تھا اور ذوقِ سلیم کا ترجمان بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبر و ریا سے بُدھ تھا اور ٹھاٹھ یا ٹھ سے رہنا نا پسند تھا۔ فرمایا انا انا عبد البس کما یلبس العبد ————— ”میں تو بس ایک خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح کا لباس پہنتا ہوں“ ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لئے آپ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحنہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار بھیجی (مشکوٰۃ) تہہ بند قمیص اور عمامہ کی لبائی چونکہ علامتِ کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج تھا۔ اس سے سرت تنفر تھا، دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور تعالیٰ کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

منزع ٹھہرایا تاکہ امت میں اپنی خودی اور عزت نفس برقرار رہے۔ نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات و کردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے۔

آپ کو کرتا و قمیص بہت پسند تھا، کرتے کی آستین نہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی، درمیانی سٹ پسنڈ تھی۔ آستین کھائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی، سفر (خصوصاً جہاد) کے لئے جو کرتا پہنتے اس کے رامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا، قمیص کا گہریاں سینہ پر ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کھلا بھی رکھتے، اور اس حالت میں نماز پڑھتے، کرتے میں جیب بھی ہوتی جو سینہ پر ہوتی (ترجمہ البخاری باب جیب القميص من عند الصدر) — عمر بھر تہ بند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرائعے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) رکھتے۔

پاجامہ (سر ادیل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپ کے صحابی پہنتے تھے۔ ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنایا نہیں) اور وہ آپ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے حضرت ابو ہریرہؓ کو ساتھ لئے ہوئے حضورؐ بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے، چار درہم کا پاجامہ خریدا بازار میں اجناس کو تولنے کے لئے ایک خاص وزن مقرر تھا۔ آپ نے اس سے کہا تولو (اتزن دارج) وزن کہتے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سنے حضرت ابو ہریرہؓ نے توجہ دلائی الاتوف نبیؐ تم اپنے نبی پاک کو پہناتے نہیں۔ وہ ہاتھ جو سننے کو بڑھا تو آپ نے روکا کہ عجیوں کا (یعنی غیر مسلم) طریقہ ہے، بہر حال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کیا آپ اسے پہنیں گے؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہوگا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی، دوسرے پاجامہ اہل فارس کا لباس تھا، اور تشبہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتباب معلوم تھا حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزاء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے تھے) آپ نے جواب دیا ”ہاں پہنوں گا، سفر میں بھی، حضر میں بھی، دن کو بھی، رات کو بھی۔ کیونکہ مجھے حفظِ ستر کا حکم دیا گیا ہے، اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی نہیں“

سر پہ عامہ باندھنا پسند خاص تھا، نہ بہت بڑا ہوتا تھا نہ چھوٹا، ایک روایت کے لحاظ سے، گز



لبائی ہوتی تھی۔ عمامہ کا شملہ یا لشت بھر ضرور چھوڑتے جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان ہوتا۔ آخری پلو پیچھے کے رُخ اڑس لیتے، تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے اسی طرح موسمی حالات تعاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے، تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تعاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے کبھی عمامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجی (رد مال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے۔ بطور نظافت عمامہ کوتیل کی چکنٹی سے بچنے کے لئے ایک خاص کپڑا (عربی نام قناع) بالوں پر استعمال کرتے، جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوبیوں کے اندر کاغذ یا سلولائیڈ کا ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا یہ حال تھا کہ (روایت میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ میلا خاکستری مائل یا شتری رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے اور فتح مکہ کے موقع پر سیاہ بھی استعمال فرمایا: عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہی۔ اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے موجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال کو یا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا اور اسے آپؐ نے مشرکین کے مقابلے میں امتیازی فیض قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی کی بار ڈھوئی ہوتی سفر پر نکلتے تو ادنیٰ بار کی ٹوپی استعمال فرماتے، سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی دیز ٹوپی بھی پہنی ہے اور ڈھنے کی چادر ہم گز لمبی ۲ گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی لپیٹ لیتے، کبھی ایک پتھر سیدھے بغل سے نکال کر اٹے کندھے پر ڈال لیتے۔ یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے۔ اور بعض مواقع پر اسے تہہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لئے چادر اتار کر کبھا بھی دیتے۔ مین کی چادر جسے حیرہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی۔ اس میں سُرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی اسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بُودینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے اسے نہیں اوڑھا۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی وہاں دوسری طرف آپ کو رہبانیت کا سدِ باب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیبِ بدن فرمایا۔ آپ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے امت کو بچانا مطلوب تھا۔ چنانچہ تنگ، آستین کا رومی جتہ بھی پہنا، سرخ دھاری کا اچھ جوڑا بھی زیب تن کیا طیلسانی قسم کا کسردانی جتہ بھی کبھی پہنا۔ جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی اور ایک بار ۲۷ اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا، اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔

کپڑوں کے لئے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوب خاطر تھا، فرمایا ”حق یہ ہے کہ تمہارے لئے مسجدوں میں بھی اور قبروں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس ہے“ فرمایا ”سفید کپڑے پہنا کہ وہ اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مردوں کو کفن دو کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں“ سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا، لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہنسی سبز دھاریاں ہوں سرخ رنگ والی دھاریوں کے کپڑے آپ نے پہنے، ہلکا زرد مٹیا لیا شتری رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو تمام وجہ عربی تمدن کے مطابق چل یا کھڑاؤں کی شکل کا تھا۔ جس کے دو قسم تھے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا، دوسرا چھٹنگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں جوتے پر بال نہ ہوتے تھے جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت ۲، انگل لمبا تھا۔ تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا اور دونوں قسموں کے درمیان پنجے سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنتے، کبھی بیٹھ کر بھی پہنتے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بائیں اور اتار تے ہوئے پہلے بائیں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔ جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے سادہ اور معمولی بھی اور اعلیٰ قسم کے بھی، شاہِ نباشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ انھیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا، اسی طرح

وجہ کلی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کئے تھے۔ چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کانگینہ ہوتا تھا کبھی حبشی پتھر کا، انگوٹھی بالعموم داہنے ہاتھ میں پہنی۔ کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درہانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہنتے۔ چھنگلی میں پہننا پسند تھا۔ نلینہ اوپر کی طرف رکھنے کی بجائے منہ کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر ”محمد رسول اللہ“ کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں پر کندہ تھے۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطوط پر مہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرین صحت ہے کہ انگوٹھی مہر کی ضرورت سے نبوائی تھی اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع قطع اور آرائش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے، ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے کنگھا کرتے، مانگ نکالتے، لبوں کے بال تراشنے کا اہتمام کرتے، ڈاڑھی کو بھی لول و عرس میں قینچی سے ہموار کرتے، اس معاملے میں رفقاء کو ترہیت دیتے مثلاً ایک صحابی کو پرہ گندہ مود دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کی ڈاڑھی کے زائد بال یہ نفس نہیں تراشے، فرمایا کہ جو شخص سر یا ڈاڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہیے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے مثلاً ابو قتادہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **أَخْرِمَهَا (ان کو سنوار کر رکھو)۔**

یہ تاکیدیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں خصوصاً رنگ تصوف جب بیڑہ ہوتا ہے اور رہبانیت ابھرتی ہے تو غلیظ رہنا علو مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے، اس خطرے کا سد باب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں (۱) تیل کی شیشی (۲) کنگھا (ہاتھی دانت کا بھی) (۳) سرمہ دانی (سیاہ رنگ کی) (۴) قینچی (۵) مسواک (۶) آمینہ (۷) لکڑی کی ایک پتلی کچی۔  
سرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں ڈالتے

آخرات میں حاجات سے فارغ ہو کر وضو کرتے۔ لباس طلب کرتے اور خوشبو لگاتے۔  
 ریمان کی خوشبو پسند تھی، مہندی کے پھول بھی بھلتی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے، مشک اور عود  
 کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبودار دھونی لیا کرتے۔ ایک عطر دان تھا جس میں  
 بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے دست مبارک سے خوشبو  
 لگاتیں) مشہور بات ہے کہ آپ جس کو چہ سے گزر جاتے دیر تک اس میں مہک رہتی تھی اور فضا میں  
 بتاتی تھیں کہ گزر گیا ہے ادھر سے وہ کاروان بہار۔ خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور  
 کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے، اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے  
 تحت آپ نے مردوں کے لئے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ محض رہے اور مہک پھیلے اور  
 خورتوں کے لئے وہ جس کا رنگ نمایاں ہو۔ مہک محض رہے۔  
 رفتار :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال غطت، وقار، شرافت، اور احساس ذمہ داری کی ترجمان  
 تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے، ڈھیلے، ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں، بدن  
 سٹا ہوا رہتا، دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے، قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے  
 کی طرف قدر جھکاؤ ہوتا، ایسا معلوم ہوتا کہ اونچائی سے نیچے کو اتر رہے ہیں مہذب ابی ہالہ کے  
 الفاظ میں ”گویا زمین آپ کی رفتار کے ساتھ ساتھ لپٹی جا رہی ہے“ رفتار تیز ہوتی قدم کھلے  
 کھلے رکھتے آپ معمولی رفتار چلتے مگر بقول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ”ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے“  
 حضور کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ ”زمین میں ٹھنڈ کی چال نہ چلو“ (سورہ لقمان)



# روحی فداہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اندازِ تکلم

تکلم انسان کے ایمان، علم، کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ ہفتوں اور الفاظ کا انتخاب، فقرات کی ساخت، آواز کا اتار چڑھاؤ، لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ تکلم کس پائے کی شخصیت کا علم بردار ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا ہوتا تو وہ تفکرات میں ڈوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات خاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک طرف آپ تفکرات اور مسائل مہم کا پہاڑ اٹھائے ہوئے ہوتے، اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے لیکن دوسری طرف لوگوں میں خوب گھنٹا ملنا بھی رہتا اور دن رات گفتگوؤں کا دور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسم و مزاح اپنی جگہ، اضداد میں عجیب توازن تھا، جس کا مظہر حضور کی ذات تھی ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری ایک سلطنت کے مسائل ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنہیں حضورؐ کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؑ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متواتر پریشانیوں میں رہتے، ہمیشہ مسائل پر غور کرتے کبھی آپ کو بے فکر کا کوئی لمحہ نہ ملا، دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلا ضرورت فضول بات چیت نہ کرتے۔

آپ ایک داعی تھے اور ایک تحریک کے سربراہ، اس لئے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لئے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا۔ جس کے لئے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہذا دوسری طرف صورت حال حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ میں یوں رہتی کہ تب ہم ذمہ داریوں کے معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس ذکر میں حصہ لیتے، جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلم فرماتے اور جب

ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھڑتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں شامل رہتے۔ اس کے باوجود آپ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی۔ قرآن نے بھی وما ينطق عن الهوىٰ کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گئے جاسکتے تھے۔ اُم معید نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پر دی ہوئی۔ الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ۔ ”نہ کوتاہ سخن، نہ طویل گو“۔ تاکید تفہیم اور تسہیل حفظ کے لئے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دہراتے بھی تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے۔ مکروہ اور فحش اور غیر حیا دارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبد اللہ بن حارث کا بیان ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مسرہ لانے نہیں دیکھا۔ یہ مسکراہٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی اور رفقاء کے لئے وجہ جاذبیت ہوتی، بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے، گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لئے ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور خاص جملوں کو بار بار دہراتے، حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے، بات کی وضاحت کے لئے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات GESTURES سے بھی مدد لیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لئے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آ پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا منہدم نمایاں کرتے، کسی شے یا سمت میں اشارہ کرتا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے۔ کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو اٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے۔ کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندر دنی حصہ پر مارتے، کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے، کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

قریش مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد قبیلہ تبوہ کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی، وحی کی لسان مبین نے حسن گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔

حق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فصیح العرب تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی ٹھٹھا اور بازائی لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی۔ کہنا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی۔ ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول (الْحَرْبُ خُدْعَةٌ) پر سبت کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ ”ہی لغتہ النبی“ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص زبان تھی۔ بے شمار اصطلاحات بنائیں، تراکیب پیدا کیں، تشبیہیں اور تشلیس وضع کیں، خطابت کا نیا انداز نکالا۔ اور بہت سے مروج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ تبوہ کے لوگ آئے تو گفتگو ہی جس کے دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا ”اے اللہ کے نبی ہم آپ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے؛ فرمایا اور خوب فرمایا ان اللہ عزوجل اذین فی احسن ادبی و نشأت فی بنی سعد بن بکر۔“ میری سانی

تربیت خود اللہ عزوجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنا دیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے۔ ایک موقع پر کسی ملاقاتی سے بات ہوئی حضرت ابو بکرؓ تعجب سے سن رہے تھے۔ پوچھا اس شخص نے آپ سے کیا کہا اور آپ نے کیا فرمایا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فصاحت کی اس پر جناب صدیق کہنے لگے ”میں عرب میں گھوما پھرا ہوا اور فصحاء عرب کا کلام سنا ہے لیکن آپ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سنا“ یہاں بھی وہی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اسی طرح حضرت عمرؓ ایک بار کہنے لگے: ”اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ نصاحت میں ہم سب سے بالا تر ہیں۔ حالانکہ آپ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔“ فرمایا کانت لختہ اسمیل قد درست فجاء بها جبوئیل فحفظنیہا۔۔۔۔۔ ”میری زبان اسمیل علیہ السلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے اسے جبوئیل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی۔“ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان معمولی عربی نہ تھی۔ بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑا اسمیسی زبان سے ملتا تھا اور جبوئیل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیے کہ اکابر تاریخ خصوصاً انبیاء و جو ایک مشن لے کر ماحول سے کشمکش کرتے ہیں اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے مخلصانہ جذبے اسے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔



## کمالِ ایمان و عبادت، عبدیتِ کاملہ

خدا تعالیٰ کی سب سے بڑی بڑی صفت کبریائی، عظمت اور بڑائی ہے اسی اخلاق صفت کمال کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ بندے کے اندر عبدیت تو اضع اور خاکساری کے اوصاف دیکھنا چاہتا ہے۔

انسان میں اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے بندگی اور عاجزی کی یہی وہ خوبی ہے جس سے تمام اچھے اخلاق کی روشنی پھوٹتی ہے اور انسان کو بند اخلاق بنا دیتی ہے۔

قرآن کریم نے اپنے ہادی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جس پسندیدہ صفت کے ساتھ کثرت سے یاد کیا ہے وہ صفت ”عبدیت اور بندگی“ کی صفت ہے معراج کے بیان میں فرمایا

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ، لَيْلًا (سورہ اسراء) — ”پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو لے گئی راتوں رات“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا۔ وَآلَنَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِيَدًّا — ”اور جب وہ اللہ کا بندہ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے خدا کو یاد کرتا ہے تو یہ مخالفین اس پر جھپٹ پڑتے ہیں اسی طرح قرآن کریم نازل کرتا

تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا۔ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ (سورہ الفرقان)

”بڑی برکت والی ذات ہے وہ جس نے نازل کیا قرآن اپنے بندہ پر۔“

چونکہ خدا تعالیٰ کو اپنے رسول کی صفت عبدیت پسند تھی اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ شہادت میں اپنے آپ کو ”بندہ اور عبد“ ہی کہلوا یا ہے، ہر مسلمان کہتا ہے،

أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ — ”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بندہ اور رسول ہیں۔“

یہی مقام عبودیت ہے جس نے آپ کے اندر تواضع اور خاکساری کا گہرا رنگ پیدا کیا اور آپ کو اپنے خدا کا سب سے بڑا عبادت گزار بندہ بنا دیا۔

## اول المسلمین :

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فخرِ انسانیت، محبوب رب العالمین اور امام المسلمین تھے اور اس کے باوجود اولادِ آدم میں سب سے بڑے عبادت گزار تھے اور خدا پر اپنی نبوت پر اور آخرت پر آپ کے ایمان اور یقین کا درجہ تمام اولادِ آدم سے بڑھا ہوا تھا، قرآن کریم نے آپ کو ”اول المسلمین“ کے خطاب سے نوازا، آپ نے اعلان کر دیا۔

وَبِذَلِكَ أَمَرَ ت دَانَا اَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ (سورہ انعام) ————— ”اور یہی حکم ہوا

جھ کو اور میں سب سے پہلے فرماں بردار ہوں“

اس خطاب کے تین مطلب بیان کئے گئے ہیں، پہلا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی اُمت میں اور اپنے دور میں پہلا مومن ہوں، سب سے پہلے میں اپنے خدا، اپنی نبوت و آخرت پر ایمان لایا پھر یہ پیغام دنیا والوں کے سامنے پیش کیا، عام مفسرین نے اس کے یہی معنی کئے ہیں۔

مولانا تھانویؒ نے بیان القرآن میں یہی معنی اختیار کئے ہیں، فرماتے ہیں —————

”میں اس دین والوں میں سب سے پہلے ماننے والا ہوں“ ————— دوسرا مطلب یہ

ہے کہ میں نوعِ انسانی میں سب سے پہلا مومن ہوں، تیسرا مطلب یہ ہے کہ میں ایمان و یقین کے سب سے اعلیٰ اور افضل مرتبہ پر قدامتوں حضرت شاہ عبدالعادر صاحبؒ نے اپنے ترجمہ میں یہی تیسرا مفہوم اختیار کیا ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ پر لکھتے ہیں ————— شاہ صاحبؒ نے

ترجمہ میں ”پہلا فرماں بردار ہوں“ کی جگہ ”پہلے فرماں بردار ہوں“ کہہ کر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ تقدم ربطی ہے اور محاورات کے اعتبار سے یہ تعبیر تقدم ربطی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہے، یعنی پہلے دونوں مفہوم ادایتِ زمانی کی طرف اور تیسرا مفہوم ادلیتِ ربطی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جسے شاہ صاحبؒ نے اختیار کیا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تینوں معنی کے اعتبار سے "اول المسلمین" ہیں، آپ تمام نوع انسانی میں بھی اول مسلم ہیں، آپ اپنے دور اور اپنی امت میں بھی اول مسلم ہیں اور آپ کے ایمان و یقین کا درجہ بھی تمام عالم انسانیت میں اول و اعلیٰ ہے ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب تانوی نے لکھا ہے کہ حضور آفتاب نبوت ہیں اور دنیا میں ہر مومن کا ایمان اسی نورِ عظم کی شعاع ہے، جس قلب انسانی پر آفتاب نبوت کی شعاع پڑ جاتی ہے، وہی قلب ایمان و یقین کی روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان اور توحید کا درجہ:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایمان و توحید کے داعیِ اعظم تھے، پھر آپ کے اندر ذاتی طور پر ایمان و توحید کا کتنا مضبوط جذبہ ہوگا؟ — سیرت پاک کے دو واقعات اس پر روشنی ڈالتے ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا: مَا شَاءَ اللَّهُ وَمَا شِئْتُ — "جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں" — حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: — أَجَعَلْتَنِي لِلَّهِ نِدًّا — "کیا تم مجھے اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دے رہے ہو، تمہیں یوں کہنا چاہیے — مَا شَاءَ اللَّهُ وَحْدَهُ — "جو صرف اللہ چاہے وہ ہوگا، ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: مَنْ يَطْعُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ رَفَعَهُ وَ مَنْ يَعْصِيهِمَا فَقَدْ عَوَى — "جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ راہِ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرتا ہے وہ گمراہ ہے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلام کو ناپسند کرتے ہوئے اس مقررے متعلق کہا: بِئْسَ خَطِيبُ الْقَوْمِ أَنْتَ — "تو قوم کا بڑا خطیب و داعی ہے۔"

حدیث کے شارحین نے لکھا ہے کہ حضور نے ناراض ہونے کا سبب یہ تھا کہ اس خطیب نے اللہ اور رسول کو تشبیہ کی ایک جی ضمیمہ میں جمع کر دیا جس سے سننے والوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے

کہ یہ کہنے والا شاید اللہ اور رسول کو برابر سمجھتا ہے (سیرت النبی ج ۲ ص ۴۵۵)  
ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم توحید الہی کا اتنا شدید  
اور نازک جذبہ رکھتے تھے کہ آپ شرک کا ادنیٰ اور معمولی شبہ بھی ناپسند فرماتے تھے اور ایسی  
کوئی بات آپ کو گوارا نہ تھی جس سے لوگوں میں شرک وغیر اللہ پرستی کا فردغ ہو۔

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے تعظیم کے طور پر کھڑے ہونے کو ناپسند  
فرمایا، صحابہ کرامؓ نے تعظیمی سجدہ کی اجازت مانگی تو اس سے روک دیا، اپنی قبر مبارک کے متعلق  
دُعا فرمائی — اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَجْعَلُ قَبْرِيْ رَتْناً — ”خداوند! میری قبر کو بُت نہ بننے  
دیکھو۔ (ایضاً ص ۴۲۰)

### اپنی نبوت پر ایمان و یقین:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی ذات و صفات کے ساتھ اپنی رسالت اور نبوت پر  
بھی پختہ یقین تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر دعوتِ حق کے لئے جو جوش و لگن، اعزم و حزم  
اور بے خوفی کے جذبات موجود تھے وہ اسی غیر معمولی یقین کا ثمرہ تھا کہ آپ خدا کے سچے رسول  
ہیں اور آپ کو ہر حال میں کامیابی حاصل ہوگی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نبی ہونے کے  
بارے میں اگر ذرہ برابر شبہ نہ ہوتا یا آپ اپنے ضمیر کے خلاف صرف لوگوں کو دھوکا دینے یا دوسری  
مفاد حاصل کرنے کے لئے معاذ اللہ نبوت کا ڈھونگ رچا رہے ہوتے تو آپ کی جدوجہد میں اتنا  
جوش اور خلوص نہ ہوتا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار ”محمد اور اس کا مذہب“ کے عنوان پر لکھتا ہے:  
”محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یقین اپنے قریب کے لوگوں میں خدیجہؓ، ابو بکرؓ اور عمرؓ کے  
دل میں پیدا کیا اور جو ہر قسم کی تکلیف اور ذلت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ سال تک جھیلی اور جس  
جوال مردی سے اس نے ہر قسم کی دولت اور سرداری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سادہ  
مزاجی اور سادہ طرز معاشرت کو سامنے رکھ کر جو آخری دم تک قائم رہی — ہم پر یقین،



والیر اور مرالشی کے خیالات قبول نہیں رکھتے، بلکہ مہلر، کاسن، کارائل اور اردنگ اور دیگر محققین یورپ کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ عام طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کو تسلیم کریں اور اس بات کو جانیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے اوپر بھروسہ تھا اور وہ اپنی رسالت کو برحق سمجھتا تھا (خطبات احمدیہ)

اسی طرح کارائل کے تاثرات یہ ہیں۔ ”بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو پوز ائیٹ اور رسالہ کی خصوصیت پر یقین نہ رکھتا ہو اور ایک پختہ مکان بنا لے، وہ پختہ مکان کب ہوگا، وہ تو مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا، بارہ سو برس تک اسے قیام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اور اٹھارہ کروڑ انسان اس میں کیسے رہ سکتے ہیں؟“

### آخرت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان و یقین:

آخرت کی زندگی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان و یقین کا یہ حال تھا کہ ہر وقت آپ کی آنکھوں کے سامنے آخرت کا خوفناک منظر رہتا تھا۔ امام ترمذی نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: ”میں دنیوی لذتوں سے کیونکر لطف اندوز ہوں جب کہ دیکھ رہا ہوں کہ صور پھونکنے والے فرشتہ نے اپنے منہ میں صور لے رکھا ہے اور وہ تیار کھڑا ہے، اس نے اپنی پیشانی جھکا رکھی ہے اور بارگاہِ حق کی طرف کان لگا رکھے ہیں کہ کب اسے صور پھونکنے کا حکم ملتا ہے، لوگوں نے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اس حالت میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَعْدُ — پڑھتے رہا کرو، یعنی خدا کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کی طاقت اپنے اندر پیدا کیا کرو،

خدا اور آخرت کے خوف سے آپ کی یہ حالت رہتی تھی کہ حضرت مُعَلِّقٌ کہتے ہیں: ”میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپ کا یہ حال تھا — دلجو نہ ازینو کا زینا السرحیل یعنی بیکی — نمازیں آپ کے سینہ مبارک سے رونے کی آواز بلند ہوتی جس طرح ہڈیا کے پکنے کی آواز بلند ہوتی ہے، ایک روایت میں ہے کہ —

کا ذیہ الرحمی۔ آپ کے سینے سے چلنے کی سی آواز نکلتی تھی (ترجمان السنہ ج ۳، ص ۳۹)۔  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت گزاری کا بے مثل مقام:

جس ذاتِ گرامی میں اپنے خدا پر ایمان، آخرت اور جزاء و سزا پر ایمان کی بخشیگی کا یہ حال تھا اس میں عبادت و عبادت کا جذبہ کتنا شدید ہوگا؟ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے مطابق نبوت سے پہلے حضور جلی نور پر اپنے خالق کی عبادت کرتے تھے۔ نبوت ملنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ و دعوت اور اُمت کی دیکھ بھال کی گونا گوں اور وسیع تر ذمہ داریاں عائد ہو گئیں اور وحی الہی نے آہستہ آہستہ عبادتِ الہی کا ایک متوازی اور معتدل نظام نافذ کر دیا۔

اس نظام عبادت میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، اعتکات، تلاوت اور اذکار و استغفار جیسی عبادتیں اپنی اپنی جگہ مختلف رنگ و بو رکھنے والے پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم تنگ و محدود نہیں، اسلام میں ہر کام عبادت ہے، تجارت ہو، زراعت ہو، صنعت ہو، گھرداری ہو، حکمرانی ہو، جب کہ یہ کام احکام الہی کے دائرہ کے اندر ہے اس لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر عبادت گزار کون ہو سکتا ہے؟۔۔۔ کیونکہ عبادتِ خدا کے مقابلہ میں حضور کے لئے خدا کے احکام کی تعداد بھی زیادہ تھی، اور ان کی پابندی کا حکم بھی آپ کے لئے اُمت سے زیادہ سخت تھا۔

اُمت پر صرف پانچ نمازیں فرض تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد کی نماز کے ساتھ چھ نمازیں فرض تھیں۔ ایک مسلمان پر ایک بیوی یا زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے اور ان کے ساتھ انصاف کرنے کی ذمہ داری ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ۸-۱۰ زوجات مطہرات کے ساتھ عدل و انصاف کا بہترین نمونہ پیش کرنے کی ذمہ داری تھی، روزوں میں آپ صوم و مال رکھتے تھے، لیکن اُمت کو اس سے روک دیا تھا، زکوٰۃ اور خیرات میں اُمت کے لئے

عام حالات میں ایک خاص مقدار مقرر فرمادی لیکن اپنا یہ حال رکھا کہ کبھی سائل کے جواب میں ”نا“ زبانِ اقدس پر جاری نہ ہوا اور وصال کے وقت گھر میں چند دیوار چھوڑ کر جانا بھی گوارا نہ کیا۔ اور اس کے یاد بود خدا کی اتنی زبردست عبادت سے بھی آپ کا شوقِ تعبُّد پورا نہیں ہوتا تھا، اور آپ اس سے زیادہ عبادت کرنا چاہتے تھے مگر اس خیال سے آپ اپنے شوقِ عبادت کو پورا کرنے سے رُکے رہتے کہ کہیں صحابہ کرام آپ کی محبت اور اتباع میں زحمت اور مشقت میں نہ پڑ جائیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے۔ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیوم العمل وهو یحب ان یعمل بہ خشية ان یعمل بہ الناس فیقرض علیہم (بخاری باب تخریض النبی)

اسی کو حافظ ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں۔ وقد کان یتوکل کثیراً من العمل وهو یحب ان یعمل بہ خشية المشقة علیہم (زاد المعاد ص ۱۹۲ برائش زرقانی ج ۲)۔

”یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سے اعمال چھوڑ دیا کرتے تھے، حالانکہ وہ اعمال آپ کو بہت محبوب ہوتے تھے، صرف اُمت کے مشقت میں پڑ جانے کے خوف سے“

حاصل یہ کہ سر در عالم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حکم پر پہلے خود چیتے تھے اور عام اُمت سے زیادہ خدا کے احکام کی تعمیل میں مشغول رہتے تھے، پھر دوسرے لوگوں کو عمل کی دعوت دیتے تھے، آپ کا حال بے عمل واعظوں کا سا نہیں تھا جو لوگوں کو تو دعوتِ عمل دیتے ہیں مگر خود بھی رہتے ہیں۔

زندگی کے دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بندگی کا کیا حال تھا؟۔ انفرادی عبادت کے علاوہ سماجی، معاشی، اجتماعی اور سیاسی معاملات میں آپ کی زندگی اور سیرت پاک احکامِ الہی اور قانونی حق کا لٹنا مکمل اور اعلیٰ منزلہ تھی؟۔ اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں موجود ہے۔

## عبدیت اور تواضع کے مختلف رنگ

نبی کا کام خدا سے لینا اور اس کے بندوں کو دینا ہے، نبی خدا سے بھی واسل ہوتا ہے اور اس کے بندوں میں بھی شامل ہوتا ہے، اسی لئے نبی کے اندر دو قوتیں ہوتی ہیں، ایک قوت قدسہ دوسری عبدیت، قوت قدسہ سیر سے نبی کے اندر عظمت اور شوکت پیدا ہوتی ہے اور عبدیت کی صفت عام بندگان خدا کی پیروی کے لئے نبی و رسول کے اندر اسوۂ حسنہ اور نمونہ عمل کی تشکیل کرتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اللہ میں یہ دونوں قوتیں کمال کے مرتبہ پر موجود تھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسہ کا یہ حال تھا کہ اسی جسم و جسمانیات کے ساتھ شب معراج میں قاف و قوسین کے مقام پر جلوہ افروز ہوتے تھے، عرش سے فرشتے آپ کی حکمرانی کا دیکھا کرتے تھے، ایک اشارہ میں چاند کے دو ٹکڑے کمرہ دیئے، ایک اشارہ میں سورج کو غروب ہونے سے روک دیا، ایک مٹھی خاک پھینک کر لشکرِ باطل کو اندھا کر دیا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری کر کے تمام فوج کو سیراب کر دیا، سنگریزوں کو حکم دے کر ان سے اپنی نبوت کا اقرار کرایا اپنے کلام کے اثر اور اپنی نظروں کی کشش سے عرب و عجم کے ایک لاکھ چوبیس ہزار انسانوں (صحابہ کرامؓ) کو مدلق، فاروق وغنی اور حیدر بنا دیا جس کی مثال نبوت کی پوری تاریخ میں نظر نہیں آتی یہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسہ کا گہرا تھا، اب صفت عبدیت کا کمال دیکھیں اس صفت نے بشریت کا جامہ اختیار کیا تاکہ نوعِ بشر اور عالمِ انسانیت کے لئے آپ کی ذات ایک مکمل نمونہ بن سکے، آپ نے اعلان فرمایا — انا انا بشر مثکم یوحی الیّ — بے شک میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں، تمہیں جیسا ایک انسان ہوں، البتہ مجھ پر کلام حق اترتا ہے — یعنی مجھ میں ایک قوت قدسہ ہے جو تم میں سے کسی کے اندر نہیں ہے، اسی کے مجھ میں اور تم میں امتیاز کامل ہوتا ہے۔



بشریت کے اس اعلان میں معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص پر شیدہ نہیں۔  
 ورنہ خدا تعالیٰ بار بار حکم دے کہ آپ کی زبان سے یہ اعلان کیوں کرتا، بلکہ اس میں صفتِ عبودیت  
 کا اظہار ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں جیسا ایک بشر ہوں، زندگی کے تمام تشبہ و تراز  
 سے ایک انسان کی طرح گذرتا ہوں، ایک عام انسان کی زندگی میں جو جو رنگ فطری طور پر ہوتے  
 ہیں وہ تمام رنگ میری زندگی کے اندر بھی موجود ہیں، تاکہ ہر ہر قدم پر میری سیرت اور میرے  
 اسوۂ حسنہ کی پیروی تمہارے لئے واجب ہو جائے اور میری سنت اور سیرت کے سوا کسی  
 دوسری طرف دیکھنے کی تمہیں ضرورت پیش نہ آئے اور نہ کسی دوسری طرف دیکھنا جائز ہے۔  
 میری زندگی ایک عام بشر کی طرح اگر ہر آرام و راحت، ہر دکھ اور سکھ اور ہر امتحان  
 سے نہ گذرتی تو تم کہہ سکتے تھے کہ محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لوہم اپنا پیشوا کیسے بنائیں  
 اور ان کے نمونہ کو ہر قدم پر اپنے سامنے کیسے رکھیں یہ تو زندگی کے ہر سر و گردن اور ہر تنگ  
 و ترشی سے باخبر نہیں ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اب تم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔

پس حاصل یہ نکلا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ”عبودیت کی صفت پیغمبرانہ قیادت  
 کے اعلیٰ کمال اور عالم گیر رسول کی وہ خصوصیت ہے جو کسی سابق رسول میں موجود نہیں۔  
 اسی لئے قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کے اہم مقامات پر حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی صفت ”عبودیت“ کے ساتھ یاد فرمایا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے  
 لئے اسی صفت کو بطور لقب اختیار فرمایا ہے۔

قرآن کریم نے کہا۔۔۔۔۔ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ  
 تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُورَانَ عَلَى عَبْدِهِ وَآلِهِ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ  
 يَدْعُوهُ كَادُوا أَن يَخَذَلُوهُ۔۔۔۔۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ شہادت میں اپنے متعلق اعلان  
 کرایا اشہد ان محمدا عبده ورسوله۔

## عبدیت انسانی کمزوریوں کے رنگ میں :

مظلوم و پریشان ہونا، دکھ اور تکلیف میں ہونا، بھول اور چوک اور بیماری و موت کے حالات سے گزرتا انسانی زندگی کی کمزوریاں شمار ہوتی ہیں، اور ایک عظیم قوتِ تدبیر رکھنے والے پیغمبر کی زندگی میں جب یہ باتیں نظر آتی ہیں تو ایک عام عقل رکھنے والا انسان تعجب میں پڑ جاتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری تقاضوں، بشری کمزوریوں اور آپ میں ایک عام زندگی کی جھلکیاں دیکھ کر طرح طرح کی بے ضرورت تاویلیں کرنے لگتا ہے، حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کی ہر منزل سے اس لئے گزارتا ہے تاکہ ہر منزل پر اس کے نشانِ قدم پڑ جائیں اور کسی مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے نشانات سے محروم نہ رہے۔

## راہِ حق میں مظلومیت :

غور کرو، راہِ حق میں ذلیل دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہونا، پتھر کھانا، قیدی بن کر بھوک پیاس کی تکلیفیں اٹھانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کس قدر قابلِ رحم پہلو ہے اور ایک دو دن نہیں، سال دو سال نہیں، تیرہ سال مکہ میں اور پھر مدینہ میں — زندگی کے آخری لمحہ تک نت نئے انداز کی تکلیفیں اٹھانی گئیں۔

کیا خدا تعالیٰ اپنے محبوب کو زحمت میں ڈالے بغیر اسلام کا پیغام عام نہیں کر سکتا تھا؟ ضرور کر سکتا تھا اور جس طرح حضرت عمر ابن خطابؓ کے حق میں اپنے محبوب کی دعا کو قبول کر کے چند گھنٹوں میں عمر رضہ کو آپ کے قدموں میں لاکر ڈال دیا تھا اسی طرح تمام قریش کے حق میں بھی آپ کی دعا قبول کی جاسکتی تھی اور ۲۳ سال کا کام صرف ۲۳ گھنٹوں میں انجام پا سکتا تھا، لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو پھر راہِ حق میں آپ کی امت کس کے نقش قدم دیکھ کر صبر و استقامت کا اسوہ اختیار کرتی اور کس کی مظلومیت مظلوموں کو ڈھارس بندھتی؟

## بھول چوک اور نبی معصوم:

وحی الہی ان کی نگرانی کرتی ہے، خاندان ان کے معصوم ہوتے کا اعلان کرتا ہے اور پھر بھی ہمارے جیسی عبادت کے اندر — جو ان کی محبوب ترین عبادت ہے — ان سے بھول بھولائی ہے، حضرت عبد اللہ کہتے ہیں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طہر کی پانچ رکعتیں پڑھادیں، نماز کے بعد آپ سے کہا گیا، حضور! صلی اللہ علیہ وسلم کیا طہر کی رکعتیں چار سے زیادہ کر دی گئی ہیں؟ آپ نے فرمایا، کیوں، کیا ہوا؟ صحابہ نے کہا، آپ نے پانچ رکعتیں پڑھادیں، یہ سن کر آپ نے سلام کے بعد دو سجدے سہو کے ادا کئے اور فرمایا — **اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَنْسُوْا مَا كُنْتُمْ تَفْسُوْنَ** فاذا نسيت فذكروني — ”لوگو! میں تم جیسا ہی ایک بشر ہوں، جس طرح تم بھول جاتے ہو، اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں، پس جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد دلادیا کرو اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن جنابت کا غسل کرنا بھول گئے، حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ ایک دن صبح کی نماز کے بعد صفیں سیدھی ہو گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ سے نکل کر مصلت پر تشریف لے آئے، کھڑے ہوتے ہی آپ کو غسل کرنے کا خیال آیا، آپ نے فرمایا، ٹھہرے رہو، پھر آپ دولت خانہ میں تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو آپ کے سر مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا — اور پھر آپ نے نماز پڑھائی۔

پہلا واقعہ ترجمان السجدہ ۳ میں بخاری اور مسلم کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے اور دوسرا واقعہ امام ابو داؤد نے کتاب الطہارت میں نقل کیا ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اور دماغ ہر قسم کی غلطی، خطا اور نسیان سے محفوظ رکھا جاتا تھا، تاکہ خدا کا پیغام پہنچانے اور پھر خدا کی ہدایت کے مطابق اس کی تشریح کرنے میں آپ کسی قسم کی خطا نہ کریں، لیکن کسی کسی موقع پر آپ سے بھول کرائی گئی تاکہ امت کو یہ بتایا جائے کہ نماز کے اندر بھول چوک بڑے لوگوں سے بھی ہو سکتی ہے، اور بھول چوک کی صورت میں تشریت

کا مسئلہ یہ ہے۔ اس طرح اس کی تدانی کی جاسکتی ہے۔

## بیماری اور جادو کا اثر !

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف حیوانات سجدہ کرتے تھے اور پھر سلام کرتے تھے اور یہ آپ کی قوتِ قدسیہ کا اثر تھا۔ دوسری طرف بچھو آپ کے ڈنک مار دیتا تھا، اور جادوگر جادو کر دیتا تھا، بخار کی تیزی پر لیشان کر دیتی تھی اور یہ آپ کی عبدیت اور بندگی کا اظہار تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ نے زمین پر ہاتھ رکھا تو ایک بچھو نے آپ کے ڈنک مار دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچھو کو چیل سے مار ڈالا، نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا، بچھو پر خدا کی پھڑکار ہو، نہ نمازی کو معاف کرتا ہے اور نہ بے نمازی کو، نہ نبی کو چھوڑتا ہے اور نہ ہی غیر نبی کو، پھر آپ نے پانی میں نمک ملا یا اور وہ پانی اس زخم پر ڈالتا شروع کیا اور ساتھ ساتھ سورہ معوذتین پڑھتے رہے۔

خیبر کی ایک یہودی عورت نے آپ کو گوشت میں ملا کر نہر دے دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ ہی تناول فرمایا تھا کہ ہاتھ کھینچ لیا، پھر اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ کیا تو نے مجھے نہر دیا ہے۔ اس نے کہا، آپ کو کس نے بتایا ہے؟ آپ نے گوشت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، مجھے اس نے بتایا ہے، وہ عورت بولی حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے آپ کی رسالت کا امتحان لیا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہوں گے تو آپ پر نہر کا اثر نہیں ہوگا اور چھوٹے نبی ہونگے تو ہلاک ہو جائیں گے، آپ نے اس عورت کو معاف کر دیا

اسی نہر کا اثر دور کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان کرپ ابوہند انصاری سے سینگی لگوا کر لے تھے، لیکن یہ نہر اتنا اثر کر چکا تھا کہ مرضِ وفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیئے بغیر نہ رہا، وفات کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے



اعلہار کرتے ہوئے فرمایا۔

عائشہ رضی اللہ عنہا! خیر میں جو چند زہر آلود لقمے میں نے کھائے تھے اس کی تکلیف مجھے ہمیشہ یاد رہتی رہی، لیکن اب تو اس کے اثر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری شررگ کٹ جائے گی۔

محمد میں نے لکھا ہے کہ خیر کے زہر کا اثر آخر وقت میں اس لئے لوٹ آیا کہ خدا تعالیٰ آپ کو شہادتِ خفی کا درجہ عطا کرنا چاہتا تھا، کیونکہ شہادتِ جلی ختم نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا، جس کے اثر سے آپ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ آپ اپنی بیویں کے پاس گئے ہیں، حالانکہ آپ ان کے پاس نہیں ہوتے تھے۔ سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ عرب میں یہ جادو کی سب سے بدترین قسم تھی، ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے تو مجھ سے فرمایا، عائشہ! خدا تعالیٰ نے مجھے بتادیا ہے کہ مجھ پر جادو کس نے کیا ہے، وہ بد بخت انسان لبید بن اعصم ہے، یہ منافق شخص تھا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فرشتوں نے مجھے بتایا ہے کہ گنگھی اور بالوں کے ذریعہ جادو کیا گیا ہے اور ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں اسے رکھ کر ذروان نامی کنویں کے اندر پتھر کے نیچے دبا دیا گیا ہے۔

اس اطلاع کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں پر گئے اور وہ تمام سامان جس کے ذریعہ جادو کیا گیا تھا کنویں کے اندر سے نکال کر پھینک دیا گیا (ابن کثیرؒ صحیح مصری میں بحوالہ بخاری) اہل و عیال کا شکر:

اہل و عیال اور بال بچوں کے مستقبل کا فکر انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خدا کی ذات پر کون بھروسہ کر سکتا تھا، مگر آپ اس فکر سے خالی نہ تھے، یہ فکر انسان کے طبعی تقاضوں میں شامل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہرات سے فرمایا کرتے تھے ”مجھے تمہارا فکر رہتا ہے کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ میرے بعد تمہاری سرپرستی وہی لوگ کریں گے جو صابر اور صدیق ہوں گے (ترمذی)“



کرنے والا ہے؟

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اشارہ دل کو سمجھ رہے ہیں اور اس سورۃ کے نازل ہونے پر  
آبدیدہ ہو رہے ہیں کہ اس اعلان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا اشارہ پوشیدہ ہے  
بات ٹھیک تھی، حجۃ الوداع سے واپس آتے ہوئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑے  
صفر کے مہینہ میں درِ دہرے اس مرض کا سلسلہ شروع ہوا اور ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو انہما  
کو پہنچ گیا اور محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مولا سے جلتے، سفرِ آخرت کی یہ منزل حضور صلی اللہ  
علیہ وسلم نے کس طرح گزاری؟ — مرضِ وفات بڑھتے بڑھتے اس درجہ پر پہنچ گیا کہ  
بخار کی شدت آخری ڈگری پر ہے، غشی پر غشی طاری ہو رہی ہے، ابنِ مسعودؓ اس حالت میں اپنے  
آقا کی مزاج پر سی کرتے ہیں تو کہیں کے اوپر سے بخار کی حدت محسوس کرتے ہیں، بے چین ہو کر  
عرض کرتے ہیں کہ — تَوَعَّلْ وَعَكَّا شَدِيدًا — بڑا سخت بخار ہے حضور! —  
صلی اللہ علیہ وسلم، آپ جواب دیتے ہیں — اَجَلْ اِنِّیْ اَدْعُکَ کَمَا یَدْعُکَ رَجُلَانِ مِنْکَ  
قَالَ فَقُلْتُ، ذَٰلَکَ لَٰنَ لَکَ اَجْرَیْنِ؟ — قَالَ عَمَّ اَجَلْ — ”ہاں مجھے تمہارے  
دو آدمیوں کے برابر بخار چڑھتا ہے، میں نے کہا، اس لئے آپ کے واسطے دو اجر ہیں اور  
دو ہزار ثواب ہے، آپ نے فرمایا، ہاں اسی لئے۔

رفیقہٗ حیات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں — مَارَایْتُ اَحَدًا الْوَحْجُ عَلَیْہِ اَشَدَّ مِنْ  
رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ — ”میں نے بیماری کی سختی جیسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
پر دیکھی ویسی کسی دوسرے پر نہیں دیکھی“

ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانِ خدا کی مصیبت کے زیادہ سخت ہونے  
کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا — مُبْتَئِلِی الرَّجُلُ حَسْبَ دَیْنِہٖ فَاِنْ کَانَ فِی دَیْنِہٖ  
صَلْبًا اَشَدَّ بَلَاءً دَانَ کَانَ فِی دَیْنِہٖ رَقۃٌ هُوَ عَلَیْہِ — یعنی ہر انسان  
دنیا داری کی حالت کے مطابق آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، اگر وہ دینی حالت میں مضبوط رہتا

ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر دینداری کے ساتھ اس کا تعلق کمزور ہوتا، تو اس کا امتحان بھی ہلکایا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت پندرہ روز تک رہی، اس دوران میں آپؐ اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ جب ایک دن آپؐ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے ارادہ سے نکلے تو علی رضی اللہ عنہ اور فضل بن عباسؓ کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، آپؐ کے پیر کمزوری کی وجہ سے زمین سے ٹکرا رہے تھے اور آپؐ کا سر اقدس کپڑے سے بندھا ہوا تھا۔ آپؐ کہتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مرض میں اپنی وفات کا یقین تھا، اس لئے آپؐ نے اس مرض میں علاج نہیں فرمایا، ایک دفعہ بیویوں نے اصرار کر کے کوئی دوا دے دی تو ہوش میں آنے کے بعد ان سب پر سخت ناراض ہوئے۔

وصال کا وقت جب بالکل قریب آیا تو تکلیف کی شدت سے آپؐ نے اپنے دونوں مبارک ہاتھ پانی کے پیالے میں ڈالے اور پھر اپنے چہرہ اقدس پر ملے، یہ عمل بار بار کرتے رہے اور فرماتے رہے۔ لا الہ الا اللہ ان للموت سکوات۔ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک موت کی تکلیف برحق ہے، پھر آپؐ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور یہ کہنا شروع کیا:

\_\_\_\_\_ الرفیق الاعلیٰ \_\_\_\_\_ الرفیق الاعلیٰ \_\_\_\_\_

میرا سب سے اچھا رفیق، میرا سب سے اچھا اور برتر و بالا ساتھی۔ بس یہ آخری جملہ تھے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے نکلے اور آپؐ کے دونوں ہاتھ ٹھیک گئے اور آپؐ نے اپنی جان ”جہاں آفریں“ کے سپرد کر دی (ما ثبت بالسنة ص ۱۰۹ تا ۱۱۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح قدسی پر اپنے محبوب حق سے ملاقات کے وقت بے حسنی اور تکلیف کی کیفیت کیسی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کے آخری لمحات بھی اُمت کے لئے نمونہ لے طور پر چھوڑنے تھے، تاکہ اس منزل سے



گزرنے والا کوئی انسان اس نازک منزل میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے بلکہ رسولِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو سامنے رکھ کر آسانی کے ساتھ اس منزل سے گزر جائے دیکھو، جو کلمہ وحدت صفا کی پہاڑی پر آپ کی زبان سے سنا گیا اور پھر مکہ اور طائف کے بازاروں میں جس کلمہ کے حُرم میں پتھر کھائے، وہی کلمہ آخری وقت میں زبان پر جاری ہے اور دنیا کو استقامت اور کامیابی کا سبق دے رہا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## حصہ دوم: سیاسی زندگی

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

اور ہم نے اے رسول! نبی اللہ علیہ وسلم، تمہیں جہاں والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔  
قرآن کریم کی یہ آیت پاک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا جلی عنوان ہے۔  
یہ آیت پاک قرآن کریم کی ایک چھوٹی سی آیت ہے مگر معنوی گہرائی کے لحاظ سے قرآن کریم  
کی جامعیت اور بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یہ آیت پاک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دورِخ پیش کر رہی ہے۔  
ایک یہ کہ حضور کی نبوت خدا تعالیٰ کا اپنی مخلوق پر بڑا فضل و کرم ہے، خدا تعالیٰ نے اپنے  
فضل و احسان کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔  
دوسرا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی جہاں والوں کے حق میں رحمت اور خدا  
کا فضل و احسان ہے۔

پہلے مفہوم کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل و کرم نمایاں ہوتا ہے، اور  
دوسرے مفہوم کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا پہلو روشن ہوتا ہے۔

۱۔ آیت پاک میں یہ دونوں مفہوم صرف رَحْمَةً کی نحوی ترکیب کے فرق سے پیدا ہوتے ہیں۔  
مترجمین میں سے سعدی شیرازی (یا شریف جرجانی) نے اپنے فارسی ترجمہ میں اور حضرت مولانا

شاہ رفیع الدین دہلوی نے اپنے ارد ترجمہ میں یہی مفہوم اختیار کیا ہے  
دوسری ترکیب یہ ہے کہ رَحْمَةً کو اَرْسَلْنَا کا مفعول لہ اور رَحْمَةً کا فاعل خدا تعالیٰ  
کو بنایا جائے، اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہوگا

”نہ فرستادیم ترا مگر از دوائے مہربانی بر عالمہا (شاہ ولی اللہ)

شاہ عبدالقادر اردو میں فرماتے ہیں: ”اور تجھ کو جو رحم نے بھیجا سو مہربانی کہ جہاں کے لوگوں پر“

متاخرین علماء میں سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے بھی یہی معنی اختیار کئے ہیں۔  
خدا تعالیٰ کے کلام کی بلاغت کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی لفظ دو مفہوم ادا کر رہا ہے اور دونوں  
معانی مل کر خدا تعالیٰ کے پورے مقصد کو واضح کر رہے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام عالم والوں پر رحم فرما کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے  
لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

اور آپ کی ذات گرامی کو خدا تعالیٰ نے رسول بنا کر کائنات انسانی پر بڑا رحم فرمایا ہے کیونکہ  
آپ کی ذات عالم والوں کے حق میں بہت بڑی رحمت ہے۔

قرآن کریم نے یہ دونوں معانی الگ الگ آیتوں کے اندر بھی بیان کئے ہیں۔

حسب ذیل آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سلسلہ میں اپنی رحمت اور اپنے  
انعام و اکرام کو نمایاں کیا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ (سورہ آل عمران آیت ۱۱۴)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا جب بھیجا ایک رسول انہی میں سے“

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَكَوُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا انْفِصُوا مِن حَوْلِكَ

سورہ آل عمران آیت ۱۵۹ ”خدا کے فضل و کرم سے تم اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نرم دل

واقع ہوئے ہو اور اگر سخت دل واقع ہوتے اور سخت مزاج تو یہ لوگ آپ کے ارد گرد سے بھاگ جاتے“

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو اہل ایمان پر اپنا فضل و کرم

قرار دیا اور یہ اشارہ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت خدا تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کا عکس کامل

اور مظہر کامل ہے حقیقی رحمت خدا تعالیٰ کی ہے۔

جن حضرات نے آیت کے دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے ان کے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت

پاک ہے: ————— عَزِيزٌ عَلٰی مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلٰیكُمْ يَا مُؤْمِنِينَ رُدُّوْا رَحِيْمٌ (سورہ توبہ آیت ۱۲۸) ————— ”تم پر جو سختی آئی ہے وہ اس رسول پر گراں گذرتی ہے وہ تمھاری بھلائی پر حریص ہے اور اہل ایمان کے حق میں بے حد مہربان اور مشفق ہے۔“

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو رحمت اور رافت کی صفتوں سے براہِ راست متصف فرمایا ہے ۷

یا رب تو کریمے و رسولِ تو کریم  
صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم  
یا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی حَبِيْبِكَ دَائِمًا اَبَدًا

## رحمۃ للعالمین ہونے کے مختلف پہلو

”رحمۃ و رافت“، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اخلاقی صفات کا عنوان ہے خدا تعالیٰ نے آپ کو اسی اخلاقی صفت سے متعارف کرایا ہے اور آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمۃ اور رُوف الرحیم فرمایا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اخلاقی خوبیاں نہ صرف اپنی ذات کے حسن و کمال کے لئے تھیں اور نہ صرف اپنی امت کو اخلاقی روشنی اور دینی و دنیاوی فائدہ پہنچانے کے لئے بلکہ اپنی ذات اور اپنی امت کے علاوہ تمام جہان والوں کو روحانی اور مادی فلاح و سعادت کی منزل پر پہنچانا آپ کے خلقِ عظیم اور آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا اصلی مشن تھا۔

اخلاقی صفات میں دو قسم کی صفتیں ہیں، ایک متعدی صفات جیسے رُحْم و کرم، جو د و سخا، عدل و انصاف، صبر و تحمل اور عفود و درگزر یہ صفات براہِ راست خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ دوسری قسم لازمی مناسباتی ہے، جیسے عفت، صدق، تواضع اور زہد ————— ان



صفتوں کا براہِ راست تعلق موصوف کے اندر ملکر ترقی حسن و جمال پیدا کرنے سے ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ بالواسطہ ان صفتوں سے مخلوق خدا کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔  
ذیل میں ان صفات کی تشریح کی جاتی ہے۔

### عفت:

عفت کے معنی علمائے اخلاق کے نزدیک یہ ہیں کہ انسان کھانے پینے اور جنسی خواہش میں اعتدال رکھے عفت پیدا کرنے کے لئے ناجائز چیزوں سے پرہیز رکھنا تو بہر حال ضروری ہوتا ہی ہے لیکن کبھی کبھی حلال چیزوں سے اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔

قرآن کریم نے عفت کے لفظ کو تین موقعوں پر استعمال کیا ہے۔

(۱) شرمگاہ کی حفاظت میں — وَ لَيْسْتَغْفِرِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (سورہ نور: ۳۳) — ”اور اپنے آپ کو تھامتے رہتے ہیں جن کو نہیں ملتا سامانِ نکاح کا، جب تک کہ مقدور دے ان کو اللہ اپنے فضل سے۔“ (شاہ عبدالقادر)  
تھامنا، قابو میں رکھنا، ضبط کرنا — یہی مفہوم ہے عفت کا، عورت کے حق میں —  
عفت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

عورت کے لئے عفت یہ ہے کہ اپنے ناموس کی حفاظت کو خطرہ میں ڈالنے والے بناؤ سنگار اور جسمانی نمائش سے پرہیز، یعنی موتی کی حفاظت اور موتی کے آب کی حفاظت۔ موتی رہے اور اس پر ”آب“ نہ ہو تو ”بے آب موتی“ کی قیمت گر جاتی ہے۔  
سورہ نور میں آئے ہیں رکھا گیا ہے:

وَالْقَرَأَةُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ  
يَدَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَنْ يَسْتَغْفِنَنَّ خِيَرَتَهُنَّ ۚ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (سورہ نور: ۶۰)  
”اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتوں میں سے، جن کو توقع نہیں رہی نکاح کی اپنے  
گناہ نہیں کہ اتار رکھیں اپنے کپڑے، یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں اپنا سنگار اور اس سے بھی بچیں تو بہتر

ہے ان کے لئے اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔“

شاہ صاحب حاشیہ پر لکھتے ہیں ————— ”یعنی بوڑھی عورتیں گھر میں تھوڑے کپڑوں میں رہیں تو درست ہے اور پورا پردہ رکھیں تو اور بہتر ہے۔“

مولانا عثمانی لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ اور گھر سے باہر نکلتے وقت بھی زائد کپڑے مثلاً برقع وغیرہ اتار دیں تو کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ زینت کا اظہار نہ ہو (حاصل ص ۴۶۴)

”یعنی آپ پر وہ نشیں کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیا دار تھے۔“

حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عفت کا کمال و جمال دیکھنا ہو تو نبوت سے پہلے گانے بجانے اور تبول کا چڑھاوا کھانے سے پرہیز، دشمنوں کی بُرائی سننے سے پرہیز، بُرا کہنے سے پرہیز، زبان پر بدعبار کے الفاظ لانے سے پرہیز اور ازدواجِ مطہرات کے ساتھ پاکیزہ معاشرت اور ایک بیوہ کے ساتھ جوانی کا بہترین حصہ منہی خوشی گزارنے کے واقعات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

یہ واقعات جلد اول اور پیشِ نظر جلد ثانی دونوں میں مختلف عنوانات کے تحت پیش کئے گئے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ نے تعفف کا ترجمہ ”بسب طمع نہ کردن“ کر کے یہ بتایا ہے کہ عفت سے خود داری، بے نیازی اور قناعت کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور علماء و اخلاق نے لکھا ہے کہ عفت کی صفت سے امانت، عدل، قناعت، ایثار اور زہد کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ جو انسان عفت کی دولت سے مالا مال ہوگا وہ اپنے عدل سے، اپنی امانت سے اور اپنے ایثار سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچائے گا۔

یہی حال دوسری لازمی صفات، صدق، اور تواضع کا ہے، انسان سچ بولے گا، اسی سے اس کی ذات قابلِ اعتماد بنے گی، وہ تواضع اختیار کرے گا، اس سے اس کی ذات دوسروں کی نظر میں محبوب ہو جائے گی۔

اور ایک قابلِ اعتماد اور پسندیدہ شخصیت عوام کو صحیح راہ بتانے اور ان کے بُرے بھلے کی نشاندہی کر کے انہیں غلط راستے سے بچانے میں کامیاب ثابت ہوگی۔

یہی ان لازمی صفات کا مستعدی اثر اور ثمرہ ہے۔

اب مستعدی صفات کی تشریح ملاحظہ ہو۔

رحم و کرم:

یہ صفت بھی جمالِ اخلاق کا سرچشمہ ہے، جب مخلوقِ خدا، کسی قسم کی پریشانی، کمی قسم کی بھینسی اور کسی قسم کی مظلومیت کا شکار ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ کی یہ صفتِ رحمت اس کے خاص بندوں میں

جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ اس کے بندوں کو ظلم و ستم اور اضطراب و بے چینی سے نجات دلاتے ہیں۔  
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی خدا کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کا آخری اور  
 مکمل ظہور ہے، اور آپ نے مخلوق خدا کو ہر قسم کی تکلیف سے بچانے کی کوشش کی ہے جس نے  
 آپ کی رحمت کا دامن تھا مہر ہے اور آپ کی رحمت سے فائدہ اٹھایا ہے، آپ کے پیغام کو قبول  
 کیا ہے، آپ کے نظام زندگی کے جتنے حصے کو اپنایا ہے، اس نے اپنی محبت اور اطاعت و اتباع  
 کے مطابق اس سے فائدہ اٹھایا ہے، البتہ جس بد نصیب نے آقا پر رحمت سے آنکھیں بند کر لی ہیں اس  
 کی نورانی شعاعوں سے بھاگ کر اپنے آپ کو تاریکی کے تہ خانہ میں بند کر لیا ہے وہ محروم رہا ہے اور  
 اس میں قصور بھاگنے والے کا ہے، آقا پر رسالت کی تابانی تو سب کے لئے عام ہے۔  
 جو دوسنخا:

خدا کی مخلوق اور اس کے بندوں کو جب بھوک پیاس کی ضرورت پیش آتی تو رسول اکرم صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی رحمت نے ————— جو دو کرم اور سخاوت کی شکل اختیار کر لی اور آپ کا ابر کرم  
 اس طرح برسا کہ بڑے بڑے سخی اور فیاض ششدر رہ گئے۔

امانت و دیانت:

بندگان خدا کے حقوق ادا کرنے کا وقت آیا، تو آپ کی رحمت نے "امانت" کی صورت میں  
 ظہور کیا اور ہر حق دار کو اس کا واجب حق عطا کر دیا۔  
 صبر و تحمل:

ظالموں اور نادانوں کے ظلم و ستم کے وقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت صبر و تحمل  
 کی صورت میں سامنے آئی۔

عفو و درگزر:

صبر و برداشت سے آگے بڑھ کر ان کی ایذا رسانیوں کو معاف کرنے کا وقت آیا تو آپ کی  
 رحمت نے عفو و درگزر بن کر دشمنوں کو اپنے سینے سے لگایا۔



## عدل و انصاف:

خدا کے مظلوم اور ستم رسیدہ بندوں کو ظالم طاقت و ردوں کے ظلم سے بچانے اور جبر و اکراہ کی حالت ختم کرنے، آزادی کی فضاء پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو رحمت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 \_\_\_\_\_ عدل \_\_\_\_\_ کی صورت اختیار کر لی اور آپ ایک عادل حکمران اور عادل جج بن کر مظلوموں کی دستگیری فرمانے لگے۔

علماء اخلاق نے لکھا ہے کہ عدل تین صفتوں سے مل کر بنتا ہے، حکمت، عفت اور شجاعت۔  
 خدا تعالیٰ نے قیامِ عدل کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص مشن قرار دیا تھا اس لئے آپ کے اندر حکمت و تدبیر، پاک دامن اور نیک کرداری اور شجاعت و جرأت کی تمام صفات و دولت فرمائی تھیں۔  
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ اخلاقی صفات سماجی اور معاشرتی زندگی میں بھی مکمل طور پر نمایاں ہوئیں اور سیاسی اور غزواتی زندگی میں بھی پورے کمال کے ساتھ دنیا کے سامنے آئیں اور دنیا سے اپنی بے مثال عظمت کا لوہا منوایا، پیشِ نظر حصہ ثانی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اخلاقی اور میدانِ جنگ میں دشمنوں کے ساتھ رحم و کرم کے پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔  
 سماجی اور معاشرتی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کے واقعات پہلے حصہ میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

## اخلاقی فضائل، روحانی کمالات اور سیاسی تدبیر کا مکمل اور جامع نمونہ

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے دائمی ہدایت، عالمی مذہب اور عالم گیر طریقہ زندگی ہونے کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ آپ کی حیات اپنے اندر انسانی کمالات و اوصاف کا مکمل عکس رکھتی ہے، اگلے پیغمبر جس دور میں تشریف لائے اس دور میں انسانی زندگی محدود ضرورتیں رکھتی تھی، اس لئے وہ رسول و نبی بھی محدود صلاحیتوں کے مالک تھے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس دور میں تشریف لائے اس دور میں زندگی کا پھیلاؤ وسیع سے وسیع تر ہو گیا اس لئے اس دور کی رہنمائی کرنے والے رسول میں بھی رہنمائی اور ہدایت کا ہر رنگ نظر آتا ہے۔

آج کا انسان زندگی کے ہر شعبہ میں کسی ایک رسول و نبی کو اپنا ہادی بنانے کے لئے منتخب کرنا چاہے تو وہ ہزار تلاش و جستجو کے بعد اگلے رسولوں میں سے کسی ایک رسول سے اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا اس جامعیت اور کمال کا ہادی جو زندگی کے ہر شعبہ میں تنہا ہر انسان کو کامیاب تربی زندگی کی طرف رہنمائی کرے تو وہ صرف رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور تاریخ اسے تسلیم کرتی ہے کہ انبیائے کرام اور پیشوایان عالم میں صرف رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ایسی ہے جو زندگی کی گونا گوں متفاد اور انواع و اقسام کی تمام صفتوں کا حسین ترین گلدستہ اور تمام انسانی اوصاف کا نہایت متوازن نمونہ گو تم بدھ کے پاس صرف ترک دنیا اور زہد کا نمونہ ہے، تجارت، حکمرانی اور سماجی زندگی کا کوئی نمونہ نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جوش و جذبہ اور جلال ہے لیکن عفو و کرم اور درگزر کی کوئی اعلیٰ مثال نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں عفو و کرم اور رحم دلی اور مسکینی ہے، لیکن برائی اور ظلم کی سرکوبی کی کوئی مثال نہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ تمام نمونے موجود ہیں

اخلاقی اعتبار سے دیکھو، عفو و کرم کے وقت بے مثال عفو و کرم ہے اور ظلم کے مقابل میں بے مثال شجاعت اور جلال ہے، مسکیتی اور خاکساری ہے لیکن ضرورت کے وقت عظمت و رفعت کا اظہار بھی ہے

سماجی زندگی کو دیکھو، سرپرستی کی ٹوکری ہے اور ایک نوجوان، ایک حکمران اور سپہ سالار کا دبیر اور شوکت بھی ہے، ماں، باپ کے لئے ادب بھی ہے اور اولاد کے لئے محبت اور تربیت کی سختی بھی ہے، ایک شریف شوہر کا پیار بھی ہے اور اسی کے ساتھ ایک صاحب کردار شوہر کا کنٹرول بھی ہے۔ داؤد و سلیمان علیہما السلام سے زیادہ امیری اور دولت مندی بھی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ زہد اور غریبی بھی ہے، حدیبیہ میں صلح پسندی ہے تو طائف و حنین میں شجاعت و دلیری ہے۔ ایک کامیاب تاجر بھی ہیں اور کامیاب دانشور بھی، مہر پر بے مثال خطیب بھی ہیں اور صفحہ پر خاموش معلم اور مرتبی بھی۔

حاصل یہ کہ وہ ایک زندگی جو جملہ رسولوں کے کمالات کا منظر اور انسانی حسن و جمال کا بے مثال پیکر ہے اور تاریخِ انسانی اس شانِ کمال کی کوئی زندگی نہ اب تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی، وہی زندگی آج تمام انسانوں کے لئے بہترین ہادی اور قائد بن سکتی ہے اور وہ زندگی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

**حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی خدا تعالیٰ نے قسم کھائی:**

اسی لئے خدا تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھائی اور اسے شہادت اور دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا: — لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ — ”قسم ہے تیری زندگی کی، یہ (منکرین) گمراہی میں سرگرداں ہیں“ (حجر، رکوع ۵)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ محبوب زندگی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جس کی اس نے قسم کھائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سوا کوئی زندگی ایسی نہیں جس کی خدا نے قسم کھائی ہو۔

عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جا رہی ہے اسے دلیل و شاہد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس ہی طے سے خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو حق و صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بنا کر پیش کیا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی زندگی سے اپنی صداقت پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا — فَقَدْ كَبَيْتُ فِيكُمْ عُمَرَاءَ مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس رکوع ۲) —  
”میں نے تم میں اس سے پہلے عمر کا بڑا حصہ گزارا، کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟“

مطلب یہ کہ نبوت کے دعوے سے پہلے میں نے تم میں زندگی کے چالیس سال گزارے یہ عمر کا بڑا حصہ ہے۔ تو کیا میری وہ زندگی میرے سچا ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی آپ کے صادق، سچا اور دیانت دار ہونے کی شہادت اور دلیل کیسے ہے اس پر انصاف پسند مغربی مسنفین کے حسب ذیل تاثرات ملاحظہ ہو۔

## مغربی دانشوروں کا الگ الگ استدلال:

سر ولیم میور نے ”لائف آف محمد“ لکھی تو اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں، یوپی خدیجہ کبریٰؓ، دوست ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور بھائی علی رضی اللہ عنہ اور خادم زیدؓ کے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پر خلوص ایمان لانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت نظر آئی اور اس نے اعتراف کیا کہ ایک مکار اور دھوکہ باز شخص یا ہر والوں کو تو اپنے قریب اور بھوٹ میں پھانس سکتا ہے لیکن اپنے گھر والوں کو زیادہ دیر تک اپنے دام قریب میں گرفتار نہیں رکھ سکتا۔

سر ولیم ایک بہت بڑے معق میسائی تھے اور ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۴ء تک سات سال یوپی کے گورنر رہ چکے ہیں اور چار جلدوں میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی لکھی ہے



دوسرے عیسائی عالم مسٹر گارڈن فرے گبنس ایک بڑے انصاف پسند محقق تھے انھوں نے متعصب عیسائیوں کے لگائے ہوئے الزامات کی تردید میں "اپالوجی فار محمدؐ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

مسٹر گارڈن فرے کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اس بات میں نظر آئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے سب پہلے عرب کے بااثر، دولت مند اور بڑے لوگ تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد بڑے بڑے کامیاب حکمران، کامیاب سپہ سالار اور نہایت منظم ثابت ہوئے۔ جیسے ابو بکر رضی، عمر رضی، عثمان رضی، علی رضی، ابو عبیدہ رضی، زبیر رضی، سعد بن ابی وقاص رضی، عبدالرحمن بن عوف وغیرہ۔۔۔۔۔ کم حیثیت لوگوں میں صرف زید اور بلال منوعہ تھے۔

وہ کہتا ہے کہ ایسے بڑی حیثیت اور عقل و دانش رکھنے والے لوگ آسانی سے کسی فریب میں گرفتار نہیں ہو سکتے تھے۔

بعین عیسائی علما دین عیسوی کی یہ خوبی سمجھتے ہیں کہ آپ پر سب سے پہلے کم حیثیت کے لوگ ایمان لائے، لیکن مجھ سے کوئی پوچھے تو مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی کہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے والوں میں "لاک" اور "نیوٹن" جیسی حیثیت کے دانش ور اور فلاسفر ہوتے۔ (فقہ نمبر ۱۵) آگے چل کر (فقہ ۴۲) میں گارڈن فرے لکھتا ہے کہ تمام عیسائی بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک نہایت پاک طینت، نیک چلن اور صادق دامن رہے، پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ایک شخص چالیس سال تک صادق دامن رہ کر اکتالیسویں سال ایک دم فریب کار اور جھوٹا بن گیا؟ پھر اس ایک دم بدل جانے کی دو وجہیں ہو سکتی تھیں۔

۱۔ دولت و ثروت کی خواہش ۲۔ عورت کی خواہش

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر دولت کے خواہشمند ہوتے تو کعبہ کی تولیت کا منصب حاصل کر نیکی کوشش کرتے جو ان کا خاندانی منصب تھا، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، رہا عورت کا معاملہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے نیک چلن و جوان نے اپنی عمر (۲۵ برس) سے پندرہ برس بڑی ایک بیوہ عورت

سے شادی کی اور جب تک وہ زندہ رہیں دوسری کوئی شادی نہ کی اور نہایت پیارا اور محبت سے سارا وقت گزارا۔ کیا اس کے بعد بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر شبہ کیا جاسکتا ہے؟  
انگلستان کے مشہور مورخ ایڈورڈ گبن کی نظر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفاء آپ کی صداقت کی ناقابل تردید دلیل ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ چاروں ابتدائی شریک کار، جو بعد میں نہایت کامیاب حکمران ثابت ہوئے اور انھوں نے دنیا کے بڑے حصے کو فتح کر ڈالا اور نہایت سادگی اور اخلاص کے ساتھ حکومت کی، پھر ایسی قابلیت کے لوگ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے ان لوگوں نے طرح طرح کی تکلیفیں سہیں اور گھر سے بے گھر ہوئے تو کیا ایک قریب کار شخص کی وجہ سے یہ لوگ ایسی تکلیفیں اٹھا سکتے تھے؟

گاؤ فرے (فقہہ ۱۲۳) میں لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ان متبعین میں جو دینی نشہ پیدا کیا وہ ایک پھیرے انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا، حضرت عیسیٰ کے ابتدائی پیرو عیسیٰ علیہ السلام کے سولی دیئے جانے کے بعد انہیں پھوڑ کر بھاگ گئے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ پیرو آخر وقت تک ان کے ارد گرد جے رہے اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام دشمنوں پر غالب کر دیا۔

مسٹر کارلائل انگلستان کے مشہور مصنف ہیں وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب (ہیر وڈ اینڈ ہیرٹ ورتھپ لکچر دوم ص ۱۲۳) پر لکھتے ہیں۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو پیغام دیا وہ بارہ سو برس سے قائم ہے اور آج اٹھارہ کروڑ انسان اس پر نہایت اعتقاد کے ساتھ قائم ہیں۔

تو کیا جس پیغام پر ہندو اتنی مخلوق اپنی زندگی بسر کر کے مر گئی اور آج بھی اتنی مخلوق اس پر قائم ہے، کیا وہ پیغام ایک بازیگر کا کہل تھا؟

سر سید احمد خاں نے اپنے خطبات میں اس پر ایک حاشیہ لکھا اور کہا کہ آج بھی مسلم حکومتوں

کے علاوہ جہاں اسلام کا سیاسی اقتدار نہیں ہے لاکھوں مسلمان بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی دھوکے کے پیغام محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر قائم ہیں کیا یہ اس پیغام کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے؟ یہ ہیں دنیا کے دانشوروں کے تاثرات

حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت عقل کو کبھی مطمئن کرتی ہے اور جذبات کو کبھی تسکین پہنچاتی ہے، عقل کی آنکھ سے دیکھو یا محبت کی آنکھ سے، ہر پہلو سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اپنے آپ کو روشن اور ثابت کر کے دکھاتی ہے۔

تمام رسول سچے ہیں، لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قوم کی ہدایت کے لئے رسول بھیجا گیا ہے۔ دَلِيلًا لِّكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولٌ (سورہ یونس: ۴۷) ————— ”ہر قوم کے لئے رسول آیا ہے“ ————— دوسری جگہ ارشاد گرامی ہے دَلِيلًا لِّكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (سورہ مد: ۲۴) ————— ”ہر قوم کے لئے ہادی آیا ہے“ ————— قرآن کریم نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ ہر رسول کی رسالت پر ایمان رکھا جائے اور رسولوں کے درمیان فرق نہ کیا جائے۔ لَا تَقْفُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ (سورہ بقرہ: ۲۸۵) ————— ”اہل ایمان یہ قرار کرتے ہیں کہ ہم خدا کے رسولوں کے درمیان امتیاز نہیں کرتے“ ————— اسی کے ساتھ قرآن کریم نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن میں تمام رسولوں کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ بعض کا ذکر کیا گیا اور بعض کا ذکر چھوڑ دیا گیا۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (سورہ مائدہ: ۷۵) ————— ”ان رسولوں میں سے کچھ کا ذکر تو ہم نے تمہیں سنا دیا ہے اور کچھ کا ذکر نہیں سنایا“ —————

قرآن کریم کی اس تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ خدا نے ہر قوم میں اور ہر دور میں رسول بھیجے اور یہ رسول اس خاص دور کے لئے اپنے ساتھ خاص دین لے کر تشریف لائے وہ دین اس خاص دور کے لئے کافی

حقتہ دوم

رہا اور اس دور کے لوگوں نے ان مذہبوں سے پوری پوری رہنمائی حاصل کی لیکن ان رسولوں کے بعد ایک آخری اور کامل رسول کی ضرورت باقی رہی جو ہمیشہ کے لئے پوری نوع انسانی کو قیامت تک ہدایت دیتا رہے، وہ ہدایت دائمی ہو، وہ کتاب مکمل ہو، وہ شریعت جامع ہو اور تاریخ پوری حفاظت کے ساتھ ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں میں پہنچا رہے، انقلابات زمانہ اس شریعت کے کسی جز کو خراب نہ کر سکیں کوئی دماغ اس میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔

بلاشبہ یہ خصوصیات خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں موجود ہیں آپ کی لائی ہوئی کتاب قرآن حکیم میں موجود ہیں، آپ کے اسوۂ حسنہ کے اندر موجود ہیں۔

رومیوں اور یونانیوں کے دور بالخصوص سکندر اعظم کی فتوحات سے تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے تاریخی عہد قرار دیا جاتا ہے، اس دور تاریخی کے لحاظ سے کئی مقدس رسولوں کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور تاریخ انہیں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ پیش کرتی ہے مگر اس حیثیت سے جو حیثیت ایک قومی رسول کی ہو سکتی ہے ایک عالمی رسول کی حیثیت سے تاریخ نے اگر کسی رسول کو محفوظ رکھا ہے تو وہ رسول رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

پچھلے رسولوں کی مانتے والی قومیں (یہود، نصاریٰ وغیرہ) جب اپنے مذہب اپنی کتاب اور اپنے نبی کے لئے یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کا مذہب بھی عالمی اور دائمی ہے اور انسانیت کے موجودہ ترقی یافتہ دور کے لئے بھی کافی ہے تو یہ دعویٰ بڑی الجھنیں پیدا کرتا ہے اور اہل علم اس دعویٰ کو تحقیق کی کسوٹی پر کٹاؤ کر دیتے ہیں اور اس سے پیشوایان دین میں تعابلی مطالعہ کی نوبت آجاتی ہے۔ اور اس طریقہ مطالعہ میں مذہبی پیشواؤں کے درمیان ادب و احترام قائم نہیں رہتا اس لئے

قرآن کریم کے نظریہ سے بہتر دوسرا کوئی نظریہ نہیں معلوم ہوتا کہ تمام مذہبی پیشواؤں اور تمام مذہبی کتابوں کو اپنے اپنے دور اور اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے صحیح اور برحق مانا جائے اور دائمی اور آخری آسمانی پیغام کے لئے قرآن کریم کو اور آخری نبی کے لئے رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ایمان و عقیدت کا مرکز بنایا جائے۔



کیوں کہ آپ ہی کی تعلیم اور آپ ہی کی عملی زندگی کو جامعیت، کمال اور مکمل تاریخی مخالفت حاصل ہے، ہندوستان کے مشہور قومی اور سیاسی رہنما گاندھی جی نے بڑی صاف گوئی سے کہا ہے

Simplicity is not the monopoly of Congressites  
I am not going to mention the names of Rama and  
Krishna because they were not historic personalities  
I am compelled to mention the names of (Hazrat)  
"ABU BAKAR" and (Hazrat) "UMAR". Though they  
were masters of Vast Empire, yet they lived the life  
of paupers (Harijan - dated 27 - 7 - 73)

جس کا ترجمہ یہ ہے: سادگی کا نگرانیوں ہی کا اجارہ نہیں ہیں رام چندر اور کرشن کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ وہ تاریخی  
شخصیات نہیں تھیں ہیں ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے پر مجبور ہوں، اگرچہ وہ بڑی وسیع ملکوتوں کے مالک تھے  
تاہم انھوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی (مہری جن مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۷۳ء)  
یہ آپ کے غلاموں اور آپ کے فیض یافتگان کے بارے میں اظہارِ عقیدت کیا جا رہا ہے۔  
پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کی کسی درجہ عقیدت کی مستحق ہے؟



# رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی مقام کی تشریح میں

افراط و تفریط کے دو نقطہٴ نظر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی اور سیاسی حکمرانی کے بارے میں افراط و تفریط کے دو انتہا پسندانہ خیال پائے جاتے ہیں۔

ایک گروہ کے نزدیک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی اور دعوتی جدوجہد کا مقصد سیاسی قوت حاصل کرنا تھا اور آپؐ نے اس مقصد کو ایک کامیاب اور مدبر سیاست دان کی طرح حاصل کیا دوسرے گروہ کے خیال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی کمالات، روحانیت، عبادت و ریاضت اور تعلیم و تزکیہ کے اعمال تھے اور سیاسی اقتدار خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام و اجر کے طور پر عطا ہوا تھا۔

پہلے گروہ نے اپنے نظریہ کی تائید میں قرآن کریم کی جو تفسیر کی ہے اس کا ایک نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

سورہ حدید کی آیت — وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ — کی تفسیر میں لکھتے ہیں — یہ آیت اپنے مفہوم میں بہت ہی صاف ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ دین کو اللہ تعالیٰ نے صرف اس لئے مرتب کیا ہے اور اس لئے انبیاء کرام کو بھیجا ہے اور کتابوں کو نازل کیا ہے کہ وہ اپنی تبلیغی جدوجہد سے سیاسی قوت فراہم کر کے دین کے نظام اجتماعی کو برپا کریں۔

(معاشی نامہ ہاریوں کا اسلامی علاج ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۹ء)

دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو، مولفہ القلوب کی تشریح میں لکھتے ہیں — تالیف قلب کے معنی میں ”دل کا موہنا“ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہو، یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر

مال سے ان کو توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہیں تو لوگوں کو مستقل وظیفہ یا  
 وقتی عطیے دے کر اسلام کے حامی و مددگار یا کم سے کم بے ضرر دشمن بنالیا جائے (تفہیم القرآن سورہ بقرہ)  
 دوسرے گروہ کے خیالات کا نمونہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی حسبِ ایل عبارت ہے  
 ”علامہ شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبیؐ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بادشاہ و سلطان کی  
 سوانح حیات ہے، کیونکہ اس میں بس یہ ذکر ہے کہ حضورؐ نے قریش کے مقابلہ میں تدبیر و تحمل کا کس طرح مظاہرہ  
 کیا، مدینہ والوں میں کس طرح اتفاق پیدا کیا، جنگِ بدر میں یوں انتظام کیا اور احد و خندق میں ایک  
 بھلا یہ نبی کی سیرت ہے، ہم نے مانا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلمؐ ایک سلطان بھی ہیں مگر آپؐ اقل  
 ہی میں پھر ملک میں محض بادشاہ ہونا آپؐ کا مخصوص کمال نہیں، بادشاہت تو کسری و ہر قتل کو بھی  
 نصیب تھی مگر وہ محض بادشاہ تھے اور حضورؐ نبی و ملک تھے نبوت و سلطنت کے جامع تھے، تو  
 سب سے پہلے آپؐ کی سیرت و تذکرہ میں کمالات نبوت کا ذکر ہونا چاہیے مگر آج کل اکثر سیرتوں  
 اس سے خالی ہیں۔ التبلیغ، ص ۶، مطبوعہ ادارہ تالیفات ادبیہ دیوبند

پہلے نقطہ نظر کے نتیجہ میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو  
 عام سیاسی مدیرین اور عام فوجی جرنیلوں کی صف میں گھرا کر دیا اور آپؐ کی طرف سیاسی مکر و فریب  
 اور فوجی تشدد کو بھی بلا تکلف منسوب کرنا شروع کر دیا اس کی تازہ مثال ”ہند نبوی کا تاریخی جائزہ“  
 کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین میں دیکھی جاسکتی ہے جو ڈاکٹر فاروق صاحب کی ضخیم قلم  
 کا نتیجہ ہیں اور ماہنامہ برہان میں ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئے ہیں اور اسی قسم کی تحریروں سے غیر مسلم  
 معاندین اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلمؐ نہ تو محدود مفہوم میں صرف ایک روحانی  
 پیشوا تھے اور نہ مردِ جبہ سیاسی اصطلاح میں ایک کامیاب سیاسی لیڈر اور فاتح حکمران بلکہ آپؐ ایک  
 کامل دینی رہنما اور آسمانی معلم اخلاق تھے، خدا کے آخری رسول اور رحمتہ للعالمین تھے۔

بلاشبہ آپؐ کا مقصد عرب کی سرزمین پر صرف سیاسی اقتدار حاصل کرنا نہیں تھا اور نہ صرف

اپنے آپ کو دنیا کا فاتح اعظم بنا کر عرب و عجم کے اقتدار کو اپنے قبضہ میں لیا تھا، مقصد آپ کا صرف یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی زمین پر انسانیت کو نجات اور سرفرازی حاصل ہو اور ظلم و تشدد کے دور کا خاتمہ ہو ۱۳ برس کامل مکہ کی زندگی میں آپ نے دنیا کو انہی اصولوں کی دعوت دی۔

آپ کے مخالفین نے اگر آپ پر الزام لگایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کا سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں، دولت چاہتے ہیں یا کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی \_\_\_\_\_ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں یہی ارشاد فرماتے ہیں :

مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ (سورہ ص ۸۶) \_\_\_\_\_

”میں تم سے کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں چاہتا اور میں یہ بات بناوٹ کے طور پر نہیں کہہ رہا۔“

مکہ کے سرداروں نے آپ کو کچھ دے لے کر راضی کرنا چاہا اور آپ کے سامنے سمجھوتہ کی پیشکش کی مگر آپ نے صاف انکار کر دیا، کیونکہ آپ سیاسی اقتدار کے حصول کی خاطر میدان اصلاح و دُور میں نہیں اترے تھے، آپ کا مقصد واضح اور آپ کی نیت صاف تھی کہ آپ دنیا میں توحید و اخلاق کی روشنی پھیلانا چاہتے تھے اور اس کے لئے خدا کی طرف سے مامور تھے۔

البتہ اسلام کی مکمل اصلاحی دعوت کا منطقی نتیجہ یہ نکلنے والا تھا کہ گمراہی تمام اسلحہ سے لیس ہو کر دعوت اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور اس کے لئے سردھڑکی بازی لگا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ابو جہل کی قیادت میں عرب کی جابر قوتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر آئیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش آنے والی صورت حال سے باخبر تھے، آپ اپنی سرکش اور ضدی قوم کے مزاج سے واقف تھے کہ ابو جہل اور ابو سفیان قریش کی قیادت سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہوں گے اور اس بناء پر وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور برتری کو تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ آپ کو ایسا ہی تجربہ ہوا اور ۱۳ سال کے بعد جب آپ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور قریش کے ہاتھوں اپنے آپ کو قتل ہونے سے بچایا تو قریش کے سردار تلوار لے کر مدینہ پر چڑھ آئے۔ اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے میدان جنگ میں مجبور ہو کر آنا پڑا۔





ان کی اشاعت اور بندگانِ خدا کے دلوں میں ان اصولوں کا اتارنا، داعی حق کا حقیقی منشاء ہوتا ہے۔ بنیوی اقتدار

کی خواہش اس کے دل میں اور دنیوی اقتدار حاصل کرنے کا نعرہ اس کی زبان پر نہیں ہوتا۔ اس لئے داعیانِ حق اپنے اعلیٰ اصولوں کو پھیلانے میں ادنیٰ درجہ کے جھوٹ، مکر و فریب، دھونس اور دھاندلی اور گھٹیا قسم کے سودے بازی اور ترغیبِ طمع سے کام نہیں لیتے، کیونکہ جن اصولوں کے لئے وہ کھڑے ہوتے ہیں انہی اصولوں کو وہ خود پامال کریں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور خدائے برتر دبرِ رگ اس دغلی کو کیسے گوارا کر سکتا ہے؟

اس کے برعکس سیاسی اقتدار کی تحریک میں اصل مقصد کسی پر قبضہ کرنا ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کو نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بار بار مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنی جدوجہد میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو سامنے رکھیں، دنیا کے مفادات کو پیشِ نظر نہ رکھیں، قرآنِ مسلمانوں کے سامنے آخرت کی سرفرازی اور آخرت کے عیش کو بار بار پیش کرتا ہے۔

غزوہٴ اُحد میں چند مسلمانوں نے مالِ غنیمت کی خاطر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نظر انداز کر دیا، اس پر قرآنِ کریم نے کس قدر فہائش کی۔

ادھر اسلامی جہاد کی تشریح میں گزر چکا ہے کہ دنیوی جاہ و حشمت اور مال و متاع کے تصور سے کس طرح جہاد کے مفہوم کو پاک کیا گیا ہے یہ سب اس لئے کہ اسلامی دعوت، اخلاق و توحید کے اعلیٰ اصولوں کو بندہٴ الہی سے تسلیم کر لے اور ان پر عمل کرنے کی دعوت ہے، تخت و تاج کے حصول کی جدوجہد نہیں۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کے دعوتی دور میں لوگوں سے ایمان لانے پر دنیوی اقتدار کا جو وعدہ کیا اور ان کے دل میں اس کا جو شوق پیدا کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے

اعلیٰ اصولوں پر چل کر مسلمانوں کی زندگی میں ہر قسم کی فکری، سماجی، معاشی اور معاشرتی غریباں اور بھلائیوں پیدا ہو جائیں گی اور ان کو زندگی کے ہر میدان میں عظمت و برتری حاصل ہو جائے گی۔

جو گمراہ طاقتیں آج برسرِ اقتدار ہیں یا وہ برحق اور غربت اسلام کے کامیاب اصولوں کو تسلیم کر لیں گی اور یا مسلمانوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہو جائیں گی اور پھر اس جنگ پیکار میں آخری غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔ ————— ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب سے کہا:

كَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ تَعْطُونِيهَا تَمْلِكُونَهَا الْعَرَبُ وَتَدِينُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمُ (ابن ہشام ج ۲ ص ۷۲) ————— ”یہ کلمہ وحدت ایک ایسا کلمہ ہے کہ اگر اسے تم لوگ قبول کر لو گے تو اس کے ذریعہ تمام عرب کو اپنے اقتدار میں لے آؤ گے اور تمام عجم اس کلمے کی وجہ سے تمہارے پیچھے چلے گا۔“ اس کے علاوہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا لوگوں کو سرزمین عرب پر سیاسی غلبہ کی خوشخبری سنائی اور ان سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم لوگ اسلام کے اعلیٰ اصولوں کو اپنالو گے تو تمہیں امن و امان اور خوشحالی کی زندگی ملے گی۔

اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ اس دور میں کفر و انکار کے اندر ڈوبی ہوئی قومیں جس طرح تباہ و برباد ہو رہی ہیں، عوام کو سیاسی حکمرانِ مظلوم و محکوم بنائے بیٹھے ہیں اور یہ سیاسی حکمران اپنی عیاشیوں اور بد اخلاقیوں کی بدولت ہلاکت کے کنارہ پر کھڑے ہیں، اسلام دونوں طبقوں کو اس سے نجات دلائے گا۔

اور دنیا ایک ایسے نئے ماحول میں پہنچ جائے گی جہاں امن و عافیت اور اخوت و انسانیت کا دور دورہ ہوگا۔

حاصل یہ کہ دعوتِ حق اور سیاسی تحریک کے درمیان واضح فرق موجود ہے۔ ————— اور یہ فرق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی میں قدم قدم پر نمایاں ہوتا ہے، آپ نے نازک سے نازک سیاسی اور عربی موقع پر جھوٹ بول کر کام نکالنے، دغا و فریب دے کر دشمن کو قتل کرنے، کسی عورت اور بچے اور مذہبی پیشوا کو ہلاک کرتے، امن پسند مخالفین کے اوپر چڑھ دوڑنے کی قطعاً

اجازت نہیں دیتے بلکہ ہر قدم پر انسانی محبت، خیر خواہی، صدق و دیانت، عفو و کرم کے اسلامی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے رفقاء سے پابندی کراتے ہیں۔

سیاسی تحریک کا یہ مزاج نہیں ہوتا، سیاسی لیڈر ہر قیمت پر ہر حربہ سے ظلم سے، جبر سے دھوکہ سے اور لالچ سے دشمنوں پر فتح حاصل کرنے اور سیاسی اقتدار پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتا ہے وہ سیاسی لیڈر ایک رسول دینی کی طرح بلند اخلاق پاک و امن اور پاک باطن نہیں ہوتا۔

حضرت خدیجہ کا تدبیر؟

## قومی لیڈر اور رسول میں فرق

حضرت خدیجہ بڑی عقل مند خاتون تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور حب آپ نے پہلی وحی کے نزول کی کیفیت اپنی رفیقہ حیات سے آکر بیان کی تو آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے آپ کے پانچ اخلاقی اوصاف بیان کئے اور بتایا کہ جس انسان میں یہ خوبیاں موجود ہوتی ہیں اس پر کسی بھوت پریت کا اثر نہیں ہو سکتا، آپ کے پاس آنے والا اس عجیب غریب شان سے کوئی گندی سستی نہیں ہو سکتی۔ ان پانچ صفتوں میں سے آخری صفت یہ تھی۔

و تعین علیٰ نواصب الحق (بخاری بدوالوحی) ————— ”اور آپ مدد کرتے ہیں آسمانی

مصائب پر لوگوں کی“

”مصائب حق“ کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی مصائب اچانک حادثے، جن میں لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں، ان میں آپ لوگوں کے کام آتے ہیں ”حق“ کے لفظ نے خدا کے رسول کو ایک قومی لیڈر سے ممتاز اور الگ کر دیا۔ قومی لیڈر یا خاندانی سردار تو اپنی قوم اور اپنے خاندان کا ہر معاملہ میں ساتھ دیتا ہے، بیمار اور کھانسی کا مر لیں آئے تو اسے ہسپتال لے جاتا ہے اور چوری اور ڈکیتی کا مجرم آئے تو اس کے ساتھ سفارش کے لئے پولیس چوکی میں چلا جاتا ہے



کیونکہ قومی لیڈر تو اپنی پارٹی کا ساتھ دیتا ہے، حق میں بھی اور ناحق میں بھی۔ خواہ برے آدمیوں کی حوصلہ افزائی سے علاقہ کے اور ملک کے عوام کو کتنی ہی تکلیف پہنچے۔ آج ہمارے ملک میں قومی لیڈر ابتری پھیلی ہوئی ہے، اس کی ذمہ داری اسی جہودی نظام پر ہے جس میں ہر چور رڈاکو اور بد معاش کی حمایت کے لئے لیڈروں کے فون کھڑکئے لگتے ہیں، لیکن ایک نبی و رسول اور ایک حق پرست حق و ناحق کو دیکھتا ہے، اپنے اور پرانے کو نہیں دیکھتا۔

حضرت خدیجہ کبریٰؓ کے قول میں یہی اشارہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک حق پرست ہیں، قوم پرست یا وطن پرست نہیں ہیں کوئی شخص جائزہ مصیبت لے کہ آتا ہے آپ اس کی مدد کرتے ہیں اور غلط کام میں کسی قسم کا تعاون نہیں کرتے بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبوت سے پہلے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر حق پرستی کی یہ نشاں پیدا ہو گئی تھی، آپ کی فطرت کو خدا تعالیٰ نے اسی سانچہ میں ڈھالا تھا۔

پھر آگے چل کر اسلام نے جس بے لاگ عدل و انصاف کا حکم دیا، اس میں بھی یہی تعلیم دی گئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ وہ بے لاگ عدل و انصاف بہت جلد پورے معاشرے میں نافذ اور برپا ہو گیا۔

### مال غنیمت سے دل چسپی پر مواخذہ:

یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کرام کے اندر مال غنیمت سے دلچسپی پیدا نہ ہونے دی، تاکہ مسلمانوں میں یہ ذہن نشو و نما نہ پائے کہ تحت و تاج اور مال و دولت کے لئے تلوار اٹھاؤ اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنا لو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذہن کو سختی سے روکا اور جہاد کے معاملات پر ہر پہلو سے کڑی نگاہ رکھی، احادیث میں آتا ہے کہ غزوہ خیبر میں ایک صحابی کی وفات ہو گئی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز جنازہ پڑھنے کی درخواست دی، آپ نے فرمایا: صلوا علی صاحبکم۔ اس کی نماز خود پڑھ لو۔ صحابہ کرام گھبرا گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ سے کیوں انکار کر دیا۔

فتخیرت وجوه الناس لذلك فقال ان صاحبکم غلّ فی سبیل اللہ ففتشنا متاعہ فوجدنا خرزاً من خرز یهود لا یساوی درہمین۔۔۔۔۔ ”صحابہ کے چہرے بدل گئے، آپؐ نے فرمایا، تمہارے اس ساتھی نے مال غنیمت میں خیانت کی تھی، صحابہ کرام نے یہ سن کر اس اپنے ساتھی کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں ایک معمولی ہار نکلا جو کسی یہودی کا تھا اور وہ دو درہم کی قیمت کا بھی نہ تھا۔“

اسی طرح ایک واقعہ آپؐ کے خادم خاص حضرت بدعہ کا ہے، ایک غزوہ میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کے کجاوہ اتار رہے تھے کہ ان پر کسی دشمن کا تیرا کر لگا اور یہ شہید ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ کے منہ سے نکلا۔۔۔۔۔ هَنِیْئًا لِّهٖ الْجَنَّةُ۔۔۔۔۔ ”اے جنت مبارک ہو“ آپؐ نے فرمایا:۔۔۔۔۔ کَلَّا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بَیْدهٖ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِیْ اَخَذَهَا یَوْمَ خِیْبَرٍ مِنْ الْمَقَاتِمِ لَمْ تَصِبْهَا الْمَقَاتِمُ لَتَشْتَغِلْ عَلَیْہِ نَارًا۔۔۔۔۔ ”ہرگز نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، انھوں نے خیر کے دن جو چادر لی تھی، غنیمت تقسیم ہونے سے پہلے، وہ چادر ان پر آگ بن کر بھڑکے گی۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بدعہ کے متعلق جو شدید تنبیہ فرمائی، اسے ایک صحابیؓ نے گھبرا اٹھے اور دوڑے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور جوتی کا ایک تسمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کر دیا، آپؐ نے فرمایا:۔۔۔۔۔ شَرَاکُ مِنَ النَّارِ۔۔۔۔۔ ”یہ ایک تسمہ بھی آگ بن جاتا۔“

خلیفہ دوم حضرت فاروق اعظمؓ نے صحابہ کرامؓ میں اعلان کرادیا تھا:۔۔۔۔۔ اِذَا وَجِدَ الرَّجُلُ قَدْ غَلَّ فَاَحْرِقْ اَمْتَاہُ اضْرِبْ۔۔۔۔۔ ”جب تم کسی شخص کو مال غنیمت میں خیانت کرتے پاؤ تو اس کا سامان جلا دو اور اسے مارو۔“

ادپر کی احادیث مستند محدثین نے روایت کی ہیں اور ان کے پیش کرنے کا منشا صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلام میں جہاد تخت و تاج اور دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ فتنہ و فساد کی

سرکوبی کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

ان واقعات سے حضرات صحابہؓ کی شان میں کسی قسم کی بدگمانی کو راہ نہ دی جائے، مہاجر کرام دنیا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اخلاق اور پاک طینت جماعت تھی، البتہ وہ حضرات بشر تھے اور کبھی کبھی بشری کمزوری انھیں گھیر لیتی تھی اور اللہ تعالیٰ ان کی عظیم نیکیوں کی وجہ سے ان کی معمولی کمزوریوں کو معاف فرما دیتا تھا۔

ایک صحابی کی انسانی اور بشری کمزوری پر ہی خدا تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا تھا۔  
 اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْهَبْنَ السَّيِّئَاتِ ذٰلِكَ ذِكْرُى لِلَّذِيْنَ اٰكْرٰهُنَّ (سورہ ہود: ۱۱۴)  
 "بیشک بڑی نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے۔"

یہ حضرات صحابہؓ ہی تھے جن کے حق میں بلا کسی استثناء کے حق تعالیٰ نے فرمایا تھا:  
 اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ هُمْ فَضَّلَا۟مِنَ اللّٰهِ وَنِعْمَ۟ ط (سورہ ہجرات: ۸)۔  
 "یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں خدا کے فضل و احسان سے۔"

## رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی

اور قدیم مؤرخین اسلام

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال وصفی نے "محمد اور بنی اسرائیل" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مسلمان اہم قلم نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسہ آپ کی نرمی، ہمدردی اور شفقت پر بہت کچھ لکھا ہے اور کثرت سے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی از دلچِ مطہرات، اپنے عزیزوں، اپنے رفیقوں اور اپنی اولاد کے ساتھ کس قدر پیار اور محبت کا برتاؤ کیا ہے۔ لیکن ان اربابِ قلم نے اس عنوان پر بہت کم توجہ دی۔

سرکوبی کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

ان واقعات سے حضرات صحابہؓ کی شان میں کسی قسم کی بدگمانی کو راہ نہ دی جائے، صحابہ کرامؓ دنیا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اخلاق اور پاک طینت جماعت تھی، البتہ وہ حضرات بشر تھے اور کبھی کبھی بشری کمزوری انھیں گھیر لیتی تھی اور اللہ تعالیٰ ان کی عظیم نیکیوں کی وجہ سے ان کی معمولی کمزوریوں کو معاف فرما دیتا تھا۔

ایک صحابی کی انسانی اور بشری کمزوری پر ہی خدا تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا تھا۔  
 اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْهَبْنَ السَّيِّئَاتِ ذٰلِكَ ذِكْرُیْ لِلَّذِیْنَ اٰکَرٰہُ (سورہ ہود: ۱۱۴)  
 "بیشک بڑی نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے۔"

یہ حضرات صحابہؓ ہی تھے جن کے حق میں بلا کسی استثناء کے حق تعالیٰ نے فرمایا تھا:  
 اُولٰٓئِکَ هُمُ الرَّاشِدُونَ هُمْ فَضَّلَاۤمِنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃٌ (سورہ حجرات: ۸)۔  
 "یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں خدا کے فضل و احسان سے۔"

## رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی

اور قدیم مؤرخین اسلام

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال وصفی نے "محمد اور نبی اسرائیل" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مسلمان اہم قلم نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ آپ کی نرمی، ہمدردی اور شفقت پر بہت کچھ لکھا ہے اور کثرت سے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات، اپنے عزیزوں، اپنے رفیقوں اور اپنی اولاد کے ساتھ کس قدر پیار اور محبت کا برتاؤ کیا ہے۔ لیکن ان اربابِ قلم نے اس عنوان پر بہت کم توجہ دی۔



کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کا کس تدبیر اور مضبوطی کے ساتھ سامنا کیا ہے، اور آپؐ نے اپنے سخت ترین مخالفوں کے مقابلہ میں شدید سے شدید سیاسی حالات کے اندر کمزور اور ناتواں مسلمانوں کو کس طرح ایک سیاسی قوت بنا کر کھڑا کر دیا؟

اور اس ساری جدوجہد میں ایک طرف آپؐ کے ہاتھ سے اخلاق کریمانہ اور انسانی محبت کا دامن نہیں چھوٹا اور دوسری طرف اپنے امریت پسند اور خونخوار مزاج رکھنے والے دشمنوں کو ہر سیاسی اور فوجی میدان میں شکست دے کر عرب کی سرزمین پر ایک حکومتِ عادلہ کی بنیاد رکھ دی۔ اور یہ اخلاقی اور سیاسی کمالات۔۔۔ اور متضاد اور متباہین صلاحیتیں عرب کے ایک بدوی اور اُتھ کے اندر جمع ہوئیں، اگر قسطنطنیہ، انطاکیہ، اسکندریہ اور روم جیسے متمدن اور مہذب ملکوں میں اس طرح کا انسان کامل پیدا ہوتا تو زیادہ تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن ایسا کامل انسان اگر پیدا ہوا تو حجاز کی اس سرزمین پر جو اس وقت کے لحاظ سے تہذیب و تمدن کی روشنی سے محروم تھی۔

یہ اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ وہ انسان کامل خدا کی طرف سے کھڑا کیا گیا، اور اس نے جو کچھ کیا وہ خدا کی تائید سے کیا اپنی طرف سے کچھ نہ کیا۔ — دان اجتماع الرفاۃ الشدیدۃ والین والرحمة مع العزم والشدة والقوة فی شخصہ صلی اللہ علیہ وسلم دلیل کمالہ الانسانی قال کمال فی التوسط بین النفاۃ مع علاج المواقف بما یناسبہا؛

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خالص روحانی آدمی تھے اور دنیا داری کے معاملات سے آپؐ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ — یہ جہل یا تجاہل ہے۔ خدا تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانِ کامل کہا ہے جس میں روحانی اور سیاسی دونوں قوتیں جمع تھیں اور دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات کا مکمل علم و ادراک آپؐ کے اندر ودیعت کیا گیا تھا۔

میں نے اس مسئلہ میں غیر جانب دار غیر مسلم مورخین کی طرف رجوع کیا تو میں نے دیکھا کہ ان مورخین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے اہم ترین سیاسی رہنماؤں میں جگہ دی ہے، کیونکہ ان لوگوں نے دنیا کے جدید سیاسی حالات کی روشنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی کارناموں کا تجزیہ کیا اور آپ کی سیاسی سرگرمیوں کے شاندار نتائج دیکھے تب وہ مجبور ہوئے کہ آپ کو رجالِ سیاست میں بلند ترین مقام دیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مصنف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ”معاہدہ مدینہ“ پر یہ لکھا ہے کہ یہ معاہدہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ایک بہت بڑا سیاسی انعام تھا۔ یعنی آپ نے ہجرت کے بعد مدینہ کے یہود اور مسلمانوں کے درمیان اپنی سربراہی میں جو ”دفاعی معاہدہ“ مرتب کیا وہ آپ کی بہترین سیاسی صلاحیت اور سیاسی فیادت کی دلیل ہے اور خدا کی طرف سے آپ کے لئے بہترین سیاسی تحفہ ہے۔

ہمارے قدیم مورخین جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان عظیم سیاسی کارناموں اور سیاسی فتوحات پر پہنچتے ہیں تو وہاں پہنچ کر اس اعتراف پر بات ختم کر دیتے ہیں کہ آپ پر وحی الہی نازل ہوئی تھی اور آپ کا ہر قدم خدا کی ہدایت کے مطابق اُٹھتا تھا اور وحی الہی آپ کو ہر قسم کی غرضوں سے محفوظ رکھتی تھی۔ اس کے بعد یہ حضرات اس دور کے سیاسی تعاملوں اور ان کے مطابق حضور کے کامیاب اقدامات پر غور و فکر کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ان مورخین قدیم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقدامات و ہدایات کو ”سیاست شرعی“ کا نام دیا ہے اور وہ حضرات اسے ”فقہ“ کے عام مسائل کی طرح بیان کر دیتے ہیں اور علمِ سیاست کے مسلمہ اصولوں پر اس دور کے سیاسی معاملات کو منطبق کر کے یہ نہیں دکھاتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کامیاب تدبیر کے ساتھ ان شدید حالات میں ”خلافتِ اسلامیہ“ کی بنیاد رکھ دی اور بے سرد سامانِ مسلمانوں کو ایک با اقتدار سیاسی قوت بنا کر کھڑا کر دیا۔

ان قدیم مورخین میں شیخ ابو الحسن ماوردی، ابو یعلیٰ الفراء، شیخ الاسلام ابن تیمیہ علامہ ابن قیم جوزیہ اور ابن قتیبہ وغیرہ ہیں۔

ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست پر کچھ لکھا ہے مگر بہت اختصار کے ساتھ اور اس میں بھی یہ حضرات اپنے دور کے تقاضوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں سیاسی آراء پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح بعض اصحابِ اخبار نے افغانی اور امال، عقد الفرید اور صبح الاعشی میں بعض سیاسی لطائف بیان کئے ہیں اور بعض عرب فلسفیوں نے بھی اس دور کی سیاست کے بعض گوشوں پر بحث کی ہے لیکن اس دور کی سیاست پر جس اہتمام اور تدبیر کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت تھی وہ کہیں موجود نہیں ہے۔

(محمد و بنو اسرائیل مطبوعہ مصر ص ۶)

ڈاکٹر صاحب موصوف اور دنیا ئے عرب کے دوسرے جدید مورخین نے اس موضوع پر توجہ دی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی کارناموں پر جدید علمِ سیاست کے اصولوں کی روشنی میں قلم اُٹھایا ہے۔

ادھر کے مقدمہ میں اس مصری عالم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور ”دجی الہی“ کے جس تعلق پر اختصار کے ساتھ چند جملے لکھے ہیں، یہ عنوان بہت تفصیل چاہتا ہے۔  
مطالب یہ ہے کہ اصولاً یہ حقیقت قابلِ تسلیم ہے کہ ہر نبی کے کمالات کا حقیقی سرچشمہ ”دجی الہی“ اور علمِ آسمانی ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ تفصیل ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ سیاسی اور تمدنی معاملات میں دجی آسمانی کی طرف سے ہر سرکل و جزو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کا ہمیں کچھ علم نہیں ہے، جن معاملات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ اس معاملہ میں خدا کی طرف سے مجھے یہ ہدایت ملی، ان کے سوا جس قدر سیاسی اقدامات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوئے وہ بظاہر آپ کے سیاسی تدبیر اور بے خطا اجتہاد و بصیرت کے ذریعہ ہوئے۔

محققین اسلام میں حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حُجَّۃُ اللہ الْبَاقِیَہ میں اس مسئلہ کو واضح کر دیا ہے کہ سیاست و معاشرت کے جزئیات اور تقاضے زمان و مکان کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں، اس لئے وحی الہی نے اس طرح کے معاملات میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ الرائے مسلمانوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخشی ہے (حُجَّۃُ اللہ ص ۸۶) زندگی کے اس (اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی) میدان میں شریعت نے چند اصول مقرر کر دیئے ہیں، جن کے دائرے میں رہ کر ہر مسلمان کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، رہنے بہنے اور صلح و جنگ کے طریقوں میں آزاد ہے۔

اس تشریح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی معاملات میں جو کامیاب اقدامات فرمائے ان میں آپ کے سیاسی تدبیر اور فوجی حوصلہ مندی و شجاعت کو بھی بڑا دخل ہے، خدا کی توفیق کے ساتھ ساتھ ہر قدم پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت سیاسی تدبیر، حوصلہ اور شجاعت اور مضبوط رائے اور اٹل قوت فیصلہ نے حالات کو نبایا اور سردار اور آپ کو تاریخِ عالم میں ایک بہترین مدیر اور سیاسی قائد کے مقام پر پہنچا دیا۔

اس موقع پر یہ بات بھی صاف کر دینی ضرور ہے کہ بعض جدید اہل قلم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی تدبیر اور دفاعی اقدامات کی بہترین صلاحیت کو دیکھ کر آپ کے لئے ”سیاسی مدبر“ اور ”بہترین سپہ سالار“ قسم کے خطاب اور عنوان اختیار کرتے ہیں، اس پر تنبیہ کرتے ہوئے مصر کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر احمد محمد الحنفی نے اپنی کتاب الجہاد میں لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجودہ سیاسی خطابات استعمال کرنا مناسب نہیں، خدا تعالیٰ نے آپ کے لئے ”الرسول“ اور ”النبی“ کا جو خطاب استعمال کیا ہے وہی خطاب آپ کی مکمل صلاحیتوں اور مکمل کمالات کے اظہار کے لئے کافی ہے۔





# رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن،

توحید و اخلاق کی دعوت

مکی اور مدنی زندگی میں فرق :

مکی زندگی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کی مطلوبہ زندگی تھی، اس زندگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر معمولی اخلاقی طاقت کا مظاہرہ کیا، اخلاق و شرافت، علم و صبر، خدمت و احسان کے یہ ۱۳ سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی کے بے مثال کارناموں کے سال تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کمزوری اور بے سروسامانی کے دور میں اخلاق و شرافت کا برتاؤ کیا کیوں کہ ایک کمزور کے لئے زور اور مخالفوں کے ساتھ شرافت اور احسان کے رویہ کے سوا دوسرا کوئی رویہ ممکن نہیں ہوتا، کمزور انسان اگر زور و مقابلہ پر اتر آتا ہے تو مخالفوں کے ہاتھ سے نقصان اٹھاتا ہے، کمزور آدمی کو زور و آؤ کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے، اسی وجہ سے ان مخالفین کے نزدیک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں اس راستہ کو بطور ایک وقتی پالیسی کے اختیار کیا — لیکن انصاف پسند تاریخ داں جب یہ دیکھتے ہیں کہ مدنی زندگی میں داخل ہو کر مکہ کا کمزور اور مظلوم سیاسی قوت کا مالک بن جاتا ہے اور اس قوت و شوکت کے باوجود دشمنوں کے ساتھ اس کے اخلاق، شرافت اور صبر و احسان کا معاملہ پہلے سے زیادہ رحم و کرم کا جوش لے کر نمودار ہوتا ہے وہ طاقت ہاتھ میں لے کر بھی جب کل زور آور دشمنوں کو اپنے سامنے مغلوب و مفتوح پاتا ہے تو اس کے جذبہ شرافت میں کمی نہیں آتی، وہ کل کے جور و ظلم کو یاد کر کے انتقام پر نہیں اترتا، بلکہ ظالموں اور حملہ آوروں پر غفور و کریم اور رحمت و احسان کی بارش شروع کر دیتا ہے — تو مکہ کے اس مظلوم کو مدینہ کی تاجدار کی دور میں بھی شرافت و رحمت کا مجسمہ دیکھ کر یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی رحمتہ للعالمین ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مکہ میں ایک وقتی پالیسی کا نتیجہ

نہ تھے بلکہ اخلاق و شرافت آپ کا حقیقی مشن تھا، جو کمزوری اور طاقت دونوں حالتوں میں یکساں طور پر جاری رہا۔

مکی زندگی کا دور مسلمانوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ جب کوئی گروہ مخالفوں کے ساتھ پورے خلوص اور سچائی سے \_\_\_\_\_ نہ کہ عیاری اور وقت گزاری کی نیت سے \_\_\_\_\_ اعلیٰ اخلاق کا برتاؤ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اس با اخلاق اور شرافت پسند گروہ کو سرفرازی اور سرلمبزی عطا کر دیتا ہے، ان نیکی پسند صبر کرنے والوں کے لئے ظاہری اور باطنی طور پر ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں اخلاقی قوت کے ساتھ ساتھ مادی قوت بھی آجاتی ہے اور پھر خدا تعالیٰ اس مادی اور سیاسی قوت کے دور میں اس ایمان والے گروہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس سیاسی قوت کو غرور و تکبر اور نفسانی عیش و آرام کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ اس مادی طاقت کو اپنے اخلاقی مشن کی اشاعت اور دنیا کے ہر کونہ سے بدی اور شیطنت کی قوتوں کو ختم کرنے کے لئے کام میں لائے۔

حاصل یہ کہ اعلیٰ اخلاق، اعلیٰ شرافت، خدمت اور صلح و سلامتی اسلام کا مستقل مشن ہے، امن و سلامتی اسلام کی مستقل پالیسی ہے، خدمت اور شرافت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل اسوۂ حسنہ ہے، جسے ہر حال میں \_\_\_\_\_ مغلوبیت کا دور ہو یا غلبہ کا \_\_\_\_\_ محکومی کا دور ہو یا فرمانروائی کا \_\_\_\_\_ امت مسلمہ کو اختیار کرنا چاہئے۔

اب اس سوال کو پھر دہرائیے گا \_\_\_\_\_ مسلمان جب کسی مقام پر کمزور ہوں مغلوب اور مقہور ہوں تو وہاں اپنی قومی عزت کو اور اپنی دینی عظمت کو کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں؟ سیاسی طاقت سے جہاں مسلمان محروم ہو جائیں وہاں اس سیاسی طاقت کی کمی کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اس سوال کا جواب دیتی ہے کہ \_\_\_\_\_ اس دور میں اخلاقی طاقت پیدا کر کے اس کے ذریعہ سیاسی کمزوری کی تلافی کی جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ایسی اخلاقی طاقت جو سیاسی طاقت کا مکمل بدل اور قائم مقام بن سکے صرف ایک نبی و رسول کے پاس ہو سکتی ہے۔ یا پھر اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست جانشینوں اور فیض یافتگان کو حاصل ہو سکتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سیاسی کمزوری کے دور میں اخلاقی کردار بنانے پر پورا زور صرف نہ کرے اور سیاسی قوت سے محروم ہو جانے کے بعد گڑھوں میں اپنے آپ کو دھکیل دے۔

اسلام کہتا ہے، مایوسی کفر ہے، امت کو ہر حال میں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے اجتماعی اور قومی کردار میں اخلاق و روحانیت کا جہاں پیدا ہو جائے اور اس جہاں کے ذریعہ وہ سیاسی قوت سے محرومی کے دور میں اپنے مذہب کی عظمت کو قائم رکھنے کا فرض ادا کرے۔

اقبال مرحوم ایسے ہی حالات کے لئے مسلمانوں سے کہہ گئے ہیں۔

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

اسی شانِ جمالی سے کمزور امت کو اپنے مذہبی وجود کی حفاظت کرنی چاہیے۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء نے مکی زندگی میں اسی شانِ جمالی اور اخلاقی قوت سے کام لیا اور آنے والوں کے لئے اسی راہ کی پیروی ضروری قرار دی گئی۔ ابھی اسی شانِ جمالی سے کمزور امت کو اپنے مذہبی وجود کی حفاظت کرنی چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس وقت اپنے بھائیوں کے سامنے اپنے یوسف ہونے کا اعلان کیا اور صورتِ حال کے چہرے سے نقاب الٹی تو ارشاد فرمایا:۔

قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (سورہ یوسف)

”یوسف بولے میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے بے شک خدا تعالیٰ نے ہم سب پر احسان فرمایا، بلاشبہ جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا“

حضرت یوسفؑ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہم سب پر جو احسان فرمایا، مجھے غلامی سے

بادشاہت کے مقام پر پہنچا یا اور تم سب میرے خاندان والے میرے پاس زندہ و سلامت آگئے اور میرے بوڑھے باپ کی آرزو پوری ہو گئی، یہ حیرت انگیز ترقی اور غیر معمولی انعام و اکرام ہر اُس شخص کے پاس ہو سکتا ہے جو تقویٰ اور صبر کی راہ اختیار کرتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ حسن عمل سے آراستہ بندوں کی محنت کو برباد نہیں ہونے دیتا۔

خدائی انعام و اکرام کے لئے جو قدرت کا عام قانون ہے قرآنِ کریم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وَالَّذِينَ يَجَاهِدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (سورہ عنکبوت)

”جو لوگ ہماری ہدایت کے مطابق کوشش کرتے ہیں ہم ان پر کامیابی کے راستے

کھول دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

قرآن نے اعلان کیا کہ خدا کی رحمت اور اس کے انعام و اکرام کا راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے

بندے جب جدوجہد کرتے ہیں خدا تعالیٰ انہیں اپنے فضل و احسان سے نوازتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفقاء پر ان کے درجہ کے مطابق انعام و احسان ہوتا ہے اور

ان کے بعد نیک عمل کرنے والے مسلمانوں پر ان کے درجہ کے مطابق خدا کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

سورہ روم میں فرمایا۔ \_\_\_\_\_ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ \_\_\_\_\_ ”اور ہم پر

حق ہے مدد کرنا اہل ایمان کی۔“

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل ۳۱ برس جس بے مثال اخلاقی قوت کا مظاہر کیا، خدا

تعالیٰ کی طرف سے اس پر انعام و اکرام نازل ہوا اور مدینہ منورہ آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سیاسی طاقت بھی آگئی۔

یہ اخلاقی اور سیاسی طاقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے پیروں

شعراء کے ہر ایک ایک جہ جمع رہی اور امت کا نمائندہ طبقہ اپنے نبی کے اخلاقی جمال اور سیاسی

جمال دونوں کا مکمل نمونہ بنا رہا۔ \_\_\_\_\_ اور یہ عہد چالیس سال تک رہا۔



اس کے بعد اخلاقی طاقت پر زوال آنا شروع ہو گیا، البتہ سیاسی طاقت اپنے عروج پر قائم رہی۔ مسلمانوں کی سیاسی طاقت کے دور میں اخلاقی طاقت کے انہادی نمونے ادیا حق اور مصلحین امت کی شکل میں نمودار ہوتے رہے اور ان کے ذریعہ دنیا کے کونہ کونہ میں اسلام پھیلتا رہا ہے۔

ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب ”پریسچنگ آف اسلام“ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کے ہر کونہ میں اور ہر دور میں اسلام کے ان اخلاقی نمونوں نے غیر مسلم حلقوں میں اسلام کی روشنی بھیدائی اور اقبال مرحوم کو کہنا پڑا ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے پاسیاں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اب ذیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اخلاق کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ یہ بات صاف ہو جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حالت میں اور ہر میدان میں داعی حق، معلم اخلاق اور تجدید و آخرت کے مبلغ تھے اور مسلمانوں کے لئے بھی اسی اسوہ حسنہ کی پیروی ضروری ہے۔

## عفر کی طرف سے نکالنے کی دھمکی اور حضرات انبیاء کا جواب

قرآن کریم بتاتا ہے کہ باطل طاقتوں نے ہمیشہ داعیان حق اور مصلحین اخلاق کو وطن سے نکالنے کی دھمکی دی ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلرُّسُلِ هُمْ لَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ اَرْضِنَا اَوْ لَنَعُوْدَنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِيْنَ ۝ وَلَنُسَكِّنَنَّكُمْ اِلْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ بِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ ذٰلِكَ وَعِٰدِيْهِ ۝ (سورہ ابراہیم: ۱۳، ۱۴)

”کفر کی طاقتوں نے رسولوں کو دھمکی دی کہ ہم تمہیں وطن سے نکال دیں گے، یا تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ، اس پر ہم نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں اس سرزمین میں بسا دیں گے مگر یہ ان کے لئے ہو گا جو میری حاضری سے ڈریں گے،

اور میری وعیدوں سے۔۔۔۔۔ کفر کی دھمکی کے جواب میں حضرات نبیاء کرام نے کیا کہا؟

- ۱۔ زبانی بات چیت کی حد تک کیا جواب دیا؟
- ۲۔ باطل قوتوں کی عملی دست درازی کے بعد کیا کیا؟
- ۳۔ خدا تعالیٰ نے اپنی غیبی امداد کے لئے کیا شرط رکھی؟

ان تینوں سوالوں کا جواب قرآن کریم نے دیا ہے

دھمکی کا زبانی جواب:

کفر کی دھمکی کا زبانی جواب کیا دیا گیا؟۔۔۔۔۔ اس کے لیے قرآن کریم نے حضرت

شعیب علیہ السلام کا رویہ پیش کیا:

قَالَ الْمَلَأَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَنَعُودَنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ۚ قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنَّ عِدَّتَنَا فِيْ مِلَّتِهِمْ بِئِدَاءُ اللَّهِ مِنْهُمْ وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيْهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۚ

اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے کہ اے شعیب! ہم تجھے اور تیرے ساتھی ایمان والوں کو وطن سے نکال دیں گے یا تم لوگ ہمارے دین میں واپس آ جاؤ، شعیب نے کہا، خواہ ہم اے کتنا ہی پسند کرتے ہیں؟ مگر اس صورت میں ہم اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے والے ہو گے، اگر نجات پانے کے بعد ہم دین باطل میں لوٹ جائیں گے اور ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم لوٹیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ چاہے ہمارے رب کا علم وسیع ہے، ہم اسی پر توکل کرتے ہیں، اے خدا ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے حق کے ساتھ اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔“

قرآن کریم نے حضرت شعیب کا جو جواب نقل کیا ہے اس میں چند باتیں واضح کی گئی ہیں: ایک بات یہ واضح کی گئی ہے کہ حضرت شعیب نے اس دھمکی اور دھونس کے جواب میں کوئی ناشائستہ

بات منہ سے نہیں نکالی، آپؐ نے کوئی بد اخلاقی نہیں کی، بلکہ نہایت اعلیٰ اخلاق اور تواضع و بندگی کے ساتھ جواب دیا۔

شعیبؑ نے کہا، ہمارے لئے لوٹنا ممکن نہیں مگر اللہ چاہے — یہ استثناء بظاہر بالکل بے جوڑ ہے، اللہ تعالیٰ کسی رسول کے حق میں خاص طور پر یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ ایمان کے بعد کفر میں لوٹ جائے اور مرتد ہو جائے، معاذ اللہ، لیکن اس کے باوجود حضرت شعیبؑ اللہ کی مشیت سے ڈر رہے ہیں، یہ دراصل تواضع اور بندگی کی بات ہے۔ شعیبؑ اس نازک معاملہ میں خدا کو سچ میں ڈال رہے ہیں، خدا کو متوجہ کر رہے ہیں کہ اے خدا! معاملہ میری ذات کا نہیں بلکہ تیرے دین اور تیرے پیغام کی عزت کا ہے۔

پھر شعیبؑ علیہ السلام صراحت کے ساتھ خدا پر توکل کر رہے ہیں اور خدا سے بہتر فیصلہ کی دُعا کر رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت شعیبؑ نے کفر کی دھمکی کے جواب میں ایک بلند اخلاق انسان کا رول اختیار کیا، جوش اور اشتعال کا گھٹیا راستہ اختیار نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے

ابراہیمؑ کے باپ آذر نے خلیل اللہ کو گھر سے نکالنے کی دھمکی دی اور کہا:

لَسِنَّةُ نَارٍ تَلْتَمِہُ رَاٰ جِہَّتَكَ وَ اَهْجُرِّيْ مِلِّيَّہٗ قَالَ سَلٰمْ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّہٗ كَانَ فِیْ حَفِیَّہٗ (سورہ مریم: ۴۶، ۴۷) ————— ”(آذر بولا) اے ابراہیم!

اگر تو باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگ سار کر دیں گے اور تو نکل جا ایک مدت کے لئے، ابراہیمؑ نے فرمایا: تم پر سلامتی ہو میں تمہارے لئے دعا و مغفرت کروں گا، میرا پروردگار میرے ساتھ بڑا مہربان ہے۔ ابراہیمؑ علیہ السلام گھر سے نکل رہے ہیں، نہ کوئی خفگی ہے۔ نہ ظالم باپ کی شان میں

گستاخی ہے، بلکہ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ ہے، سلام ہے، دعا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے حاشیہ (قرآن مجید) میں لکھا ہے:

"یہ رخصت کا سلام ہے، معلوم ہوا کہ اگر دین کی بات سے ماں باپ ناخوش ہوں اور ان سے نکالنے لگیں تو بیاباں بیاباں میٹھی کہہ کر نکل جائے وہ بیاباں نہیں" (سورہ مریم)،  
 آزر نے بھی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ماتا کی رعایت کی ہے، یہ نہیں کہا کہ تمہارے لئے نکل جا، بلکہ یہ کہا کہ ایک مدت کے لئے نکل جا۔

آخر باپ کی ماتا کیسے ہمیشہ کے لئے بیٹے کو جُدا کرنے پر رضا مند ہو جاتی، حضرت ابراہیمؑ کی سلامتی کی دعا میں یہ راز بھی پوشیدہ ہے کہ خلیل اللہ نے اپنے گھر والوں پر عذاب الہی کے نازل کو روکا، کیونکہ سنت اللہ کے مطابق ابراہیمؑ جیسے حق پرست کو نکالنے کے بعد نکالنے والوں پر ہلاکت کے آنے کا قوی امکان تھا۔



## مدینہ منورہ میں اسلام

اب اس امر پر غور کرو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی کہاں سے اور کیسے شروع ہوئی؟ اور آپ کو مخالفین اسلام نے کس طرح مجبور کیا کہ آپ اپنا بیڑہ من چھوڑیں اور اس راہ میں قدرت الہی نے آپ کی کتنی مدد فرمائی اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ سیاسی بصیرت نے کس طرح راہ کی مشعلات پر قابو حاصل کیا؟

مکہ اور مدینہ میں فرق:

مکہ معظمہ کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۳ برس پیغام حق کی دعوت دی، اس دعوت میں آپ کو وہاں کے حالات کے مطابق بھرپور کامیابی حاصل ہوئی، دعوت و تبلیغ کا اثر انہی طبیعتوں پر پڑتا ہے جن میں منہ اور مہٹ دھرمی نہیں ہوتی اور سچی بات کو قبول کرنے کی سادہ رکتی ہیں اس لحاظ سے آپ کے وعظ و نصیحت کے اس دور کو کامیاب ہی کہا جاسکتا ہے، ناکام نہیں کہا جاسکتا، الجہاد کے مؤلف نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

”لیکن وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعی اسلام نے ہاتھ میں تلوار اٹھائی“

مودودی صاحب کے ان الفاظ سے ہر شخص اتفاق نہیں کر سکتا آپ نے وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد تلوار نہیں اٹھائی بلکہ صلاحیت رکھنے والی طبیعتوں کو وعظ و نصیحت سے اپنی طرف کھینچ لینے کے بعد جب صرف بقدری اور مہٹ دھرم لوگ رہ گئے اور وہ کسی طرح ظلم و تشدد سے باز آنے کے لئے تیار نہ ہوئے تو پھر آپ ان کے مظالم کو رد کرنے کے لئے تلوار اٹھانے پر مجبور ہوئے۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ کے اندر جتنے قلیل عرصہ اور تھوڑی مدت میں اشاعت اسلام کے اندر کامیابی حاصل ہوئی اتنی مکہ معظمہ کے اندر حاصل نہیں ہوئی۔

مدینہ منورہ کے چند مہینے اور چند روز مکہ معظمہ کے ۳ سال سے آگے نظر آتے ہیں۔  
 اس کا سبب یہ تھا کہ مکہ معظمہ میں قریش کی قیادت کے تحت مکہ کی آبادی متحدہ اور منظم تھی  
 اور تمام قبائل کے درمیان معاہداتی اتحاد قائم تھا، اس لئے کون اس بات کی جرأت کر سکتا  
 تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر کے تمام مکہ کو اپنا مخالف بنالے۔  
 چنانچہ جو صاحبِ مہمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کر کے سمان ہوئے انہیں نام  
 مکہ کی دشمنی مول لیتی پڑی۔

مکہ کے مقابلہ میں مدینہ منورہ کے سیاسی حالات بالکل دوسرے تھے یہاں تین گروہ آباد  
 تھے، ایک طرف یہودی تھے دوسری طرف انصار، یعنی اوس و خزرج۔۔۔۔۔ ان دونوں  
 گروہوں میں اقتدار کی جنگ چلتی تھی، یہود اہل کتاب تھے اور ایک مذہبی نظام اپنے پاس  
 رکھتے تھے، انصار کے پاس کوئی مذہبی نظام نہ تھا اور اس کمی کو وہ برابر محسوس کرتے تھے، پھر یہ  
 انصار (اوس و خزرج) خود بھی آپس میں لڑتے تھے اور اس آپس کی لڑائی کی وجہ سے ان میں  
 کمزوری پیدا ہو گئی تھی ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اوس و خزرج ضرورت محسوس کرتے ہو گئے  
 کہ دونوں قبیلے متحد ہو کر یہود کے مذہبی غرور اور اقتصادی استحصال سے نجات حاصل کریں  
 مگر مشکل یہ ہو گئی کہ ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کی قیادت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا ہوگا  
 البتہ ان دونوں کے لئے یہ بات آسان ہو سکتی تھی کہ باہر کی تیسری قیادت کے تحت یہ اپنے آپ کو  
 مضبوط کریں اور پھر انہیں یہود کے غلبہ سے چھٹکارا حاصل ہو۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور قدرت نے ان کے سامنے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نجات دہندہ  
 بنا کر کھڑا کر دیا۔۔۔۔۔ یہ تمام عالم کے لئے نجات دہندہ تھا، تمام عرب کے لئے عظمت و شرف  
 کا نشان تھا، مگر بد قسمت قریش نے ۳ سال تک اس کا پیغام سنا اور اس کے شہر مکہ کی اجتماعی  
 فساد و سرکشی پر تلی رہی اور یہ ضدی لوگ ایک ہی رٹ لگاتے رہے کہ نہیں نہیں  
 منظور نہیں۔۔۔۔۔ مگر نجات و فلاح کا یہی پیغام جب مدینہ منورہ پہنچا تو اس گلِ وحدت کی نگہت

کے پہلے ہی جھوٹکے نے مدینہ کی روح کو سرست دے خود کر دیا اور اس نورانی بستی نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آغوش میں لے لیا اور کل کا یثرب ——— آج کا مدینہ النبی ——— بنی صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ——— بن گیا۔

یوں تو سب سے پہلے یثرب کے دو نوجوان ایک سوید بن صامت اور دوسرا ایاس بن معاذ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے بہرہ اندوز ہوئے مگر یہ دونوں ہی بہت جلدی آپس کی جنگ میں مارے گئے اور اسلام کا پیغام ان کے ذریعہ سے مدینہ میں آگے نہ بڑھ سکا ہاں نبوت کے گیارہویں برس حج کے موقع پر قدرتِ خداوندی نے یثرب کے خوش بختوں کا باقاعدہ ہاتھ پکڑ لیا مدینہ منورہ میں پہلی دعوت:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال تک مکہ معظمہ میں ایک ایک گھر پہنچا کر موسمِ حج میں عکاظ اور منجۃ (مکہ کے بازاروں اور تہواروں) میں پہنچ کر دعوتِ حق دی اور فرمایا: **من یا دینی؟ من ینصرنی؟** حتیٰ ابدع رسالۃ ربی **ولہ الجنة**۔ کون مجھے پناہ دیتا ہے؟ کون میری مدد کرتا ہے؟ تاکہ میں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا سکوں اور اس کو حجت ملے۔ لیکن اس دس سالہ مدت میں مدینہ کے اوس خزر ج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں پڑے اور ان کے سامنے پیغامِ حق پیش کرنے کا موقع نہیں آیا، دس سال گزرنے کے بعد جب گیارہواں سال نبوت کا آیا تو اب خدا تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سر بلند کرنے کا ارادہ فرمایا اور چند خزر رجبی افراد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہو گئی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسبِ معمول حج کے موسم میں لوگوں سے ملتے جلتے پھر رہے تھے کہ چند آدمیوں پر آپ کی نظر پڑی اور آپ ان کے پاس پہنچے اور آپ نے ان کے سامنے اسلام کا پیغام رکھا، انھوں نے سنا اور سُن کر آپس میں کہنے لگے:

یا قوم تعلمون، واللہ انہ النبی الذی توعدکم بہ یہود فلا یسبقنکم

”اے ساتھیو! جان لو کہ یہ وہی نبی ہے جس کے متعلق یہود پیشین گوئی کرتے ہیں پس

کہیں وہ تم سے آگے نہ بڑھ جائیں“

یہ کہہ کر ان لوگوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

قوم بینہم من العداۃ والشر ما بینہم وعسی ان یجمع اللہ بک فسنقدم

علیہم فتدعوہم الی امرک وتقرن علیہم الذی اجیناک الیہ من ہذا الدین فان

یجمع اللہ علیک فلا رجل اعز منک (البیہ لابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۷)

”ہماری قوم میں آپس میں عداوت و شر پھیلا ہوا ہے، شاید اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ان کو متحد کر دے

ہم اپنی قوم کے پاس جائیں گے اور آپ کا پیغام انہیں سنائیں گے اور اپنے ذاتی تاثرات بھی

ان کے سامنے رکھیں گے جو اس دین کے بارے میں ہیں پس اگر نہ اتنے اس دین پر انہیں جمع کر دیا

تو پھر آپ سے زیادہ کوئی دوسرا عزت والا اور قوت والا کوئی نہ ہوگا“

یہ چھ آدمی تھے، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے اور مدینہ لوٹ گئے۔

ان کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جس دعوت حق میں قریش مکہ کو تفریق اور اختلاف

کا سامان نظر آرہا تھا، اسی پیغام میں مدینہ کے اس گروہ کو اتحاد اور قوت دکھائی دی اور انہوں

نے اس آئینہ میں اپنے روشن مستقبل کی ایک جھلک دیکھی۔

ظاہری اسباب کے لحاظ سے سیاسی اور اجتماعی حالات کی یہی وہ سازگاری تھی جو مدینہ منورہ

کی فضا میں اسلام کو حاصل ہوئی اور جب یہ چھ آدمی مدینہ واپس گئے اور اس وغر ج کے سامنے

اسلام اور ہدئی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہد رکھا تو بغیر کسی شدید رد و کد کے مدینہ میں دعوت

اسلام پھیلتی شروع ہو گئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں اسلام کے پیغام کی اشاعت کے لئے فضا کو سازگار

بنانے میں یہود کے ایک اعتقاد میں نعرے نے بڑا کام کیا، یہ لوگ مدینہ کے بت پرستوں اور



خزرج سے یہ کہا کرتے تھے کہ بہت جلد ایک نبی آنے والا ہے، جس کی رہنمائی میں ہم لوگ تم پر غلبہ حاصل کر لیں گے ظاہر ہے کہ اس نبی کی آمد کا مدنیہ کے گھر گھر میں چرچا ہوگا، تب ہی تو یہ ہوا کہ جیسے ہی ان کے کانوں میں ایک نبی کی آواز پہنچی تو انھوں نے اس کو تسلیم کرنے میں پہل کی اور بدقسمت یہود پیچھے رہ گئے۔

### بیعت عقبہ اولیٰ :

ایک سال تک مدنیہ منورہ میں ان چھ بزرگوں کے ذریعہ اسلام کی روشنی پہنچی لیکن یہ روشنی محدود رہی، اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال حج کے موسم میں بارہ آدمیوں کا ایک قافلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے اسلام قبول کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال دعوت کے کام کو اور آگے بڑھایا اور دواغیانِ حق (عبداللہ بن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر) کو اس قافلہ کے ہمراہ مدنیہ بھیجا تاکہ یہ حضرات وہاں بیٹھ کر تعلیم و دعوت کا کام کریں۔ اس وفد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر بیعت لی وہ انفرادی نیکیوں سے متعلق تھی اس وفد نے واپس جا کر اور ان کے ساتھ دواغیانِ حق نے مدنیہ میں کام شروع کیا اور اب مدنیہ کے بڑے لوگوں میں اسلام کی روشنی پہنچی اور دعوتِ اسلام کا کام کافی آگے بڑھا۔ اسلام قبول کرنے والے سرداروں میں اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ جیسے صاحبِ اثر لوگ شامل تھے، جن کے مسلمان ہوجانے سے مدنیہ میں اسلام سورج کی روشنی کی طرح پھیلنے لگا۔

جابر بن عبداللہ مدنیہ میں اسلام پھیلنے کی تیز رفتاری کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ایک شخص گھر سے نکلتا تھا، باہر آکر وہ قرآنِ کریم سنتا اور اس کی روح بے خود ہوجاتی اور وہ اسلام قبول کر لیتا، پھر وہ اپنے گھر لوٹتا اور سارے گھر والے اسلام قبول کر لیتے اس طرح چند ہی دن میں گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا اور کوئی گھرایا نہ رہا جس میں اسلام قبول کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد نہ ہو (ابن ہشام جلد ۲، ص ۴۳۵)

## بیعتِ عقبہ ثانیہ :

نبوت کے تیرہویں سال پھر مدینہ کے باشندہ لوگوں کا ایک وفد حج ہی کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور اسلام قبول کرنے کی درخواست کی اور آپ نے اسے قبول فرمایا اور یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

دو سال کی مدت میں مدینہ منورہ میں اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں اور اب مدینہ اپنے آپ کو دعوتِ حق کا مرکز بنانے کے لئے تیار تھا۔ مدینہ میں دعوتِ حق کی رفتار اور اس کے اثرات پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گہری نظر تھی اور آپ حالات سے واقف تھے چنانچہ آپ نے دیکھا کہ اس وفد نے مجھے مدینہ چلنے کی دعوت دی ہے اور خدا تعالیٰ اب کہ منظر کے نگار تاریک ماحول سے اسلام کو نکال کر مدینہ منورہ کی سازگار فضا میں لے جانا چاہتا ہے تو آپ نے اس وفد سے کھل کر بات چیت کی۔

اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بھی آپ کے ساتھ تھے یہی تک باقاعدہ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن ان کے دل میں اپنے بھتیجے رسولِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں تھی، انھوں نے وفدِ مدینہ سے صاف صاف کہا۔

اے خزانہ کے لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان میں سب سے زیادہ عزت والے ہیں مگر کہ جو لوگ ان پر ایمان لا چکے ہیں وہ تو ان کی حمایت کرتے ہیں، لیکن جو لوگ ایمان نہیں لائے ہیں وہ خاندانی تعلق کی وجہ سے ان کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں۔

تم نے انھیں ساتھ لے جانے کی دعوت دی ہے مگر سمجھ لو! اگر تم میں سارے عرب سے دشمنی مول لینے اور مقابلہ کرنے کی طاقت ہے تب انھیں ہجرت کی دعوت دو۔

وفد میں سے مختلف لوگوں نے ہر ممکن مدد کرنے کا یقین دلایا اور اس کا اقرار کیا کہ ہم اس عہد و پیمان کے انجام کو اچھی طرح سمجھ کر آپ سے وعدہ کر رہے ہیں کہ آپ کی ہر طرح امانت کریں گے۔ ————— ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ داعی حضرت مصعبؓ آپ کے سامنے مدینہ

میں اسلام کی اشاعت کے حالات رکھ چکے تھے اور ایک سال کی رپورٹ آپ کو سنا چکے تھے۔ ان حالات میں آپ نے محسوس کیا کہ خدائے برحق نے مدینہ کی سرزمین کو اسلام کے حق میں سازگار بنا دیا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس وفد کی ”دعوتِ ہجرت“ کو منظور کیا جائے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وفد سے اجتماعیت اور مرکزیت کی پابندی کرنے کا عہد و پیمان لیا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری جلد ۱ ص ۴۱ پر اس مسئلہ کی وضاحت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء سے ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بیعت لیتے تھے اور عہد و میثاق کی تجدید اور تاکید فرماتے تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے عقیدہ ثانیہ کی بیعت کے متعلق لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دور اندیش مدبر کی طرح مدینہ کے اس وفد سے عہد و پیمان لیا اور ہجرت کے بعد قریش مکہ کے ساتھ جولبی آویزش ہونے والی تھی اس کو نظر میں رکھ کر ان لوگوں سے سمبشیت امیر کے ہر حال میں فربہ داری اور اطاعت کا اقرار لیا۔

پہلی بیعت میں صرف انفرادی اخلاقی پابندی کا عہد لیا تھا کہ ہم چوری، بدکاری، قتل و غارت، بہان تراشی نہیں کریں گے اور اس مرتبہ یہ اقرار کیا کہ ہم تنگی ترشی، آرام و راحت اور ہر ہرے بھلے وقت میں آپ کی اطاعت پر قائم رہیں گے اور ہم حق کی راہ میں کسی ملامت کو نیوالے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، اور جس طرح اپنی جان، مال اور بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے تیار رہیں گے (محمد و نبوہ اسرائیل ص ۳۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وفد کو نہ صرف مرکزیت کی پابندی اور حفاظت کے لئے تیار کیا بلکہ عملی طور پر اجتماعی نظم کی بنیاد بھی رکھ دی اور اس وفد میں سے ۱۲ آدمیوں کو ”نقیب“ مقرر کیا گیا کہ تم لوگ مسلمانانِ مدینہ کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کرو۔ یہ بارہ نقیب گو یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب تھے۔

# ہجرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اہل مکہ شرب میں اسلام کی روشنی پھیلنے اور اسلامی دعوت کے لئے ایک نئے مرکز کے قیام کی خبروں سے، ظاہر ہے کہ سخت پریشیاں ہوئے ہوں گے۔ انھوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ اگر مدینہ میں دعوتِ حق کے قدم جم جائیں گے تو اسلام کا پیغام ایک زندہ قوت بن جائے گا اور پھر اس کے بعد سرزمینِ مکہ بھی زیادہ دیر تک اس پیغامِ حق کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں لائے گی۔ مدینہ میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے قدم جم جانے سے قریشِ مکہ کے سامنے یہ خطرہ بھی یقیناً آیا ہوگا کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گذرتی ہے اس لئے مدینہ کا نیا اسلامی مرکز اس شاہراہ کی ناکہ بندی کر کے ہم قریش کو مخالفانہ سرگرمیوں سے باز رکھنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، قریش مکہ شرب والوں کا تو کیا بگاڑ سکتے تھے انھوں نے مسلمانوں پر اور زیادہ ظلم و ستم شروع کر دیا۔

واقعات اپنی قدرتی رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، قریش مکہ کے ظلم و ستم سے مجبور مسلمانوں کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرکز کی طرف روانہ فرماتے رہے، قریش ان مظلوموں کو روکنے مگر مسلمان اپنے آقا کے حکم پر مدینہ کی جانب ہجرت کرتے سے باز نہیں آتے۔

اُدھر مہاجرین کی تعداد جوں جوں بڑھتی جاتی، دعوتِ حق کا قافلہ طاقتور ہوتا جاتا اور اسلام کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔

اب مکہ میں صرف سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چند رفیق باقی رہ گئے۔

اللہ کے رسول کو آخر وقت تک پیغمبرانہ استقلال کا مظاہرہ کرنا تھا، اتمامِ حجت میں جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے پورا کرنا تھا، چنانچہ مشیتِ الہی کے رازدار مشیتِ الہی کے کھیل کو تکمیل



بہمنیپانے کے لئے اس وقت تک مکہ میں رہے جس وقت تک اہل مکہ نے آپ کے قتل کا فیصلہ نہ کیا۔

سورہ مریم میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی نازل ہو چکا تھا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّيْطٰنَ عَلٰی الْكَافِرِيْنَ تَوَدُّهُمْ اِذَا هُمْ لَا تَفْعَلْ عَلَيْهِمْ اِنَّمَا نَقَدُّ لَهُمْ مَعَدًّا (مریم: ۸۴، ۸۵) ————— "کیا تم نے غور نہیں کیا کہ ہم شیطانوں کو

منکر دن پر چھوڑتے ہیں، وہ انھیں بھڑکاتے ہیں خرب، پس تم ان کے لئے جلد بازی سے کام نہ لو

ہم ان راقی طرح شمار کر رہے ہیں۔"

شیاطین منکروں کو خوب بھڑکا چلے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل حق نے صبر و استقلال کا ثبوت بھی بہم پہنچا دیا، خدا تعالیٰ نے مظلوموں کے صبر اور ظالموں کے ظلم کی گنتی بھی پوری کر لی اور ظلم اپنی آخری سرکشی پر اتر آیا اور داعی حق کو قتل کرنے کا فیصلہ لے لیا گیا۔

کچھ ہو رہے گا عشق و محبت میں بھی امتیاز

آیا ہے اب مزاج تیرا امتحان پر

بس جس رات داعی حق کو قتل کرنے کا فیصلہ ہوا خدا تعالیٰ نے اسی رات اپنے محبوب کو مکہ منظر

سے ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔

دعوتِ حق کی اس منزل پر بھی تقدیر اور تدبیر دونوں ساتھ کام کر رہی تھیں، خدا کی غیبی سنہائی

بھی تھی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی تدبیر بھی تھا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک رفیقِ خاص حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیا اور دوسرے رفیقِ خاص حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کی ہدایت فرمائی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی یہ منزل نہایت تدبیر، احتیاط اور ہر قسم کی مکمل تیاری کے ساتھ طے فرمائی۔ ————— امام بخاری نے باب البجۃ میں اس واقعہ کی جو مستند روایات

نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ ادھر قریش نے آپ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا، ادھر خدا تعالیٰ کی طرف سے

ہجرت کرنے کا حکم ملا۔

حصہ دوم

حکم الہی پاکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے، دوپہر کا وقت تھا، دھوپ سے بچنے کے لئے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر کپڑا ڈال رکھا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے بے وقت گرمی کی شدت میں تشریف لے جانے کی وجہ پوچھی، آپ نے فرمایا مجھے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے، صدیق اکبر نے عرض کیا، یہاں صرف آپ کی حرم (عائشہ رضی اللہ عنہا) کے سوا کوئی نہیں، پھر فرمایا، مجھے ہجرت کی اجازت ہوگئی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میرے ماں باپ قربان ہوں کیا مجھے بھی رفاقت کا شرف حاصل ہوگا؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں! — سفر کی تیاری کچھ پہلے سے تھی۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دو اونٹنیاں اسی مقصد کے لئے پال رکھی تھیں، باقی انتظام ہی وقت کیا گیا۔ — صدیق اکبر کے گھر والوں نے اس انتظام میں بھرپور حصہ لیا۔

ابو بکر صدیق کو اطلاع دے کہ سرکارِ دولت خانہ پر واپس تشریف لائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے ارادہ سے آگاہ فرمایا اور انھیں ہدایت فرمائی، تم میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جانا۔ — اور میرے بعد لوگوں کی امانتیں واپس کر دینا۔

یہ انتظام اس لئے کیا گیا، تاکہ قریش مکہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چلے جانے کا جلدی غم نہ ہو اور وہ کچھ دیر معطلہ میں رہیں یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق سفر کے ساتھ قریش مکہ کے پنجہِ ظلم سے نکل جائیں۔ دوسرا سبب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ والوں کی جو امانتیں رکھی ہوئی تھیں، وہ امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ واپس کر دیں اور ان نازک حالات میں بھی کسی شخص کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

تجوذ کے مطابق قریش کے سوراؤں نے کاشانہ نبوت کا محاصرہ کر لیا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے کسی حصہ میں گھر سے نکلے، قدرت نے اُن پر غفلت طاری کر دی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آنکھوں میں دھول بھونک کر ان کے نرغہ سے صاف نکل گئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور میں پہنچے اور وہاں پناہ گزیں ہو گئے، یہ غار مکہ سے تین میل دہشتی جانب ہے اور مدینہ کی سمت سے مختلف

یہ غار ایک میل بلند چوٹی پر ہے جس کا راستہ آج بھی بید پر خطر ہے اور اس پر چڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس غار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن قیام فرمایا، اس مدت میں کھانے پینے کا سامان اور مکہ کی خبریں پہنچانے کا کام حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ ان کے غلام عامر بن فہیہ اور ان کی صاحب زادی حضرت اسماءؓ انجام دیتی تھیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی اندازہ تھا کہ ان کے دشمن نہایت چالاک اور ہوشیار ہیں، اس لئے آپؐ نے نہایت دانش مندی سے مدینہ کے راستے سے ہٹ کر انتہائی پر خطر مقام غار ثور میں پناہ لی، مگر اس کے باوجود قریش کے قیادہ شناسوں نے نشانات قدم کی مدد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پناہ کی کھوج لگالی اور غار ثور کے دہانے پر پہنچ گئے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک پیغمبر کا حوصلہ اور ایک رسول کا عزم و استقلال رکھتے تھے، مگر صدیق اکبرؓ کو وہ مقام کہاں حاصل تھا؛ صدیق اکبرؓ قریش کے آدمیوں کے قدموں کی آہٹ سُن کر گھبرا گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر نہایت صبر و سکون کے ساتھ فرمایا:۔۔۔۔۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔۔۔۔۔ "غم نہ کرو خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔"

قریش کے خبر رساں غار کے دہانے پر کھڑے تھے، مگر قدرت الہی نے ان کی سمجھ کو ماؤف کر دیا تھا، یہ لوگ یہ تو کہتے رہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق یہاں تک آئے ہیں، مگر سمجھنے آگے کام نہیں کیا اور غار کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔

ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے غار پر کچھ ایسے انتظامات کر دیئے گئے ہوں کہ انھیں ان دونوں حضرات کے غار میں داخل ہونے کا یقین نہ ہوا ہو، جیسا کہ بعض مؤرخین نے مکاری کے جالے اور کبوتر کے گھونسلے کی روایات نقل کی ہیں۔

مگر ان ظاہری انتظامات کے علاوہ بھی ممکن تھا کہ دشمنوں نے غار کے منہ پر پہنچ کر ہمت ہار دی ہو اور ان کی عقلیں وہاں جا کر گم ہو گئی ہوں، کیونکہ نصرت الہی اپنے ان مسافروں کی حفاظت کے لئے ان کے ہمراہ تھی، دیکھو! اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کتنا یقین افزہ و جلد فرما رہے

تھے \_\_\_\_\_ ما ظنک باثنين، الله ثالثهما \_\_\_\_\_ ”ابو بکر رضی اللہ عنہما“  
 کے بارے میں کیا خیال ہے جن میں تمسیر ”اللہ“ ہے“

بہر حال چوتھے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار سے نکلے اور غیر مسلم عبد اللہ بن ارقیط کو راستہ بتانے کے لئے ساتھ لیا، یہ شخص راستہ کا ماہر تھا اور بھروسہ کا آدمی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجرت پر رکھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کمزور ارادہ کے انسان کی طرح عبد اللہ کے بارے میں بدگمانی نہیں فرمائی، آپ عربوں کے کیرکڑ سے واقف تھے کہ یہ لوگ جب کسی بات کا عہد کر لیتے ہیں تو اس پر قائم رہتے ہیں، اعتماد کو مجروح نہیں کرتے۔

آپ کی اسی حقیقت پسندی نے رہنمائی کے لئے ایک اہل انسان کو اپنے ساتھ لیا، اور یہ بدگمانی نہ کی کہ کہیں یہ شخص اپنے ہم مذہب قریش مکہ سے ہماری جاسوسی نہ کر دے۔  
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چالاک دشمنوں کے نتیجہ ظلم سے بچنے کے لئے کس قدر تدبیر، ہوشیاری اور ظاہری اسباب کے مکمل انتظام کے ساتھ ہجرت فرمائی، صرف غیبی امداد کا انتظار نہیں فرمایا، اگرچہ قدم قدم پر غیبی نصرت بھی ساتھ رہی، مگر آپ نے اپنی طرف سے تدبیر ظاہری میں کوئی کمی نہیں فرمائی۔



## ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں تقریریں

مکہ معظمہ چھوڑ کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ کی نئی بستی میں تشریف لائے تو آپ نے دلوں کے باشندوں کے سامنے چند تقریریں فرمائیں۔

ان تقریروں کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے، جن لوگوں نے ظلم و ستم کر کے دطن سے نکالا تھا، ان کے خلاف ایک لفظ آپ کی زبان پر نہیں آتا، ظالموں کے ظلم کی شکایت نہیں کی جاتی، غم و غصہ کا اظہار نہیں ہوتا، ستم پیشہ قریش کے خلاف اشتعال انگیزی نہیں کی جاتی۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت اگر سیاسی فتوحات اور فوجی اقدامات ہوتے تو آپ کی تقریروں کا رنگ دوسرا ہوتا، آپ مدینہ میں آتے ہی قریش مکہ کے خلاف فضا ہموار کرنے شروع کر دیتے، مدینہ کے عوام کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا شوق دلاتے اور مکہ معظمہ کو فتح کرنے کی ترغیب دیتے، لیکن آپ کی ان تقریروں میں سیاسی رنگ کے بجائے آپ کے مشن (دعوت الی اللہ) کا پورا پورا رنگ نظر آتا ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قبا کی بستی میں چند روز قیام فرمایا، پھر جمعہ کے دن قبا سے روانہ ہوئے اور بنی سالم بن عوف کے قبیلہ کے میدان (وادی رانواناؤ) میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۱۲)

ان مقامات پر آپ نے جو تقریریں فرمائیں مورخین نے اُن کو جمع کیا ہے دو تقریریں بنی اسحاق نے نقل کی ہیں۔ ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

ایہا الناس۔ (اے لوگو) خوب سمجھ لو۔ کچھ پہلے سے بھیج دو جو خود تمہارے کام آئے گا۔ خدا کی قسم! یقیناً ایسا ہوگا کہ ہر شخص پر (قیامت کی) بے ہوشی طاری ہوگی (جس کے پاس جو کچھ ہے یہیں رہ جائے گا) بکریوں والا بکریاں چھوڑ جائے گا اُن

کا کوئی گلہ بان نہ ہوگا۔ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوگا یقیناً ایسا ہوگا کہ اس کا پروردگار براہِ راست اس سے خطاب فرمائے گا، نہ کوئی نیچ میں ترجمان ہوگا نہ کوئی رکاوٹ کی چیز درمیان میں حائل ہوگی (جو اس کے لئے آڑ بن سکے) اُس کا پروردگار کہے گا۔ کیا میرے رسول نے تمہارے پاس پہنچ کر تبلیغ نہیں کی تھی! کیا یہ تمام باتیں تمہیں نہیں بتادی تھیں۔ کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا۔ کیا تیرے اوپر میں نے اپنا فضل نہیں کیا تھا۔ پس بتا تو خود اپنے لئے کیا لے کر آیا ہے۔ یہ شخص اپنے دائیں دیکھے گا اپنے بائیں دیکھے گا، اس کی دودھ کا کہیں نام و نشان نہ ہوگا۔ وہ آگے کی طرف نظر ڈالے گا۔ وہاں دہکتی ہوئی جہنم کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پس دیکھو دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ جو کچھ امکان میں ہو خرچ کرو اور اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔

کچھ نہ ہو چھوڑے گا ایک ریزہ نہ ہو وہی خرچ کر و جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ میٹھے بول اچھی بات سے غریبوں کی دل داری کرے۔ اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔ نیکی کا ثواب دس گئے سے شروع ہوتا ہے اور سات سو گئے تک پہنچتا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۱۲)

بے شک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کی شرارت سے اور اپنے اعمال بد کے شر سے خدا کی پناہ لیتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے راستے کھول دے، پھر کوئی اس کو گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو جھٹکا دے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی سا بھی نہیں ہے بے شک سب سے

اچھا کلام کتاب اللہ ہے۔ یقیناً وہ شخص کا میاب ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو سجادے اور جس کو اللہ تعالیٰ کفر سے ہٹا کر اسلام میں داخل کر دے یقیناً وہ شخص کا میاب ہے، جس نے انسانوں کے کلام اور اُن کے قصوں کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو منتخب کیا ہو۔ کیونکہ کلام اللہ ہی سب سے بہتر بات ہے سب سے بہتر کلام اور سب سے بلیغ قصہ ہے۔

(دیکھو) اس سے محبت کرو، جو اللہ سے محبت کرتا ہے (دیکھو) خدا سے محبت کرو دل کی گہرائی سے اپنے دلوں کو اسی میں لگا دو۔ اللہ کے کلام اور اللہ کے ذکر سے نہ اکاؤ۔ تمہارے دلوں میں یہ سختی ہرگز نہ ہو کہ تم اس کی یاد سے غافل ہو جاؤ (یا د رکھو اور سمجھ لو) اللہ تعالیٰ جو مخلوق پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کر کے اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے جو اعمال اس کو پسند ہیں جن بندوں کو وہ پسند کرتا ہے جو بات اس کو پسند ہے۔ اُس نے نام لے کر ان کو بتا دیا ہے اور معین کر دیا ہے (تم بھی اس کو پسند کرو) اُس نے حلال و حرام کو کھول کر بتا دیا ہے، بس اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ گردانو۔ پورا پورا تقویٰ کرو۔ تمہاری زبان جو باتیں نکلتی ہیں ان میں یہ خونی پیدا کرو کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہو۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی رُوح (ذاتِ اقدس محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم) تمہارے درمیان ہے، اُس سے پوری پوری محبت کرو۔ تمہاری فطرت اپنے رب سے ایک عہد کئے ہوئے ہے (کہ رب وہی ہے اُس کے سوا کوئی رب نہیں ہے) اس عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے کہ اُس عہدِ پیمان کو توڑا جائے جو فطرتِ انسان اپنے رب سے کئے ہوئے ہے

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۰)



## مدنیہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعہ

حافظ عماد الدین بن کثیر رحمۃ اللہ نے ابن جریر کے حوالے سے وہ پورا خطبہ نقل کیا ہے جو اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی سالم بن عمرو بن عوف میں نماز جمعہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اس خطبہ کو تیرا پورا نقل کرتے ہیں اس کے بعد ترجمہ و مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ہے ائمہ صاحبان جمعہ کے روزیہ خطبہ پڑھیں تو نور علی نور و سعادت بالاسعادت کا مصداق ہو۔

### خطبۃ التقویٰ

(الْحَمْدُ لِلّٰهِ) أَحْمَدُهُ وَأَسْتَعِينُهُ وَأَسْتَغْفِرُهُ وَأَسْتَهْدِيهِ وَأُوْمِنُ بِهِ  
وَلَا أَكْفُرُ. واعادی من یکفره واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک  
له وان محمد اعبده ورسوله ارسله بالهدی والنور والمرعظۃ علی  
فترة من الرسل وقلۃ من العلم وضلالۃ من الناس وانقطاع من  
الزمان ونوم من الساعۃ وقرب من الاجل من یطع الله ورسوله  
فقد رشد ومن یضمرها فقد غوی وقروط ضللا لا بعیدا. وادعیکم  
بتقوی الله فانه خیر ما اوصی به المسلم المسلم ان یحضره علی الاخرۃ  
وان یأمره بتقوی الله فاحذر واما حذرکم الله من نفسه ولا  
افضل من ذلك نسیحۃ ولا افضل من ذلك ذکری وان تقوی الله  
لمن عمل به علی رجلٍ ومخافۃ من ربه عون صدق علی ما یبتغون من  
امر الاخرۃ ومن یصلح الذی بینہ و بین الله من امرہ فی السر والعلانیۃ  
لا ینوی بذلك الا وجه الله یکُن له ذکراً فی عاجل امر او ذخراً فیما  
بعد الموت حین یفتقر المرء الی ما قدم وما کان من سوی ذلك یود لو ان  
بینہ و بنیۃ امداً بعیداً. - ویحذرکم الله نفسه والله رؤف بالعباد و



الذی صدق قوله وانجز وعده لا خلف لذلک فانه یقول عزوجل  
ما یبدل القول لادی وما انا بظلام للعبیر فاتقوا الله فی عاجل  
امرکم وَاَجَلِه فی السر والعلانیة فانه من یتق الله یشرعنه سبیلہ  
وینظم له اجرًا ومن یتق الله فقد فاز فوزًا عظیمًا وان عدنا تقوی الله ترق  
مقتہ ویرقی عقوبتہ ویرقی سخطہ وان تقوی الله یببض الوجه  
ویرضی الریت ویرفع الدرجۃ - خذوا بحکمکم ولا تفرطوا فی جنب الله  
قد علمکم الله کتابہ ونهی بکم سبیلہ لیعلم الذین صدقوا ویعلم  
الکاذبین فاحسنوا کما احسن الله الیکم وعادوا اعداءہ وجاہدوا  
فی الله حتی جہادہ هوا جتباکم وسماکم المسلمین لیہلک من  
ہلک من بینة ولا قوۃ الا بالہ فاکثروا ذکر الله واعملوا لما بعد  
الموت فانه من اصلح ما یدتہ و بین الله یکفہ الله ما بینہ و بین  
الناس ذلک بان یقضی علی الناس ولا یقضون علیہ ویملک من  
الناس ولا یمدکون منه الله اکبر ولا قوۃ الا بالہ العظیم :

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۵۵ والبدایہ والنبایہ ج ۲ ص ۲۱۳)

ترجمہ : میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد کی درخواست کرتا ہوں  
گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور نیک ہدایت کی التجا کرتا ہوں میں اس پر ایمان  
لاتا ہوں۔ میں اس ذاتِ برحق کا منکر نہیں ہوں۔ میں اس کا دشمن ہوں جو اس ذاتِ  
برحق کا انکار کرے میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے  
اور اُس کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت  
دینِ حق نورِ کامل اور نپند و نصیحت اور حکمت و دانش کی نعمتیں سپرد کر کے ایسے  
وقت مبعوث فرمایا کہ صدیاں گزر گئیں تھیں۔ سلسلہ رسالت منقطع ہو چکا تھا، علم مولیٰ

ناپید اور مفقود تھا۔ گمراہی کی گرم بازاری تھی۔ تو رہایت پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔  
 (دوسری طرف حالت یہ ہے) کہ یہ دنیا جس کو زمانہ کہتے ہیں اس کا المیہ ازل سے  
 چل رہا ہے، اب ٹوٹنے کے قریب ہے، قیامت سر پر ہے اور اس عالم کی آخری میاں  
 ختم ہو رہی ہے (اب اللہ تعالیٰ کا کوئی اور پیغام آنے والا نہیں ہے) اب جس نے  
 اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت اور کامیابی حاصل کر لی  
 اور جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے روگردانی کر رہا ہے  
 وہ گمراہ ہے اپنا فرض ادا کرنے میں حد سے زیادہ کوتاہی کر رہا ہے اور صحیح راستہ  
 سے بہت دور بھٹک رہا ہے۔

اے لوگو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور دیکھو سب سے  
 بہتر نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے کو کرے یہی ہے کہ اُس کو آخرت پر آمادہ کرے  
 یعنی ایسے کاموں کا شوق دلائے جو مرنے کے بعد کارآمد ہوں) اور یہ کہ خدا ترسی کی  
 ہدایت کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ پرہیزگاری اور پارسائی کی زندگی اختیار کریں۔  
 اے لوگو! ان باتوں سے پرہیز کرو جن سے بچنا اور پرہیز کرنا اتنا ضروری ہے کہ  
 خود اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حقیقت یہ کہ نہ اس سے افضل کوئی نصیحت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تذکیر اور یاد دہانی،  
 اس سے زیادہ ضروری اور مفید ہو سکتی ہے۔

دیکھو! اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور اس طرح تقویٰ کرنا کہ دل لرز رہا ہو اور خوفِ خدا زہن  
 و دماغ پر چھایا ہو۔ یہ تقویٰ ایک عمل کرنے والے کے لئے بہت بڑا معادن اور  
 مددگار اور نہایت مخلص رفیق ہے۔

اور جو شخص ظاہر و باطن میں اپنا معاملہ اللہ سے درست کر لے جس سے مقصود محض رضا  
 خداوندی ہو۔ کوئی دنیاوی غرض اور مصلحت پیش نظر نہ ہو تو یہ ظاہر و باطن کی مخلصانہ صلاح

دنیا میں اس کے لئے با عزت یادگار راہ رہا بعد الموت کے لئے بہترین ذخیرہ ہے جس وقت انسان ان اعمال کا سبب زیادہ ضرورت مند ہوگا جو اس نے پہلے سے بھیجے ہوئے (دیکھو) خدا ترسی اور ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کا راہدہ چیزیں یہی ہیں جو مرنے کے بعد انسان کی بہترین رفیق ہوں گی) ان کے علاوہ جو بھی ہے وہ انسان کے لئے یہاں تک بے کار ہے کہ قیامت کے روز انسان تنہا کرے گا کہ کاش! اس عمل کے اور میرے درمیان مدت دراز کی مسافت ہوتی۔

یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اس کی بے انتہا مہربانی اور اُس کے بے پایاں رحم و کرم ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کا تم کو خوف دلانا ہے (کہ تم غافل نہ لالائیالی۔ نفس پرست نہ بنو کہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کی طاقت بھی بے پایاں ہے جس کو عذاب دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کے عذاب کو روک سکے)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اس کا قول حق ہے جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے، جو وعدہ کرتا ہے پورا کرتا ہے، اس میں خلافت نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ اس کی بات پٹی نہیں جاتی اور وہ بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتا۔

پھر وہی بات ہے۔ اللہ سے تقویٰ کرو۔ موجودہ وقت اور حالت میں بھی اور مستقبل میں بھی۔ پوشیدہ بھی اور علانیہ بھی، جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرماتا ہے اور اُس کے اجر کو بڑھاتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرے وہ کامیاب ہے، پورا پورا کامیاب۔ بہت بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب غرض یہ ہے کہ بہر صورت خوفِ خدا کو سامنے رکھو۔ خوفِ خدا وہ اکسیر ہے جو کہ عذابِ خدا سے بچاتا ہے اُس کی سزا اور اس کی ناراضگی سے محفوظ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور خوفِ خدا کو سامنے رکھنا وہ تربیاق ہے جو چہرہ کو روشن کر دیتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے اور درجہ کو ملیند کرتا ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو تقویٰ کا عہدہ





## مدنیہ منورہ میں پہلی مصیحت:

قبائلیہ بنی عمرو بن عوف) میں جو فقرے پہلی مرتبہ زبان مبارک سے صادر ہوئے وہ یہ تھے۔  
 يَا أَيُّهَا النَّاسُ . افشوا السلام واطعموا الطعام . وصلوا والناس نيام . تدخلوا  
 الجنة بسلام (ترمذی شریف ج ۱ ص ۷۱) ————— ”اے لوگو! سلام کا رواج عام کرو، کھانا کھلاؤ  
 اور اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں، اطمینان سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔“  
 یعنی سلامت رومی۔ میل ملاپ۔ غریبوں کی مدد اور خدا کی عبادت کا حکم فرمایا۔  
 ”اسلام“ امن و سلامتی کا مشن:

”اسلام“ درحقیقت امن و سلامتی کا مشن ہے، اسلام کے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم اس  
 مشن کے علم بردار تھے۔

اس لئے خدا تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت اور آپ کے مزاج ہی کو سلامتی اور صلح  
 جوئی کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ قرآن کریم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی۔  
 وَ اِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاِجْتَمِعْ لَهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (انفال: ۶۱) ————— ”اگر وہ  
 لوگ صلح کے لئے آگے بڑھیں تو آپ بھی صلح کے لئے آگے بڑھئے اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے۔“  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر امن پسندی کا رنگ  
 اس قدر غالب تھا کہ آپ لوگوں کے ایسے نام بھی پسند نہیں کرتے تھے جن میں جنگ و حرب کا مفہوم ہوتا  
 تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے پہلے لڑکے کا نام حرب رکھنا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند  
 نہیں کیا اور اس کی جگہ ”حسن“ رکھا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسرے لڑکے کا نام بھی حرب رکھنا چاہا تو حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے ”حسین“ رکھا۔ (منہاج السنہ النبویہ لابن ابی تیمیہ)

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا دودھ نکالنے کے لئے ایک مکان کو پہنچا۔ ایک صاحب آئے، آپ نے ان کا نام پوچھا، انھوں نے جواب دیا ”مَثَّة“ یعنی کڑوا پانی نے فرمایا تم بیٹھ جاؤ، پھر فرمایا، مَنْ يَخْدِبُ؟ اس کا دودھ کون نکالتا ہے؟ پھر ایک صاحب کھڑے ہو گئے، آپ نے ان کا بھی نام پوچھا، وہ بولے ”يعليش“ — آپ نے فرمایا — اَحْلِب — ہاں تم دودھ نکالو —

ایک اور موقع پر ایک آدمی سے اس کا نام پوچھا، اس نے کہا ”اصرم“ یعنی فقیر آپ نے فرمایا — بَلْ اَنْتَ ذَرَعَةٌ — بلکہ تیرا نام کھیتی ہے۔ ایک اور صاحب سے نام پوچھا، انھوں نے کہا ”حُزْن“ آپ نے فرمایا بل انت سہل بلکہ تمہارا نام سہل یعنی آسانی ہے بلکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ ذی قرد کے موقع پر ایک کنویں پر پہنچے، اور اس کا نام پوچھا، لوگوں نے بتایا بئسان یعنی کھاری، آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ نعمان یعنی عمدہ، پھر کرامؓ نے اس کا پانی نکالا تو واقعی میٹھا اور عمدہ تھا، اس کنویں کو حضرت طلحہؓ نے خرید کر مسازن کے لئے وقف کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا ما انت يا طلحة الا فياض — ”طلحہ! تم بڑے قیاض ہو“ — اس وقت سے طلحہ ”قیاض“ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ حضورؐ ایک قبیلہ پر گزرے، پوچھا، تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا — بنو غيان — غيان کے معنی گمراہ کے ہیں، آپ نے فرمایا بل انتم بتورشدان — بلکہ تم ہدایت یافتہ لوگوں کی اولاد ہو۔ (المختصر ج ۱ ص ۲۶۰)

آپؐ صحابہ کرامؓ کو ہدایت فرماتے تھے کہ لوگوں کے پاس ایسے آدمیوں کو قاصد بنا کر بھیجا کر دو جو خوبصورت اور اچھے نام والے ہوں (حسن الوجه حسن الاسم) — حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اچھے نام سے نیک فال لیتے تھے، صلح حدیبیہ میں جب قریش کے سفیر سہیل بن کر آئے تو آپؐ نے فرمایا:

۱۔ تیسرا الوصول ج ۱ ص ۳۸ ۲۔ سیرۃ البیہ ج ۲ ص ۳۷۷ ۳۔ احیاء ج ۲ ص ۲۶۲

سہل لکم من امرکم۔ (جامع الصغیر ج ۱ ص ۱۰) ————— ”تھارا کام آسان ہو گیا“  
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امن پسندی اور صلح جوئی کی ناقابلِ انکار شہادت آپ کی  
 غزواتی زندگی ہے۔

قریش کے ظلم و تشدد نے جب رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو میدانِ جنگ میں نکلنے پر مجبور  
 کر دیا تو اس وقت بھی آپ کی روش ایک جنگ جو اور انتقام پسند فوجی لیڈر کی نہیں رہی،  
 بلکہ ایک امن پسند اور بلند اخلاق و اعلیٰ حق کی رہی۔

امن و سلامتی، صلح جوئی، انسانیت نوازی کا یہ بنیادی اصول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی پوری غزواتی زندگی میں قدم قدم پر ہمارے سامنے آتا ہے۔  
 میدانِ جنگ کے اخلاقی اصول:

ذیل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ضابطہ جنگ کی تشریح کی جاتی ہے، جس پر آپ  
 خود بھی سختی سے عمل کرتے تھے اور اپنے رفقاء کو بھی اس پر کاربند رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔  
 مقصدِ جہاد میں اخلاقی اصولوں کا احترام:

ادیرہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کس مقصد کے لئے تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔  
 کوئی جابر طاقت اسلامی دعوت و تبلیغ کے راستہ میں رکاوٹ ڈالے اور جو لوگ بلاکراہ  
 و زبردستی کے اپنی مرضی سے اسلام کی راہِ نجات قبول کریں انھیں ظلم و ستم کا نشانہ بنائے یا کسی  
 مسلمان بستی پر حملہ کرنے کی سازش کی جائے تو ان دونوں صورتوں میں دفاعی طور پر بھی اسلام کی  
 طرف سے جہاد کرنے اور تلوار اٹھانے کی اجازت بلکہ حکم دیا گیا ہے۔

اس پاک مقصد کے علاوہ، تاج و تخت کے حصول کے لئے، دولت اور مال اور شہرت  
 و عزت کے لئے جنگ کرنا اسلامی جہاد نہیں، اس قسم کی لڑائیوں سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے بے تعلقی ظاہر فرمائی ہے اور مسلمانوں کو اس مجرمانہ خونریزی سے روکا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر

عرض کیا۔۔۔ فقال، الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل لیبری مکانہ فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فهو فی سبیل اللہ۔۔۔ اے اللہ کے رسول! کوئی شخص مالی غنیمت کے لئے، کوئی شخص شہرت اور نام آوری کے لئے، کوئی شخص اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کے لئے لڑتا ہے، پس ان میں سے کون سی راہ خدا کی جنگ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، راہ خدا کی لڑائی تو صرف وہ ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑی جاتی ہے۔“

اس مقصد کی روایات متعدد طریقوں سے تمام کبار محدثین امام بخاری، امام مسلم، ابو داؤد نے صحاح و سنن میں نقل کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص محض کسی دنیوی اقتدار اور دولت و عزت کی خاطر تلوار اٹھاتا ہے وہ آخرت میں مجرم بن کر پیش ہوگا۔

یجی الرجل اخذ ابید الرجل فیقول ان هذا قتلنی فیقول اللہ لیم قتلته؟ فیقول لتکون العرة لفلان، فیقول انہا لیست لفلان فیبوء باثمہ۔۔۔ ”مقتول اپنے قاتل کا ہاتھ پکڑ کر خدا کے سامنے لائے گا اور کہے گا اس نے مجھے قتل کیا تھا، خدا تعالیٰ سوال کرے گا تو نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ کہے گا تاکہ اقتدار فلاں شخص کو حاصل ہو جائے، خدا تعالیٰ فرمائے گا اقتدار اور عزت کا تو وہ شخص مستحق نہیں، پھر مقتول کے قتل کا جرم اس قاتل پر لوٹ جائے گا۔“

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں اس قاتل کی سزا یہ بیان کی گئی ہے۔

و لکنک قاتلت لیقال فلان جری فقد قیل ثم امر بہ فحسیب علی وجہہ حق الحق فی النار۔۔۔ ”حق تعالیٰ فرمائے گا، لیکن تم نے تو اس لئے تلوار اٹھائی کہ یہ کہا جائے فلاں شخص بڑا بہادر ہے پس وہ تو خوب کہا گیا پھر خدا تعالیٰ حکم دے گا اور اس قاتل اور نام نہاد مجاہد کو چہرے کے بل گھسیٹا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا۔“



ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی:

لَا تَمْنُوا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَوَسَلُوا اللَّهَ الْعَاقِبَةَ فَإِذَا لَقِيتُمْهُمْ فَأَصْبِرُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلِّ السَّيْفِ \_\_\_\_\_ ”دشمن سے مقابلہ کی آرزو مت کرو، بلکہ اللہ سے امن دعا کیے کی دعا کیا کرو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر استقلال کے ساتھ جم کر لڑو اور یقین کر لو کہ جنت تلواروں کے سائے کے تلے ہے۔“  
ان ہدایات نبوت سے معلوم ہوا کہ:

(۱) جہاد ایک دینی اور اخلاقی فرض ہے، جس میں کسی دنیوی غرض طمع، لالچ، قومی اور ذاتی عداوت کا انتقام، حکومت و فرمانروائی کی خواہش کو دخل نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو وہ دنیوی جنگ ہو جاتی ہے جو شریعت کی نظر میں ایک سنگین جرم ہے۔

(۲) کسی جاہل طاقت کی طرف سے اگر فتنہ و فساد کی ابتداء کی جاتی ہے، تب بھی مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ آخری حد تک اصلاح حال کی جدوجہد کریں، اور جب شر و فساد کو دُور کرنے اور رد کرنے کے لئے تلوار اٹھانے کے سوا کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہ جائے تو پھر تلوار اٹھائی جائے۔ یقیناً ایک فوجی فاتح اور تہ سبیح پسند سیاسی لیڈر کے سامنے جنگ و قتال کا اتنا اعلیٰ اور خشک و بے مزہ مقصد نہیں ہو سکتا، ایک فوجی جرنیل کے سامنے تو صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ جس طرح ہو سکے ملکوں اور قوموں کو زیر کر کے انھیں غلام بنایا جائے۔  
جنگ کے طریقوں میں اخلاقی اصولوں کا احترام:

جنگ و قتال کا مقصد جب یہ قرار پا گیا کہ اگر جاہل طاقتیں فوجی اقدامات، سیاسی دباؤ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے حق قبول کرنے والوں کو پریشان کریں، ان کی آزادی رائے کو پھینیں اور ظلم و تشدد پر آمیں تو اپنے اور حق کے بچاؤ کے لئے تلوار کا دفاع تلوار سے کیا جائے۔ \_\_\_\_\_ مقصد جنگ کی اس تعدیل درپاکیزگی کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے کہ جنگ کے طریقوں میں بھی پاکیزگی اور تعدیل کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

چنانچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے وحشیانہ طریقوں کو ممنوع اور حرام قرار دیتے ہوئے میدانِ جنگ کے لئے متعدد اخلاقی قوانین نافذ کئے۔

۱۔ بوڑھوں اور بچوں کا تحفظ: مجاہدین اسلام کو ہدایت فرمائی

لَا تَقْتُلُوا شَيْخًا فَانِيًّا وَلَا طِفْلًا صَغِيرًا وَلَا امْرَأَةً وَلَا تَقْلُوا وَصْرًا غَنَائِكُمْ  
وَأَصْلَحُوا وَاحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ————— ”نہ کسی بوڑھے ضعیف کو  
قتل کرنا، نہ چھوٹے بچوں کو، نہ کسی عورت کو، نہ غنیمت کے اموال میں خیانت کرنا۔ جنگ میں جو  
سامان ملے اسے ایک جگہ جمع کروںندگانِ الہی کے ساتھ نیکی اور احسان کرو، خدا تعالیٰ احسان  
کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

ایک حدیث میں ہدایت فرمائی گئی:

لَا تَقْتُلُوا أَصْحَابَ الصَّوَامِعِ ————— ”عبادت گاہوں کے عابدوں اور خانقاہ  
نشینوں کو قتل نہ کیا جائے۔“

۲۔ شبِ خون کی ممانعت:

آپ نے دشمنوں پر رات کے وقت بے خبری میں حملہ کرنے کی ممانعت فرمائی حضرت انسؓ فرماتے ہیں  
كَانَ إِذَا جَاءَ قَوْمًا بَلِيدٍ لَمْ يَغْزِ عَلَيْهِمْ حَتَّى يَصْبِحَ ————— ”سرورِ عالم صلی اللہ  
علیہ وسلم جب رات کے وقت کسی دشمن پر پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی اس پر حملہ نہ کرتے۔“

۳۔ آگ میں جلانے کی ممانعت:

دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد انھیں آگ میں جلانے اور ان کی بستیوں کو پھونک ڈالنے  
کی ممانعت فرمائی: ————— لَا يَتَّبِعِي ان يَعْذِبَ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ ————— ”آگ کا  
عذاب دنیا آگ پیدا کرنے والے خدا کے سوا کسی دوسرے کو سزاوارد نہیں۔“

۴۔ اذیت دے کر قتل کرنے کی ممانعت:

دشمنوں کو مغلوب کرنے کے بعد انھیں تکلیفیں پہنچا کر قتل کرنے کی ممانعت فرمائی۔

نہی عن قتل الصبر ————— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا"  
۵۔ لوٹ مار کرنے کی ممانعت:

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من النهب والمثلۃ ————— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مال لوٹے اور مقتول کی صورت بگاڑنے کی ممانعت فرمائی"  
ایک حدیث میں ہدایت فرمائی:

لا تغدروا ولا تغلوا ولا تُسبِّحُوا ————— "میدان جنگ میں بد عہدی نہ کرنا، غنیمت میں خیانت نہ کرنا، اور مقتولوں کی صورت نہ بگاڑنا"

۶۔ شور مچانے کی ممانعت:

میدان جنگ میں فخر و غرور کے نعرے بلند کرنا اور دشمنوں کو برا بھلا کہنا تو کجا، ذکر الہی کے لئے بھی آوازیں بلند کرنے کی اجازت نہیں دی گئی

ایک موقع پر مجاہدین نے اونچی آواز سے تکبیرات شروع کر دیں تو آپ نے فرمایا:

ایہا الناس اربعوا علی انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائباً معکم انہ سمیع قریب ————— "اے لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس ذات کو پکار رہے ہو وہ ہر انتہی پر اور نہ غائب ہے وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے۔ ان ہدایات کی اہمیت کا اس وقت اندازہ ہو سکتا ہے جب اس عہد کے وحشیانہ طریقوں اور ظالمانہ افعال کو سامنے رکھا جائے۔

اس دور کی وحشی قریں اور متدن ملک دونوں کا یہ حال تھا کہ سفراء کو قتل کر دینا، معاہدہ کے تحت رہنے والی قوم کے ساتھ فدا رسی کرنا، دشمنوں کی بستیوں کو جلا ڈالنا، آگ لگا دینا، لاشوں کی بے حرمتی کرنا، بدنظمی اور شور و غل کرنا، جنگ کا لازمی معمول بن گیا تھا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام بہیمانہ افعال کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا اور بالآخر جنگ ایک جہاد کے درجہ میں آگئی جس میں دشمن کو کم سے کم نقصان پہنچا کر اس کے شر و فساد کو دودھ کر دیا جاتا ہے۔

# قیدیوں پر احسان و کرم اور دشمنوں سے سلوک

## غزوہ بدر کے قیدی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دور میں یہ عظیم اصلاحات فرمائیں اس دور کی مشہور سیاسی طاقتیں، رومۃ الکبریٰ کی قیصریت، فارس کی کسرویت اور عرب کے خونخوار وحشی قبائل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوتے وقت ایک دوسرے کو غیبت و نابود کرنے اور دشمن کے ساتھ بدر سے بدتر حیوانی سلوک کرنے کی جو اند و مہناک تاریخ پیش کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات اور آپ کے فوجی معرکے صرف جابر طاقتوں کے لئے ایک فہائش اور انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ہلاکت و بربادی کی حیثیت نہیں رکھتے۔

ان اخلاقی اصولوں پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس سختی سے عمل کیا اور اپنے رفیقوں سے کرایا، اس کی تفصیل اگلے واقعات سے ظاہر ہوگی۔

قریش مکہ نے مدینہ منورہ پر سب سے پہلا حملہ ایک ہزار جوانوں سے کیا، جو ہر طرح کے ہتھیاروں اور ساز و سامان سے مسلح تھے، اس حملہ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے حوصلہ سے روکا اور تین سو تیرہ بے سر و سامان رفیقوں کے ساتھ قریش کے حملہ کو ناکام بنا دیا۔ اس مقابلہ میں قریش کے بڑے بڑے نامور سپہ سالار مارے گئے، شیبہ، ابو جہل، عقبہ

ابو بختری، زمعہ ابن الاسود، عاص ابن ہشام، امیہ ابن خلف، منبہ ابن الحجاج — یہ سب قریش کے اہم ترین سیاسی لیڈر تھے جو اس جنگ میں کام آگئے، ان سب کی تعداد ستر کے قریب تھی — اسی کے ساتھ نثر آدمی اسیرانِ جنگ کے طور پر گرفتار کر لئے گئے اور انہیں مدینہ منورہ لے آیا گیا۔

اسیرانِ جنگ میں حضور کے چچا حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے بھائی حضرت عقیل اور



ابوالعاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی تھے۔

مہذب قوموں کا سلوک قیدیوں کے، افسر:

اس وقت کی مہذب دنیا جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی تھی؟ — پہلے اس پر

ایک نظر ڈالئے۔ — ارسطو جیسا معلم اخلاق کہتا ہے کہ قدرت نے اس طبقہ کو

محض غلامی کے لئے پیدا کیا ہے۔ — (المجہاد ص ۱۶۶)

اس عقیدے نے رومیوں کے نزدیک انسانی جان و مال کو بے حقیقت، چیز بنا دیا تھا۔

آغاز اسلام کے وقت روم میں ان غلاموں کی حالت یہ تھی — ایک دفعہ شہنشاہ ہرقل کی

یہی کے جنازہ میں جاتے ہوئے ایک لونڈی نے زمین پر تھوک دیا تو اس گستاخی پر اس لونڈی کو قتل کر دیا گیا۔

رومی سلطنت کی طرح ایران میں بھی اسیرانِ جنگ کے ساتھ ایسے ہی وحشیانہ طریقے اختیار کئے

جاتے تھے، قیصر روم (دایسریان) جب شکست کھا کر ایرانی حکومت کا قیدی بنا تو اسے زنجیروں

میں باندھ کر شہر میں گشت کرایا گیا اور ساری عمر اس سے غلاموں کی طرح خدمت لی گئی اور مرنے

کے بعد اس کی کھال کھینچو کر اس میں بھس بھر دیا گیا۔

ایرانی شہنشاہ (شاہپور) کا واقعہ ہے کہ اس نے بحرین کے عربوں کو جنگ میں شکست دیکر

قیدی بنایا اور ان کے شانوں میں سوراخ کر کے ان کے اندر رستی پر وادی اور سب کو ملا کر ایک

جگہ باندھ دیا۔ — (المجہاد، ص ۱۶۷)

ان حالات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے اسیروں کے ساتھ جو سلوک فرمایا وہ

اس عہد کی مہذب ترین قوموں کے دستور کے مقابلہ میں رحم و کرم اور فضل و احسان کا بے مثال

سلوک تھا۔ — رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عام فرمان تھا۔

لا تجھزون علی جو یح ولا یتبعن مد یرو ولا یتلن اسیر ومن اعلیٰ بابہ فھر

”کسی زخمی انسان پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے

امی (فتوح البلدان ص ۴۷)

کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرے وہ امان میں رہے گا۔  
اس کے علاوہ قرآن حکیم نے جنگی قیدیوں کے ساتھ انتہا درجہ نرمی اور احسان کی تاکید فرمائی  
ہے، ارشاد فرمایا: —————

رَبُّطْعْمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حَيْثُمْ مَسْكِينًا وَبَيْتِيًّا وَآسِيرًا ————— ”یہ نیکو کار لوگ  
خدا کی خوشنودی کے لئے یتیم، مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں“ (الدہرہ)  
قیدیوں کو کھانا کھلانا، سعادت اخروی میں شامل کر دیا گیا اور اسے صالحین کا فعل قرار  
دیا گیا ————— بدر کی جنگ میں جو لوگ قیدی بن کر آئے یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ۱۳ برس  
تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر بے حد و حساب ظلم و ستم کیا تھا اور وطن سے بے وطن  
ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس کے باوجود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کو دو دو چار چار کر کے صحابہ کرام  
میں تقسیم کر دیا اور انہیں تاکید فرمائی کہ انہیں آرام کے ساتھ رکھا جائے، صحابہ کرام اپنے ان مہمانوں  
کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجوریں کھا کر گزارا کرتے تھے۔

ایک قیدی ابو عزیہ کا بیان ہے کہ میں جن انصاریوں کے پاس قید تھا جب وہ لوگ صبح شام  
میرے سامنے کھانا لاتے تو ردئی میرے سامنے رکھ دیتے خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی  
اور میں ردئی ان کے ہاتھ میں دے دیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس کر دیتے۔

(طبری ص ۱۳۳۸)

ان قیدیوں میں ایک شخص سہیل ابن عمرو تھا جو نہایت بلند پایہ خطیب تھا اور عام مجمعوں  
میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق رائے دی کہ  
اس کے دو نیچے دانت اکھڑا دیئے جائیں تاکہ یہ ابھی طرح تقریر نہ کر سکے۔ لیکن رسول اکرم صلی  
علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی یہ تجویز سُن کر فرمایا ————— اگر میں اس کا چہرہ بگاڑوں گا تو گوئیں رسول  
ہوں مگر خدا تعالیٰ میرا چہرہ ضرور بگاڑ دے گا (طبری ص ۱۳۴۴)

اسیرانِ جنگ کے کپڑے خراب ہو گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ انہیں اچھے کپڑے دے کر ان کا لباس بدلوا یا جلے۔

قیدیوں میں حضرت عباس کا قد نہایت بلند تھا اور کسی کا کہہ کر ان کے جسم پر ٹھیک نہیں اترتا تھا، عبداللہ بن ابی نے انہیں اپنا کہہ کر پیش کیا، کیونکہ یہ بھی بلند قامت انسان تھا، اتفاق میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کو اس کے کفن کے لئے اپنا جو کرتہ عطا فرمایا تو وہ اسی احسان کا بدلہ تھا۔ (بخاری ص ۲۴۲)

اسیرانِ بدر کے واقعہ تک جنگی قیدیوں کے بارے میں کوئی مستقل قانون نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ سیاسی اور وقتی معاملات میں اپنے اصحابِ الرائے ساتھیوں سے مشورہ لیا کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔ وَشَاوَرَهُمْ فِي الْأَمْرِ (ال عمران: ۱۵۹)

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کیجئے“۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (ج ۲ ص ۳۲۵) میں امام احمد اور ترمذی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ اور انسؓ کی زبانی نقل کیا ہے کہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا مَا تَقُولُونَ فِي هَؤُلَاءِ الْأَسَارِيِّ؟ ”ان قیدیوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَمَكَّنَكَ مِنْهُمْ۔ ”خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کو تمہارے

قبضہ میں دے دیا ہے“

سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرچوش رفیق حضرت عمر فاروقؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کذبوک و اخرجوک فقد مهمم فی ضرب اعناقهم ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم! انہوں نے آپ کو جھٹلایا، اور آپ کو گھر سے نکالا، پس اجازت دیجئے کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں“۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمرؓ کے مشورہ سے سخت تکلیف پہنچی۔

مقدمہ

فا عرض عنہ المنی صلی اللہ علیہ وسلم ————— ”اور آپ نے انکی طرف منہ موڑ لیا؛ پھر آپ نے دوسری دفعہ سوال کیا، پھر حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور اپنی وہی رائے پیش کی مگر آپ نے پھر ان کی طرف سے منہ موڑ لیا، تیسری دفعہ آپ نے پھر پوچھا تو عبد اللہ ابن رواحہؓ ہو گئے اور انھوں نے حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ سخت رائے پیش کی اور کہا:

انت فی واد کثیر الحطب فاضرم الوادی علیہم نار اثم القہم فیہا  
 ”حضور! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ایسے ایک جنگل میں ہیں جہاں کثرت سے لکڑیاں موجود ہیں، آپ اس جنگل میں آگ لگوا دیجئے اور ان قیدیوں کو اس میں ڈلوادیجئے۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ ابن رواحہؓ کی رائے سن کر پھر صحابہ کرامؓ کے سامنے اپنا سوال دوہرایا اور آخر میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کھڑے ہوئے اور بولے:

یا رسول اللہ! قومک را ہلک استبقہم واستتہم لعل اللہ ان یتوب علیہم  
 ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ کی قوم ہے اور آپ کے گھر والے ہیں آپ انھیں زندہ رہنے دیجئے اور ان سے توبہ کرا لیجئے شاید خدا تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے۔“  
 اسی کے ساتھ ابو بکر صدیقؓ نے ان سے کچھ قیدی لینے کی بھی رائے دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ تمام مشورے سن کر مجمع میں سے اٹھ کر چلے گئے صحابہ کرامؓ میں کچھ لوگ عمرؓ کے ساتھ اور کچھ لوگ ابو بکرؓ کے ساتھ ہو گئے۔

چند منٹ کے بعد آپ صحابہ کرامؓ میں واپس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا:

ان اللہ لیلین قلوب رجالٍ حتی تكون الین من اللین وان اللہ لیشد قلوب رجال فیہ حتی تكون اشد من الجحارۃ وان مثلک یا ابو بکر کمثل ابراہیم قال من تبعنی فانه متی الخ — وان مثلک کمثل عیسیٰ قال ان تعد بہم فانہم عبادک الخ  
 ”لوگو! خدا تعالیٰ نے بعض لوگوں کے دل دودھ سے زیادہ نرم بنائے ہیں اور بعض کے دل پتھر سے زیادہ سخت بنائے ہیں اور اے ابو بکرؓ تمھاری مثال حضرت ابراہیمؑ جیسی ہے جنھوں نے



فرمایا تھا فمن تبعني الحق اور حضرت عیسیٰ جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا ان تعذبهم الحق۔  
وان مثلک یا عمر کمثل موسیٰ قال ربنا اطمس علی امرالهم واشدد علی  
قلوبهم فلا یؤمنوا! حتی یرد العذاب الالیهم۔۔۔۔۔ اور اے عمر نہ تمہاری مثال  
حضرت موسیٰ جیسی ہے جنہوں نے فرعون کے لئے یہ دعا کی ربنا اطمس الحق۔

وان مثلک یا عمر کمثل نوح قال رب لا تذرع علی الارض من الکافرین دیاراً  
(سورہ نوح)۔۔۔۔۔ اور حضرت نوح جیسی ہے جنہوں نے اپنی نافرمان قوم کے متعلق فرمایا رب  
لا تذرع علی الارض الحق۔۔۔۔۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انتم عالة فلا ینفکن احد منهم الا بقداء وغریبہ حنفی۔۔۔۔۔ ”دیکھو!  
اس وقت تم ضرورت مند ہو، اس لئے ان قیدیوں سے کچھ فدیہ (تاوان) وصول کر کے انہیں چھوڑ  
اور اگر یہ انکار کریں تو پھر واقعی یہ لوگ قتل کے مستحق ہیں“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ان قیدیوں سے ان کی حیثیت کے مطابق  
فدیہ وصول کر کے انہیں چھوڑ دیا گیا، جو قیدی غریب تھے ان سے تعلیم کا کام لیا گیا اور انہوں نے  
دش دش مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا، بس یہی ان کا فدیہ تھا۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے جنگی قیدیوں کے متعلق مستقل قانون نازل فرمایا اور وہ قانون  
یہی تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں اختیار فرمایا تھا، قرآن نے ہدایت  
کی کہ اسیرانِ جنگ کے متعلق امیر المؤمنین کو اختیار ہے۔ خواہ انہیں احسان کر کے رہا کر دیا جائے  
یا ان سے تاوان وصول کر کے آزاد کر دیا جائے (سورہ محمد)

بدر کے قیدیوں کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی قیدیوں کو اکثر فدیہ لئے بغیری  
آزاد کر دیا اور انہیں اپنے فضل و احسان سے نوازا۔

قیدیوں کا تبادلہ:

اس دور میں قیدیوں کے تبادلہ کا عام دستور نہ تھا، بلکہ اکثر قومی اسیرانِ جنگ کو غلام

بنالیتی تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی دوسری قوموں کے ظالمانہ طرزِ عمل کے جواب میں احسان کرنے اور معاف کرنے یا ضرورت کے وقت معمولی تاوان لینے کا طریقہ اختیار فرمایا اور اگر کسی موقع پر تبادلہ کا موقعہ آیا تو آپ نے اسے خوشی سے منظور فرمایا۔

مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمان قیدیوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو آزاد کیا (فتح القدیر ج ۲ ص ۲۰۶) تمام محدثین اور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن قوم تبادلہ پر راضی ہو تو تبادلہ کر لیا جائے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۱۰۱)

### فدیہ کی حوصلہ شکنی :

اس وقت مسلمانوں میں غربت و افلاس کی پریشانی زیادہ تھی مسلمان خود اپنا پیٹ مشکل سے بھرتے تھے، پھر وہ ان قیدیوں کی خوراک کا انتظام زیادہ دیر تک کیسے کرتے؟ پھر تیرہ سال تک ان کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھانی تھیں، اور کچھ نہ کچھ سرزنش کرنا ضروری تھا، تاکہ انھیں آئندہ جنگ کی آگ بھڑکانے کا موقع نہ ملے۔

اس بنا پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ نے فدیہ لینے یعنی کم سے کم سرزنش کرنے کی رائے دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمایا۔

لیکن قرآن کریم نے صحابہ کرامؓ کے اس جذبہ کی بھی حوصلہ شکنی کی اور وحی الہی کے ذریعہ صحابہ کرام کو بھی سی فہمائش کی گئی تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اسیرانِ جنگ سے فدیہ لینے کی جو اجازت دی جا رہی ہے وہ ایک نابسندیدہ بات کی اجازت دی جا رہی ہے جو بدرجہ مجبوری ضرورت کے وقت اختیار کی جاسکتی ہے۔

ورنہ اسلامی تعلیم کی حقیقی روح کا تقاضا یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ عفو و کرم کا برتاؤ

کیا جائے ؟

## میدانِ اُحد میں دشمنوں کے لئے دُعا:

خدا تعالیٰ نے دشمنوں کی ہر سازش سے اپنے رسول کو محفوظ رکھا، لیکن دشمن آخر دم تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے پیچھے پیڑھے رہے ہجرت کے بعد ان مغرور سرداروں نے مدینہ منورہ پر فوج کشی شروع کر دی، بدر کے پہلے معرکہ میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مند فرمایا لیکن اُحد کے دوسرے معرکہ میں چند رفیقوں کی غلطی سے جنگ کا نقشہ بدلتا گیا اور مسلمانوں کے ساتھ خود لشکر کے سپہ سالار سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی زبردست تکلیف اٹھانی پڑی۔

دشمنوں کا نشانہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک کو ختم کر کے مسلمانوں کو بے سہارا کرنا تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے دشمنوں کی اس ناپاک آرزو کو خاک میں ملا دیا۔

میدانِ جنگ کا نقشہ بدلتا جانے کے بعد جب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار رفیقوں کے پیر اکھڑ گئے تو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم عجیب پریشانی کے عالم میں گھر گئے آپ نے فرمایا: — من رجل یشری لنا نفسه — ”کون ہے جو ہمارے لئے اپنی جان

قربان کرے — اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار سن کر چودہ صحابیوں نے آکر آپ کو اپنے گھرے میں لے لیا۔ ان میں سات مہاجر اور سات انصار تھے (فتح الباری ج ۱ ص ۱۷۷)۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے بڑھتے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر فرمایا: — کون ہے جو ان ظالموں کو مجھ سے ہٹائے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا (مسلم ج ۱ ص ۱۰۷)۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جیسے باہمت اور بلند حوصلہ انسان کے لئے وقت کتنا عجیب ہوگا، جب آپ اپنے رفیقوں کو مدد کے لئے پکار رہے ہوں گے اور دشمنوں کی یلغار آپ پر

پڑھتی جا رہی ہوگی، تاہم کتنی کہتی ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے موقع پا کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک پتھر پھینکا جس سے آپ کا نیچے کا دانت شہید ہو گیا اور نیچے کا ہونٹ زخمی ہو گیا

عبداللہ ابن قتیہ قریش کا مشہور پہلوان تھا اس نے آپ پر نہایت زوردار حملہ کیا اس سے آپ کا رخسار زخمی ہو گیا اور فولادی خود کی دو کڑیاں

۱۳ آپ کے رخسار مبارک میں گھس گئیں، ایک پتھر عبداللہ بن شہاب زہری نے آپ کے مارا اور

اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک پیشانی زخمی ہو گئی۔

حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ نے چہرہ انور میں گھسی ہوئی کڑیاں اپنے دانتوں میں پکڑ کر کھینچیں اور اس سے ابو عبیدہؓ کے دودانت ٹوٹ گئے۔

صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس گڑھے سے نکال کر پہاڑی کے اوپر چلنے کی کوشش کی، آپؐ بے حد کمزور ہو گئے تھے اور اوپر چڑھنا مشکل ہو رہا تھا اس لئے حضرت طلحہؓ آپؐ کے نیچے بیٹھ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دے کر آپؐ کو اوپر چڑھایا۔

قیس ابن عازم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طلحہؓ کا وہ ہاتھ دیکھا جس سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُحد کے دن بچایا تھا تو میں نے دیکھا کہ آپؐ کا وہ ہاتھ بالکل شل تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اُحد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔

كَانَ ذَلِكَ الْيَوْمَ كَلَّمَا لَطَحْتَا \_\_\_\_\_ "یہ دن تو سارا طلحہؓ کے لئے رہا۔"

(فتح الباری ج ۷، ص ۸۷۸)

حضرت ابو دجانہ سپرن کر آپؐ کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے اور آپؐ کو دشمنوں کے حملوں سے بچا رہے تھے۔ ابو دجانہ کی پلیٹھ دشمنوں کی جانب تھی اور آپؐ بے حس و حرکت کھڑے رہے تاکہ کوئی تیر آپؐ کے نہ لگ جائے۔

ایسے خوفناک حالات میں بشری تقاضے کے تحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ قدس سے قریش کے تین سرداروں، صفوان، سہیل اور حارث کے متعلق بدوعداء کے چند جملے نکل گئے اس پر خدا تعالیٰ نے آپؐ کو فوراً افہائش کی اور آپؐ کا غصہ ٹھنڈا کیا وہ آیتِ پاک یہ ہے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ

"اس معاملہ میں آپؐ کو کوئی اختیار نہیں، یا خدا انھیں توبہ کی توفیق دے یا انھیں عذاب دے کیونکہ یہ بڑے ظالم ہیں (سورہ آل عمران)۔" بس وحی الہی کے اس اشارے نے آپؐ کے طبی

غصہ کو ٹھنڈا کر دیا اور آپؐ نے ان ظالموں کے حق میں دُعا کرنی شروع کر دی۔



عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس وقت بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم میری نظروں کے سامنے ہیں، آپ اپنی پیشانی سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور یہ دُعا کرتے جاتے ہیں۔

رب اغفر لقومی فانہم لا یعلمون ————— ”خداوند! میری قوم کو معاف

کر دے یہ لوگ بے خبر ہیں، انجان اور نادان ہیں“ (مسلم شریف، ج ۲ ص ۱۰۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا میں اپنی ظالم قوم کے لئے رحم و کرم کا بہت گہرا جذبہ کا اظہار ہے، آپ نے اپنی دُعا میں ان ظالموں کے لئے خود ہی معذرت پیش فرمادی اور یہ کہہ دیا کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض لاعلمی اور بے خبری میں کر رہے ہیں حالانکہ قریش مکہ آپ کے ساتھ جو جو ظلم و ستم کر رہے تھے وہ جانتے بوجھتے کر رہے تھے۔ یہ لوگ یقین رکھتے تھے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور امین ہیں، پھر بھی آپ کی جان کے لیے ایسے ہوئے تھے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رحم و کرم کے بلند ترین مقام پر فائز تھے، اخلاقِ عظیم کے مالک تھے، آپ نے خدا کے حضور میں ان ظالم دشمنوں کی طرف سے خود ہی معذرت خواہی کی اور معافی کی درخواست کی۔

اس کی مثال اگلے رسولوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاں بھی ملتی ہے، برادرانِ یوسفؑ اپنے بھائی کے حضور میں کھڑے ہیں۔ بھائی مصر کا حکمران ہے اور یہ غلہ کے بھکاری ہیں، آپس میں تعارف کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے اور حقیقتِ حال کے چہرہ سے نقاب اٹھائی جا رہی ہے حضرت یوسفؑ سوال کرتے ہیں۔

هَلْ عَلِمْتُمْ مَآ فَعَلْتُمْ یُوسُفَ وَآخِیْہٖ اِذَا اَنْتُمْ جَاہِلُوْنَ (سورہ یوسف)

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف کے ساتھ کیا کیا؟ جب تم نادان تھے۔“

حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں کو ان کی زیادتیوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں، انہیں بچھلی خطائیں یاد دلاتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی طرف سے یہ عذر بھی پیش کرتے ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب تم جاہل، نادان اور انجان تھے۔ مطلب یہ کہ مجرم کو اپنی صفائی کے لئے خود حضرت یوسفؑ نے دلیل بھی عنایت فرمادی، ایسے انداز سے خطا یاد دلائی کہ مجرم کی صفائی

کا خود ہی اعلان کر دیا یہ غایت اخلاق اور بے حد و حساب کرم کی بات ہے۔  
 علماء نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لا یجلسون کا جملہ کہا اور حضرت  
 یوسفؑ نے جاہلون فرمایا اور ان دونوں جملوں میں یہ فرق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 جملہ میں شفقت و کرم کا جذبہ حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

(سیرت المصطفیٰ ج ۲ ص ۲۰۵)

## حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کے درمیان فرق

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں پر رحم و کرم کرنے میں حضرت یوسفؑ کی مثال  
 پر عمل کیا، حالانکہ رحم و کرم کا ایک نمونہ حضرت یعقوبؑ کے عمل میں بھی ملتا ہے، اسے آپؐ نے  
 نظر انداز فرمایا:

قرآن کریم کہتا ہے، اولاد یعقوبؑ نے سارا معاملہ سامنے آجانے کے بعد اپنے باپ سے کہا:  
 قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُكُمْ  
 رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (سورہ یوسف) \_\_\_\_\_ ”وہ بولے، اے باپ! ہمارے لئے  
 مغفرت کی دعا کیجئے، یعقوبؑ نے کہا، دم لو، میں تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا۔ اپنے  
 رب سے، بے شک وہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔“

حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کی درخواست پر ان سے دعا و مغفرت کرنے کا وعدہ کیا، اس  
 کے برعکس حضرت یوسفؑ نے فوراً ہی اپنے بھائیوں کے حق میں مغفرت کی دعا کرنی شروع کر دی  
 لَا تَنْتَرِبْ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ  
 مفسرین نے لکھا ہے کہ باپ بیٹے کے درمیان یہ فرق جوانی اور بڑھاپے کے مزاجوں کا  
 ہے۔ \_\_\_\_\_ جوانی میں آدمی میں جوش ہوتا ہے، رحم کا معاملہ ہو یا عقیب کا، اس میں جلدی کرتا  
 ہے اور جوش دکھاتا ہے۔

بُورِضا آدمی ہر معاملہ میں تحمل اور سوچ و سمجھ کا مظاہرہ کرتا ہے، اس میں جلد بازی نہیں ہوتی یہی بات حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے معاملہ میں نمایاں ہوتی ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دشمنوں پر رحم و کرم کرنے میں جانوں کی طرح جوش و خروش سے کام لیا اور فوراً معافی کا اعلان کر دیا۔

خدا کی رحمت، اس کے غضب پر سبقت لے جاتی ہے:

خدا کی رحمت اس کے غیض و غضب پر سبقت لے جاتی ہے اور اپنی مخلوق کے معاملات میں خدا تعالیٰ رحم و کرم اور عفو و درگزر سے زیادہ کام لیتا ہے، مشہور حدیث قدسی ہے  
 اِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ عَلٰى غَضَبِيْ ————— ”بیشک میری رحمت میرے غصہ اور غضب سے آگے بڑھ جاتی ہے“

خدا تعالیٰ نے اپنے رسولِ خاص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی مزاج اور آپؐ کی تعلیمات کا مزاج اسی سانچے میں ڈھالا ہے۔

کتاب کے آخر میں ”سیاستِ شرعیہ“ کا ایک عنوان آئے گا اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی تعلیمات میں رحمت، شفقت اور عامۃ الناس کے ساتھ ہمدردی کا رنگ کیوں غالب نظر آتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رحم و کرم

رسولانِ کرام میں حضرت ابراہیمؑ کا رحم و کرم بھی مشہور ہے، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے باطل معبودوں کے بارے میں حضرت حق سے فرمایا۔

رَبِّ اِنَّهُمْ اضَلُّوا قَبْلَ الْاِيْمَانِ بِكَ اِنَّ النَّاسَ خَسَنٌ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَلَا  
 غُشُوْرَ رَّحِيْمٍ ————— ”اے میرے رب! ان باطل معبودوں نے اکثر لوگوں کو گمراہ کر دیا،

پس جو شخص میری پیروی کرے گا وہ تو میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے گا سو تو تو بیشک بخشش کرنے والا

اور رحمت والا ہے۔“

حضرت ابراہیمؑ کے انداز پر غور کرو، پیروی کرنے والے مومن کو تو اپنا فرما رہے ہیں اسے اپنے دامن میں ڈھانک رہے ہیں اور منکر اور بے دین کو — غفور رحیم کے حوالہ فرما رہے ہیں۔ سیدھا سادہ انداز تو یہ تھا کہ مومن میرا ہے اور منکر میرا نہیں ہے، میں اس سے بے تعلق ہوں، لیکن حضرت ابراہیمؑ کا عفو و کرم اس بات کے لئے تیار نہ ہوا کہ مجرموں کو اپنے سے دُور کر کے انھیں مایوس کر دیں، اس لئے ان گناہ گاروں کو اپنے مولیٰ کے حوالہ کر دیا اور یہ کہہ کر کہہ دیا کہ آپ غفور رحیم ہیں، آپ جانیں اور آپ کے یہ گناہ گار بندے جانیں۔

## حضرت عیسیٰؑ کا رحم و کرم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انہی رسولوں میں سے ہیں جن کے مزاج پر رحم و کرم اور محبت و پیار کا غلبہ تھا، قرآن کریم نے بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے روبرو جواب دیتے ہوئے گناہ گار بندوں کے متعلق فرمائیں گے۔

”اِنْ تُحَذِّرُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیَّارٌ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْغَنِیُّ الْحَكِیْمُ ۝  
”خداوند! اگر تو ان گناہ گاروں کو سزا دے گا تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں معاف

کر دے گا تو تو طاقت اور حکمت والا ہے۔“

سیدنا عیسیٰؑ یہ نہیں فرماتے — کہ اگر تو ان مجرموں کو سزا دے گا تو یقیناً یہ لوگ اس قابل ہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کے رحم و کرم کی شان کو نمایاں کر کے فرماتے ہیں کہ یہ تیرے بندے ہیں اور تو ان کا آقا ہے، تجھے اپنے بندوں پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے، میں ان کے معاملہ میں کیا دخل دے سکتا ہوں اور اگر تو انھیں معاف کر دے گا تو کون ہے جو تیرا ہاتھ پڑے اور کون ہے جو تیری مشیت و مصلحت میں دخل دے؟ — حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے جملوں میں ایک فرق یہ بھی بہت حکیمانہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے خدا تعالیٰ کو عزیز الحکیم کہا اور حضرت ابراہیمؑ نے غفور الرحیم — اس کی



وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا یہ کلام قیامت کے دن سے تعلق رکھتا ہے جہاں مشرکین کے لئے مغفرت کی کوئی گنجائش نہیں اور حضرت ابراہیمؑ کا جملہ دنیا سے تعلق رکھتا ہے، یہاں اس بات کا امکان موجود ہے کہ خدا تعالیٰ مشرکین کو ہدایت کی توفیق عطا کر کے انھیں مغفرت سے نواز دے۔  
خاص بندوں میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا کرنا

## خدا تعالیٰ کا رحم و کرم ہے

اپنی مخلوق پر خدا تعالیٰ کے رحم و کرم کی شان بھی بالکل نرالی ہے، اسی شانِ کریمی نے اس کے خاص بندوں میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا کیا ہے، رسولانِ کرام کے کردار پر خداوند قدوس کی شانِ کریمی کا عکس پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اندر رحم و کرم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لَبِثْتَ لَهُمْ (آل عمران: ۱۵۹) ————— ”یہ اسی خدا کی رحمت ہے کہ تم اے نبی! نرم دل واقع ہوئے ہو“

خدا تعالیٰ کی یہ شانِ کریمی قیامت کے دن کس طرح اپنے بندوں پر ظاہر ہوگی؟ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ بندوں سے سوال کرے گا کہ تم نے دنیا میں میری نافرمانی کیوں کی؟ تو اس سوال کا انداز عجیب و غریب ہوگا۔ وہ فرمائے گا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ مَا عَوَّلَيْتُمْ بِيَوْمِئِذٍ الْكَرِيمِ (سورہ انفطار: ۶) —————  
”اے انسان! تجھے ربِ کریم کے بارے میں کس نے بھروسہ میں ڈال دیا تھا؟“

امام رازیؒ اپنے تفسیری نکتہ میں فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے ساتھ کریم کی صفت لگا کر اپنے بندوں کو خود ہی جواب بھی سکھا دیا، یعنی بندوں کو بتایا کہ میرے سوال کے جواب میں کوئی اتنا شتاب بات نہ سے نہ نکالنا، بلکہ یہ کہہ دینا کہ اے خدا! تیری شانِ کریمی نے ہم گنہگاروں کو تیری طرف سے بھلا دے میں ڈال دیا، تیرے رحم و کرم کی وجہ سے ہم میں کچھ غفلت پیدا ہو گئی، ہم یہ سمجھے کہ تو رحیم و کریم ہے، غفار و ستار ہے۔ یہ جواب خدا تعالیٰ کی رحمت کو جوش میں لے آئے گا اور پھر وہ اپنے بندوں کے ساتھ رحم و کرم کی معاملہ کرے گا۔

# فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ

مکہ میں بنی خزاعہ اور بنی بکر دو قبیلوں کے درمیان جھگڑا شروع ہوا، قریش مکہ نے اس لڑائی میں بنی بکر کا ساتھ دیا اور اس کے مخالف قبیلے بنی خزاعہ کے آدمیوں کو حرمِ شریف کے اندر نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا، بنی خزاعہ مسلمانوں کا حلیف قبیلہ تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ کے ساتھ امن و حفاظت کا معاہدہ کر رکھا تھا، اس قبیلہ کے لوگوں نے قریش کا سفاکانہ ظلم و ستم دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو سردارانِ قریش کو سمجھایا اور انہیں ظلم و ستم سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب قریش مکہ ظلم و تشدد پر اڑے رہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مظلوم بنی خزاعہ کو قریش کے ظلم سے نجات دلانے کا فیصلہ کر لیا، کیونکہ آپ از روئے معاہدہ اس کے پابند تھے۔  
مدینہ سے روانگی:

اسلامی تاریخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام اپنے اندر اسلامی اخلاق و خرافات اور عفو و کرم کا بے مثال سبق رکھتا ہے، آپ دس ہزار پاکباز مسلمانوں کی جماعت لے کر دسویں رمضان المبارک کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے (فتح الباری ج ۸ ص ۲)

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قافلہ جب مکہ اور مدینہ کے درمیان الوداع کے مقام پر پہنچا تو آپ کو اپنے دو نہایت گستاخ دشمن مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے ملے، یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کرنے جا رہے تھے، ان میں سے ایک ابوسفیان بن حارث تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی اور نبوت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی دوستی بھی تھی۔

نبی ہونے کے بعد یہ ابوسفیان بن حارث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے اور آپ کی سبجوں میں اشعار کہنے لگے، حضرت حسان بن ثابتؓ ان کی جھوٹا جواب دیتے تھے۔

دوسرا آدمی عبداللہ بن امیہ تھا جو آپ کا پھوپھی زاد بھائی تھا، یہ شخص بھی آپ کا شدید مخالف تھا۔ یہ دونوں کٹر مخالف اسلام کا بڑھتا ہوا اثر دیکھ کر مسلمان ہونے کا فیصلہ کر کے گھر سے نکلے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راستہ میں مل گئے۔ ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کی اجازت طلب کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں نے سخت اذیت پہنچائی تھی، آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ آپ کی رفیقہ حیات حضرت اُم سلمہؓ اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں، انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ دیکھ کر ان دونوں کے لئے سفارش کی اور عرض کیا:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب آپ کے عفو و کرم سے کوئی شخص مُردم نہیں رہتا تو پھر یہ آپ کے چچا زاد اور پھوپھی زاد بھائی کیوں مُردم کئے جا رہے ہیں؟

ابوسفیان نے آگے بڑھ کر عرض کیا، اے رسول محترم! اگر آپ نے اپنی بارگاہِ رحمت میں مجھے حاضر ہونے کی اجازت نہ دی تو میں اپنے اس لڑکے جعفر کو ساتھ لے کر صحرائے عرب کی طرف نکل جاؤں گا اور وہیں بھوکا اور پیاسا مر جاؤں گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ، ابوسفیان کے یہ چند جملے سن کر اتر گیا اور دل موم ہو گیا اور ابوسفیان کو معاف فرما کر حاضری کی اجازت دی، ابوسفیانؓ نے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ ابوسفیان بن حارث کے خلاف آپ کا غصہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے ابوسفیان کو یہ تدبیر بتائی کہ ابوسفیان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کھڑے ہو کر وہی بات کہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا تھا اور وہ یہ ہے۔

مَا لِلّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (سورہ یوسف) ————— ”خدا کی قسم! لے بھائی! بے شک خدا تعالیٰ نے تم کو ہم سب پر بزرگی عطا فرمائی اور ہم سب خطاوار ہیں“

معتد

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو حضورؐ کے سامنے کھڑے ہونے کا مشورہ اس لئے دیا کہ علیؑ جانتے تھے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں بے حد شرم و حیا اور بے انتہاء لحاظ و مروت ہے، ابوسفیان جیسا دشمن بھی جب سامنے آئے گا تو آپ کے چہرہ انور کی حیا اور شرمگیزی آنکھیں آپ کے غصہ کے لئے حجاب بن جائیں گی اور آپ ابوسفیان کو معاف فرمائیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، چنانچہ جیسا انھوں نے کہا تھا اسی طرح پیش آیا، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کی زبان سے وہ آیت پاک سن کر اس کے جواب میں وہی کہا جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آپؐ نے فرمایا:

لَا تَزِرُ وَبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَکُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ (سورہ یوسف ۹۱)

”آج کے تم پر کوئی الزام اور ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کرے وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم نے ابوسفیان کے دل کی تمام دنیا بدل ڈالی اور جو دل اس وقت تک نفرت اور عناد کا نشین تھا، اس دل سے محبتِ رسول کے چشمے اُبھنے لگے۔ ابوسفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ تمام عمر آپؐ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی اور پوری زندگی آپؐ کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری میں گزاری۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ابوسفیان کے لئے جنت کی خوشخبری دی۔ (بیر المصطفیٰ ص ۲۶)

ابوسفیان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پھر بھی تڑا و بھائی عبد اللہ بن ابی امیہ کیا تھا بھی رحم و کرم کا برتاؤ کیا اور وہ بھی مشرف باسلام ہو گئے۔

ابوسفیان بن حرب پر رسول اکرمؐ کا رحم و کرم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قائد جب مراء النظران کے مقام پر پہنچا تو قریش کے مشہور سردار ابوسفیان بن حرب آپؐ کی خدمت میں لائے گئے۔

ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء، قریش کی طرف سے مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے نکلے



تھے، پھر ان پر پہنچ کر انھیں مسلمانوں کا عظیم قافلہ نظر آیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چکر داروں کی نظر بھی ان دونوں پر پڑ گئی اور انھوں نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا، حضرت عباسؓ اسی رات ادھر نکلے، رات کا وقت تھا، حضرت عباسؓ نے ابوسفیان کی آواز پہچان لی اور ابوسفیان سے کہا ————— ابوسفیان! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کا لشکر ہے آج قریش کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کر کے آپ سے امن طلب کر لیں، ابوسفیان نے کہا، عباسؓ! پھر اس کی کیا صورت ہو، حضرت عباس رضی نے کہا، تم میرے خچر پر سوار ہو جاؤ، میں تمہیں سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر چلتا ہوں اور تمہارے لئے امن حاصل کرتا ہوں۔

راستہ میں حضرت عمرؓ ملے اور ابوسفیان کو دیکھ کر جوش میں آ گئے اور بولے، ابوسفیان! خدا اور اس کے رسول کا دشمن ہے، یہ کسی عہد اور اقرار کے بغیر ہاتھ آ گیا ہے، حضرت عباسؓ نے عمرؓ کا جوش دیکھا اور اپنی سواری کو تیزی کے ساتھ آگے لے گئے، عمر فاروقؓ پیچھے تلوار سوتتے ہوئے چلتے رہے، یہاں تک کہ یہ سب لوگ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے، حضرت عمرؓ نے کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اجازت دیجئے، ابوسفیان کو ختم کر دوں، حضرت عباس رضی نے فوراً کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے انھیں اپنی پناہ دیدی ہے، حضرت عمرؓ اس کٹر دشمن اور مسلمانوں کے قاتل کو ختم کرتے کے لئے اپنے آقا کے اشارہ کا انتظار کرتے رہے۔

ابوسفیان کے معاملہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان کچھ تیزکامی بھی ہوئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نقشہ دیکھ کر حضرت عباس رضی سے کہا چچا جان! اس وقت ابوسفیان کو اپنے خیمہ میں لے جاؤ، صبح ہو جانے کے بعد انھیں پیش کرنا، حضرت عباسؓ نے حکم کی تعمیل کی، صبح ہوئی، حضرت عباسؓ نے ابوسفیان اور بدیل کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا ————— حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کو مخاطب کر کے فرمایا ابوسفیان!

مقدمہ

ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اُسے امن دیا جائے گا۔ ابوسفیان بولے حضور! صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں اتنی گنجائش نہیں کہ تمام لوگ اس میں سما سکیں، آپؐ نے فرمایا: اچھا، اعلان کر دو شخص مسجد حرام میں داخل ہوگا وہ بھی امن پائے گا، ابوسفیان نے پھر عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام بھی کافی نہیں، آپؐ نے فرمایا، اچھا، شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا اسے بھی امن عطا کیا جائے گا، ابوسفیان نے عرض کیا، ہاں، اس میں بہت گنجائش ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امن و سلامتی کا پیغام حاصل کر کے ابوسفیان فوراً مکہ روانہ ہو گئے اور مکہ میں آکر اعلان کر دیا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں، میری رائے یہ ہے کہ اب قریش کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کر لیں اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امن و سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

مکہ کے عوام نے یہ اعلان سنا اور سنتے ہی کوئی شخص مسجد حرام کی طرف بھاگا، اور کوئی اپنے گھر کی طرف دوڑا (سیرت المصطفیٰ ج ۳ ص ۷۰) داخلہ کے وقت خاکساری اور نیدگی:

حضرت عباسؓ نے ابوسفیانؓ سے کہا تھا کہ ابوسفیان! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آج جو کچھ ہے وہ سلطنت کی شوکت نہیں، نبوت کی عظمت ہے۔ حضرت عباسؓ نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا اور اس وقت وہ حقیقت آنکھوں کے سامنے نمودار ہو کر آگئی تھی۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن اخلاقِ کریمانہ کو سر بلند کرنا تھا، آج آپؐ اسی شان سے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مکہ میں داخل ہوئے اس وقت آپؐ کا سر اقدس تواضع سے جھکا ہوا تھا، حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت میں نے دیکھا کہ آپؐ اپنی ناقہ پر سوار ہیں اور خوش الحانی کے ساتھ سورۃ انا فتحنا لک فتحاً مبیناً کی تلاوت فرما رہے ہیں۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ فتح و کامرانی کی خوشی میں آپ کا سر اقدس خداوندِ عالم کی جناب میں جھکا ہوا تھا اور آپ کی ریش مبارک کجاوہ کی ٹکڑی سے مس کر رہی تھی اور آپ کے پیچھے آپ کے خادم زادہ حضرت اسامہ بن زید بیٹھے ہوئے تھے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک فاتح حکمراں ہوتے تو فتح و کامرانی کے اس موقع پر آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر غرور و تکبر کی شان طاری ہوتی مگر آپ اخلاق و روحانیت کے علم بردار تھے، اس لئے تواضع و عیدیت آپ کی ذات میں جلوہ گر ہوئی۔

مکہ میں داخل ہو کر سب سے پہلے آپ اپنی چچا زاد بہن ام ہانی بنت ابی طالب کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں غسل کر کے آپ نے آٹھ رکعتیں نماز کی ادا فرمائیں، یہ چاشت کا وقت تھا۔ علامہ اسلام اس نماز کو ”صلوۃ الفتح“ کہتے ہیں، سعد بن ابی وقاصؓ ایران کو فتح کر کے جب شاہ ایران کسریٰ کے محل میں داخل ہوئے تو انہوں نے بھی اپنی آٹھ رکعت نماز ایک سلام سے ادا فرمائی (بحوالہ روضہ الافاق ج ۲ ص ۲۷۳)۔

نماز سے فارغ ہو کر آپ اس مقام پر تشریف لائے جہاں آپ کی قوم نے تین سال تک آپ کو نظر بند کر رکھا تھا، اس مقام پر آپ کے لئے ایک خیمہ نصب کر دیا گیا تھا، یہ شعب ابی طالب یعنی وہ گھاٹی تھی جو ابی طالب کے نام سے موسوم تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قیام کے لئے اس جگہ کو اس لئے پسند فرمایا تاکہ اپنی مظلومیت کا پہلا دور آپ کے سامنے رہے اور آپ کے اندر فتح مندی کا غرور پیدا نہ ہونے

پائے (فتح الباری ج ۸ ص ۱۶)۔

**مسجد حرام میں داخلہ اور محرموں کی معافی:**

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں داخل ہوئے، خانہ کعبہ کا طواف فرمایا کعبہ کے اندر جا کر کعبہ کو مخلوق پرستی کے نشانات سے پاک کیا، پھر خدا کے سامنے سر جھکایا اور نماز ادا کی، باہر تشریف تو دیکھا کہ تمام مسجد حرام میں قریش کے چھوٹے بڑے لوگ گھڑے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں

یا معشر قریش! ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلیة وتعظمت بها الارباب، ان الله من ادم وادم من تراب، یا یہاں اس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکر مکم عند الله اتقاکم ان الله علیم خبیرہ۔۔۔۔۔ اے قریش کے لوگو! خدا تعالیٰ نے عہدِ جاہلیت کی نخوت اور تکبر اور باپ دادوں پر فخر کرنے کو باطل کر دیا ہے۔ سب لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے، خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک خدا تعالیٰ جاننے والا اور خبردار ہے۔“

اس کے بعد قریش کو مخاطب کر کے کہا: ————— یا معشوقِ قریش! ماترون! انی فاعل بکم ————— ”اے قریش تمہارا کیا خیال ہے، اب میں تمہارے ساتھ کیا کر نیوالا ہوں۔“ قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو نے کہا:

نقول خیراً و نطق خیراً اخ کریم و ابن اخ کریم و قد قدرت ————— ”ہم  
سب بھلائی کی بات کہتے ہیں اور بھلائی کا گمان رکھتے ہیں، آپ شریف و کریم بھلائی ہیں اور شریف  
بھلائی کے بیٹے (بھتیجے) ہیں اور بدلہ لینے کی قدرت بھی آپ کے پاس موجود ہے۔

”قَالَ قَانِي اَقُول لَكُمْ كَمَا قَالَ يُوْسُفُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِذْ هَبُوا فَاَنْتُمْ الطَّلَقَاءُ —  
 ”میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی، تم پر آج کوئی طاقت  
 نہیں، جاؤ! تم سب آزاد ہو“ (بحوالہ البدایہ ج ۴ ص ۳۰۰ و احباب ترجمہ سہیل بن عبد عمرو)





إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُوَدُّوا إِلَّا مَانَتْ إِلَىٰ أَهْلِهَا ————— ”اللہ تعالیٰ تمہیں  
حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کے سپرد کرو۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بیت اللہ شریف میں وحی نازل ہوئی  
اور آپ نے وحی الہی کی ہدایت کے مطابق بیت اللہ کی کنجی عثمان بن طلحہ کے سپرد کر دی اور  
حضرت عباسؓ کی درخواست کو نامنظور فرمادیا۔

ابن عباس اور محمد بن حنفیہ نے اس آیت کے تحت فرمایا ہے کہ یہ حکم نیک و بد (بر و فاجر)  
سب کے لئے عام ہے یعنی امانت نیک کی ہو یا بُرے آدمی کی، دونوں کو واپس کرنی ضروری  
ہے (ابن کثیر ج ۱ ص ۵۱۶ سورہ نساء)

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:  
عثمان! یہ کنجی میں نہیں، بلکہ میرا خدا تمہارے سپرد کر رہا ہے، اس لئے قیامت تک  
کوئی ظالم تم سے یہ کنجی نہ چھین سکے گا، یعنی یہ عہدہ ہمیشہ تمہارے خاندان میں رہے گا۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۱۵)

دنیا کی تاریخ ایسے فاتح اور غالب کی مثال پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گی جس نے  
سیاسی فتح مندی کے بعد جانی دشمنوں کو اس طرح معاف کر دیا ہو اور ان سے ان کا کوئی  
اعزاز نہ چھینا ہو، بلکہ مغلوب ہو جانے کے بعد بھی مفتوح دشمنوں کو ان کے سابق اعزاز و  
اکرام پر قائم رہنے دیا ہو، آج اس واقعہ کو تیرہ سو برس گزر گئے مگر کعبہ کی کلید برداری  
کا عہدہ از عثمان ہی کے خاندان میں موجود ہے۔

فاتح حکمران ملکہ بلقیس کی نظر میں:

قرآن کریم نے حضرت سلیمانؑ کے عہد کی مشہور ملکہ ”بلقیس“ کا تذکرہ کرتے ہوئے  
فاتح اور غالب حکمران کے بارے میں اس کا قول نقل کیا ہے واقعہ اس طرح پیش آیا کہ حضرت  
سلیمانؑ نے بلقیس کے پاس توحید حق کا پیغام بھیجا، یہ مخلوق پرست قوم کی بادشاہ تھی، پیغام

پھر اس نے اپنے ارکانِ حکومت کو طلب کیا۔

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتَوْنِي فِي أَمْرِي مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّى تَشْهَدُونَهُ

”اور کہا، اے سردارانِ قوم! میرے معاملہ میں مجھے مشورہ دو، میں کسی بات کو قطعاً نہیں کرتی، جب تک کہ تم لوگ حاضر نہیں ہوتے۔“

قَالُوا نَحْنُ أَوْلَىٰ قُوَّةٍ وَأَوْلُوا أَبَاسٍ شَدِيدٍ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانْظُرِي مَاذَا تَأْمُرِينَ

”وہ بولے، ہم بڑے طاقتور ہیں اور سخت جنگجو ہیں اور اختیار تیرے انھیں ہے، پس تو غور کر، جو حکم دے۔“

قَالَتِ إِنَّ أَسْلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَيْمَنَةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ (النحس: ۳۴)

”وہ بولے، بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں

(غالب ہو کر) داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کر دیتے ہیں اور اس کے باعزت باشندوں کو ذلیل

کر دیتے ہیں، اور یہ ایسا ہی کچھ کریں گے۔

پھر اس نے حضرت سلیمانؑ کو خوش کرنے کے لئے قیمتی تحائف بھیجے، مگر سلیمانؑ نے قاصد

سے کہا: — اَرْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأَيِّبَهُمْ بِجُنُودٍ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ

مِنْهَا أَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ۔ ”واپس جاؤ ان کے پاس، ہم اپنے لشکر

کے ساتھ ان کے پاس پہنچتے ہیں، جس کا مقابلہ ان سے نہیں ہو سکتا اور ہم انھیں دہلے سے

نکال دیں گے ذلیل کر کے اور وہ مغلوب ہوں گے۔“ (النمل: ۲۷)

بلقیس نے فاتح حکمرانوں کے بارے میں جو کچھ کہا وہ دنیوی بادشاہوں کی بات تھی مگر حضرت

سلیمانؑ تو ایک رسولِ نبی بھی تھے، سلیمانؑ نے قاصد کو جن الفاظ میں دھمکی دی، وہ بظاہر ایک

رسول کی شایانِ شان معلوم نہیں ہوتی، حضرت شاہ عبد القادر صاحبِ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات

کو محسوس کیا اور اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

”اور کسی پیغمبر نے اس طرح کی بات نہیں فرمائی، سلیمانؑ کو حق تعالیٰ کی سلطنت کا زور تھا

جو یہ فرمایا: ”(حامل مولانا عثمانی ص ۷۹۲)

شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ایک رسول کسی دشمن پر غالب ہو کر ایسی کارروائی نہیں کرتا، جس کی دھمکی حضرت سلیمانؑ نے دی، حضرت سلیمانؑ نے جو کچھ کہا وہ دراصل ملک سہار کے سرداروں کے مفروضہ قول کا جواب تھا، طاقت کے جواب میں سلیمانؑ نے طاقت کی زبان استعمال کی، تاکہ وہ اس دھمکی سے مرعوب ہو کر شرک و کفر کی راہ چھوڑ دیں۔

حضرت سلیمانؑ جانتے تھے کہ اس دھمکی پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ملک بلقیس نے سلیمانؑ کے پاس حاضر ہو کر کہا:

وَأُوتِينَا النِّعْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ————— ”اور ہم تو اس سے پہلے

ہی جان چکے تھے اور آپ کے فرمانبردار بن چکے تھے“ (الفحل)  
حاصل یہ ہے کہ ایک رسول و نبی کی شان سیاسی حکمرانوں سے مختلف ہوتی ہے، سیاسی حکمران مغلوب قوم پر قتل و غارت گری کرتے ہیں اور خدا کے رسول و نبی کمزوروں پر رحم و کرم کی بارش کرتے ہیں۔

فتح مکہ کے موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کریمانہ سلوک اس کی شاندار مثال ہے۔

کعبہ پر اذان، ابو مخذورہ پر شفقت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال حبشیؓ کو حکم دیا کہ کعبہ پر چڑھ کر اذان دو، بلالؓ نے اذان دی، ابو مخذورہ اور اس کے ساتھ چند لڑکوں نے اذان کا مذاق اڑایا اور بلالؓ کی نقل اُتارنے لگے، ابو مخذورہ بہت خوش آواز تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آواز سن لی تھی، اذان کے بعد آپؐ نے ان مذاق اڑانے والے لڑکوں کو بلایا اور ان سے پوچھا، وہ آواز کس کی تھی، لڑکوں نے ابو مخذورہ کی طرف اشارہ کیا، ابو مخذورہ حضور کے سامنے پیش کئے گئے اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب میں قتل کر دیا جاؤں گا، لیکن خلقِ عظیم والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو مخذورہ سے کہا ہاں، میاں! اب کہو، تم کیا کہہ رہے تھے، ابو مخذورہ نے اذان کے



کلمات دہرا دیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں درہمہوں کی ایک تھیل عطا فرمائی اور ان کے سر اور  
پیشانی پر اپنا دست مبارک پھیرا اور یہ دُعا دی بَارَكَ اللهُ فَيْتَ وَبَارَكَ اللهُ عَلَيْهِ  
”ہذا تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت اور برکت سے نوازے“

ابو محمد زہد کا بیان ہے کہ میرے سر پہ آپؐ نے ہاتھ پھیرا اور فوراً میرے دل سے آپؐ کی  
نفرت نکل گئی اور اس کی جگہ میرا دل آپؐ کی محبت سے بھر بیڑ ہو گیا، اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
سے درخواست کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ مجھے مکہ کا موزن مقرر کر دیجئے، آپؐ نے انکی درخواست  
منظور کر لی اور ابو محمد زہد تمام عمر مسجد حرام کے موزن رہے، ابو محمد زہد کے بعد ان کی اولاد دراولاً  
نیک یہ منصب قائم رہا (سیرت المطلق ج ۱ ص ۷۹)  
تمامہ بن آخال پر رحم و کرم:

تمامہ بن آخال بنی حنیفہ کا سردار تھا، ایک لڑائی میں یہ گرفتار ہو کر آیا، مسلمانوں نے اسے  
مسجد کے ستون سے باندھ دیا، تاکہ مسلمانوں کی نماز اور بارگاہ الہی میں مسلمانوں کے عجز و نیاز کا منظر  
دیکھ کر اس کے دل کی سختی دُور ہو جائے اور حق سے نفرت کا جذبہ محبت میں بدل جائے، چنانچہ جب نماز  
کا وقت آیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے پاس سے گذرے اور اس سے فرمایا، تمامہ!  
میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ تمامہ نے جواب دیا،

عندی خیر یا محمد! ان تقتل تقتل ذادیم وان تنعم تنعم علی شاکر وان  
کنتم ترید المال فسل منہ ما شئتم۔۔۔۔۔ ”اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس  
خیر ہے اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایک بیش قیمت جان کو قتل کریں گے اور اگر انعام فرمائیں گے  
تو ایک شکر گزار پر انعام فرمائیں گے اور اگر مال درکار ہو تو جتنا چاہیں حاضر کر دوں“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمامہ کی بات سن کر خاموش ہو گئے، دوسرے دن پھر آجھنے اس  
غلام ہر دار سے پوچھا تو اس نے صرف اتنا کہا:

”اگر آپؐ رحم و کرم فرمائیں تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا“۔۔۔۔۔ آپؐ پھر خاموشی سے گذر گئے۔

تیسرے روز پھر آپ نے پڑھا تو اُس نے دوسرے روز کا جلد دہرا دیا۔۔۔۔۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عفو و کرم کو اعلان فرما دیا اور تمام کو آزاد کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

قَدْ عَفَوْتُ عَنْكَ يَا ثَمَامَةَ وَاعْتَقْتُكَ۔۔۔۔۔ ”اے ثامہ! میں نے تجھے معاف کیا اور آزاد کیا“

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثامہ پر مذہب قبول کرنے کے لئے وباؤ ڈالا، ذکری قسم کا لالچ دے کر اسے مسلمان ہونے پر آمادہ کیا، بلکہ بغیر کسی شرط کے اسے معاف کر دیا۔

ثامہ پر آپ کے اخلاقِ کریمانہ کا اتنا اثر پڑا کہ وہ مسجد نبوی کے قریب ایک باغ میں گیا اور وہاں نہاد ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔

ثامہؓ مسلمان ہو کر مکہ آیا، مکہ والوں نے اسے بے دین قرار دے کر بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اس نے غصہ میں آکر یہ اعلان کر دیا کہ میں اپنی بستی یمامہ سے تمہارے پاس غلہ نہیں آنے دوں گا۔

مکہ والوں کا گزارہ یمامہ سے آنے والے اناج پر ہوتا تھا، چنانچہ اناج بند ہو جانے سے مکہ میں قحط پڑ گیا۔

مکہ والوں نے پریشان ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملکا کہ ہم اپنی رشتہ داری کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ثامہؓ کو حکم بھیج دیں کہ حسب دستور یمامہ سے غلہ کی آمد شروع ہو جائے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں پر رحم فرمایا اور ان کے ظالمانہ رویہ کے باوجود ان کے لئے یمامہ سے غلہ بھجوانا شروع کر دیا (فتح الباری ج ۸ ص ۶۸)

مکہ میں قحط اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رحم و کرم:

ادھر مکہ کے جس قحط کا ذکر کیا گیا ہے، قرآنِ کریم کی سورہ دُخان پارہ ۲۵ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مفسرین نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مکہ والوں کے ظلم و تشدد نے انتہائی سنگینی اور درندگی کی شکل اختیار کر لی تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ ان لوگوں کو قحط کی آزمائش میں ڈال کر انہیں ایک تنبیہ کر دے، شاید یہ

وگ اس آسمانی تنبیہ سے ڈر کر اپنے ظلم و تشدد سے باز آجائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ يَغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ أَتَى لَهُمُ الذِّكْرَى وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلِّمٌ مِّثْلُ نَحْنٍ إِنَّا كَا شِفُوا الْعَذَابَ قَلِيلًا أَنْكُمْ عَائِدُونَ يَوْمَ نَبْطِئُ الْبَاسَةَ الْأَكْبَرَى إِنَّا مُنْتَقِمُونَ۔

”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، تم اس دن کا انتظار کرو جب آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں نمودار ہو اور وہ ان مکہ والوں کے لئے ایک تکلیف دہ سزا ہوگی اس وقت یہ کہیں گے، اے پروردگار! ہم سے اس تکلیف کو دور کر دے، ہم تیرے نبی کی صداقت کو تسلیم کر لیں گے۔ لیکن ان لوگوں کو نصیحت کب ہو سکتی ہے؟ ان کے پاس تو ایک ظاہر اور کھلی شان کا نبی آیا اور انھوں نے اب تک اس سے اعراض کیا، اور یہی کہتے رہے کہ شیخ جس تو دوسروں کا پڑھایا ہوا ایک دیوانہ ہے، اے مکہ والو! ہم تمھاری درخواست پر اس سزا کو دور کر دیں گے، تھوڑی مدت کے لئے، مگر تم پھر اپنی پہلی حالت (نافرمانی) پر لوٹ آؤ گے، پھر اس عہد شکنی کے بعد ہم جب (قیامت کے) دن ایک شدید گرفت میں پکڑیں گے تو اس روز ان کی مسلسل نافرمانیوں کا بدلہ لیں گے۔“

قرآن کریم کی اس پیشین گوئی کے مطابق مکہ والوں کی آزمائش شروع ہوئی، ایک طرف اس رگبتانی علاقہ میں جو تھوڑی بہت بارش ہوتی تھی وہ بند ہو گئی دوسری طرف پیام کے سردار شامہ نے پیام سے آنے والا فائدہ روک دیا۔

اس قحط سے مکہ میں عجبک چھیل گئی اور عجبک کی شدت سے لوگوں کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا، اور آسمان کی طرف بھی اٹھیں دھواں سا نظر آنے لگا۔

اس شدید پریشانی سے تنگ آکر قریش کے سردار ابوسفیان نے دوسرے سرداروں کو ساتھ لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داری کا واسطہ دے کر رحم و کرم کی درخواست کی اور عرض کیا، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم، آپ تو اپنے آپ کو رحمتہ للعالمین کہتے ہیں، حالانکہ آپ کی قوم قحط

اور خشک سالی سے تباہ ہو رہی ہے، ہم آپ کو قرابت داری کا واسطہ دے کر آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں، اگر آپ کی دعا سے یہ قحط دور ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ظالموں کی تنگ حالی دیکھ کر ان پر ترس آگیا اور آپ نے مکہ والوں کے لئے جس آزمائش کی دعا کی تھی اس کا مقصد بھی بس اتنا ہی تھا، اس لئے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے دعا کی اور خدا تعالیٰ نے آپ کی دعا سے صحراے حجاز میں بارانِ رحمت شروع کر دی۔

اسی کے ساتھ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اثال کو پیامہ سے غلہ بھیجنے کی ہدایت فرمادی اور اس طرح مکہ والے قحط کی مزا سے بچا لئے گئے۔

لیکن مکہ والوں نے اس آزمائش سے کوئی سبق نہ سیکھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا یہ اہم واقعہ بھی ان کے دلوں کی سختی کو نہ توڑ سکا، ابوسفیان جو حق کو تسلیم کر نیکا وعدہ کر کے گیا تھا، اس سے پھر گیا اور قرآن کریم نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہو گئی۔

علامہ محمود آلوسی بندادی نے روح المعانی میں سورہ دخان کی تفسیر کرتے ہوئے یہ تمام حالات بیان کئے ہیں اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ج ۲ ص ۱۳۸ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان نقل کیا ہے جس میں ابن مسعود نے سورہ دخان کی آیات بالا کی تشریح کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ جو لوگ ان آیات کا تعلق علاماتِ قیامت سے قائم کرتے ہیں ان کی رائے صحیح نہیں ہے بلکہ ان آیات کا تعلق مکہ معظمہ کے اس قحط سے ہے جو تنبیہ کے طور پر ان پر مسلط کیا گیا تھا اور خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کو ان دشمنوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر واضح کر کے ان پر اتمامِ حجت کی تھی۔

حافظ ابن کثیر نے سورہ مومنون (ج ۲، مہری ص ۲۵۲) میں حضرت ابن عباس سے بھی یہی بیان نقل کیا ہے، فرماتے ہیں۔

جاء ابوسفیان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال یا محمد! انشدک اللہ



والرحم، فقد اكلنا العلمين يعني الويد والدم۔۔۔۔۔ ”ابوسفیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو اللہ اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، ہم لوگ بھوک سے تنگ آکر خون اور نجاست کھانے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بعض اردو تفسیروں اور تاریخوں میں مکہ معظمہ کے قحط کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے لئے یہ بد دعا فرمائی حالانکہ حضور اکرم نے جو الفاظ فرمائے وہ حسب ذیل ہیں، ابن کثیر نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الہی میں عرض کیا۔

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلَيْهِمْ بِسَبْعِ كَسْبَعِ يُوسُفَ۔۔۔۔۔ ”الہی قریش کے مقابل میں میری مدد فرما، ایسے سات سالوں کے ذریعہ جیسے سات سال حضرت یوسف کے عہد میں مصر والوں کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب واضح ہے کہ آپ مکہ والوں کے حق میں خشک سالی کے وہ حالات چاہتے تھے جو عمر بنی حضرت یوسفؑ کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت یوسفؑ کی دانش مندی اور جذبہ خدمت کے ذریعہ ان سات سالوں کی خشک سالی کی تکلیف سے مصر والے محفوظ رہے تھے، آج بھی یہی چاہتے تھے کہ مکہ کے ستم گاروں پر خشک سالی کی حالت طاری ہو اور پھر وہ لوگ اس سے تنگ آکر نبی صادق کی طرف رجوع کریں اور خدا کا رسول ان کے حق میں دعا کرے اور مکہ والے بغیر کسی شدید مصیبت میں گرفتار نہ ہوں اس امتحان سے نجات پالیں اور پھر خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان سے متاثر ہو کر انکار و ظلم کی لعنت سے توبہ لیں۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی درخواست میں یہ نہیں فرمایا کہ قریش مکہ کو ہلاک کر دے بلکہ یہ فرمایا کہ خداوند! میری مدد فرما قریش کے مقابلہ میں (البتہ)

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قحط کا آغاز ہوتے ہی سردارانِ قریش کی درخواست پر دعا کے لئے اٹھ اٹھادیئے اور خدا تعالیٰ نے بھی فوراً آپ کی دعا قریش کے حق میں قبول فرمائی، حالانکہ خدا تعالیٰ کے علم میں تھا کہ قریش مکہ اس قحط سے نجات پا کر بھی اپنے ظلم و فساد سے باز نہیں آئیں گے،

مگر خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرما کر قریش پر ایک مرتبہ پھر تمام محبت کر دیا۔ حاصل یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو قریش کے لئے ہلاکت کی بددعا نہیں کہا جاسکتا بلکہ سرکشی سے باز رکھنے کے لئے آزمائش میں ڈالنے کی درخواست کہا جاسکتا ہے، جس آزمائش میں قریش مکہ ناکام ثابت ہوئے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ (ترجمہ اُردو مطبوعہ حیدرآباد ص ۳۹۴) میں بحوالہ بیہقی عن ابن مسعودؓ مذکور روایت کے سلسلہ میں یہ جملہ بھی نقل کیا ہے کہ جب ابوسفیان کی درخواست پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ الہی میں مکہ معظمہ کے لئے بارانِ رحمت کی دعا کی تو اس دعا کے بعد سات سال تک مکہ میں بارش کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ حق میں یہ درخواست کرنی پڑی۔

اللَّهُمَّ حَرِّ الْيَمَّنَا لَا عَلَيْنَا ————— ”خداوند! چاروں طرف برے ہم پر نہ برے“  
اس دعا کے بعد بارش کا سلسلہ ختم ہوا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے تھوڑے عرصہ کی خشک سالی کے بعد سات سال تک بارش ہوتی رہی جس نے تمام صحرائے حجاز کو شاداب کر دیا۔  
حملہ آور قاتل پر رحم و کرم :

حضرت جابرؓ اور حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض دشمنوں نے ایک دہقان (غوث ابن حوث) کو آپؐ کے قتل کرنے کے لئے بھیجا، شیخس موقعہ کی تلاش میں رہا اتفاق سے ایک سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سایہ دار درخت کے نیچے دوپہر کے وقت آرام فرما رہے تھے اور آپؐ کے صحابہ ادھر ادھر درختوں کے سایے میں آرام کر رہے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار درخت کے اوپر لٹکادی تھی۔ اس حالت میں یہ اعرابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور درخت میں سے آپؐ کی تلوار اُتار کر آپؐ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، اور آپؐ کے سامنے آکر بولا: ————— مَنْ يَسْنَعُ مِثْقَى ————— ”آپؐ کو مجھ سے کون بچائیگا؟“

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ“ بچائے گا۔

غوث نے تین دفعہ آپ کو لٹکارا اور آپ نے ہر دفعہ فرمایا، اللہ مجھے بچائے گا تیسری

دفعہ جب آپ نے کہا ”اللہ“ تو غوث کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔

حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً صحابہ کرام کو آواز دی، صحابہ کرام جمع ہو گئے۔ غوث

آپ کے پہلو میں کھڑا تھا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غوث کو چھوڑ دیا اور اس سے

کسی قسم کا انتقام نہیں لیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے

وَ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْا اَيْدِيَهُمْ فَاَنْقَضَتْ

اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (مائدہ)۔ خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب کچھ لوگوں نے تم پر ہاتھ

پھرنے کا ارادہ کیا تو خدا تعالیٰ نے ان کا ہاتھ روک دیا۔ (ابن کثیر ج ۲، ص ۳۱)

محمد بن کعب قرظی نے ایک واقعہ اسی قسم کا اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دشمن نے کسی سفر

میں درخت کے نیچے آرام کرتے ہوئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تلوار سے حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ آپ کو اب مجھ سے کون بچائے گا، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ”اللہ تعالیٰ“۔ یہ سن کر اس اعرابی کے ہاتھ کا پینے لگے اور اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی

اور اس کا سر درخت سے ٹکرا گیا اور اس کا بھیجا نکل گیا۔ (وضرب براسہ الشجرۃ حتی انشردماغہ)

اس پر یہ آیت پاک نازل ہوئی۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ خدا تعالیٰ اے رسول! تمہاری حفاظت کرے گا۔

جابر بن عبد اللہ انصاری نے ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک غزوہ میں حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کنز میں پیر لٹکا لئے رونق افروز تھے، اس حالت میں قبیلہ بنی بنجار کے ایک شخص حارث نے

آپ کو دیکھ لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے آسمانوں، وہ بولے

کہوں کہ قتل کرے گا، یہ بولا، میں ان سے تلوار مانگ لوں گا اور پھر قتل کر دوں گا۔

یہ پروگرام بنا کر حارث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے کہا:

یا محمد ! اَعْطِنِي سَيْفًا اُشِيْمُهُ۔۔۔۔۔ ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ! مجھے

اپنی تلوار دینا، میں اسے نیام میں ڈال دوں“۔۔۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار اسے دیدی۔

حارث نے تلوار ہاتھ میں لے تولی مگر فوراً ہی اس کے ہاتھ کا پینے لگے، یہاں تک کہ

اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حَالُ اللَّهِ بَيْنَتْ وَبَيْنَ مَا تَرِيدُ۔۔۔۔۔ ”حارث ! تیرے اور تیرے بُرے ارادوں

کے درمیان خدا حائل ہو گیا“ (ابن کثیر ج ۲، ص ۷۹)

امام غزالیؒ نے ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ ذات الرقاع

سے واپس آرہے تھے کہ کسی مقام پر آپؐ نے آرام فرمایا، صحابہ کہہ ام بھی اپنی اپنی جگہ سو گئے۔

اس موقع پر ایک دشمن تلوار مسرت کر آپؐ کے سر پر کھڑا ہو گیا اور بولا مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي؟

۔۔۔۔۔ ”تم کو مجھ سے کون بچائے گا؟“۔۔۔۔۔ آپؐ نے فرمایا اللہ۔۔۔۔۔ یہ سن کر

اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پکڑ لیا، اور پھر اس سے پوچھا

اب تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ وہ بولا: كُنْ خَيْرًا خَيْرًا۔۔۔۔۔ تم بہتر کھڑے والے

ہو جاؤ! آپؐ نے فرمایا۔۔۔۔۔ قُلْ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنْي رَسُوْلُ اللّٰهِ۔۔۔۔۔

اقرار کر لے تو حید الہی اور میری رسالت کا۔ وہ بولا، نہیں، ایمان نہیں لاؤں گا، ہاں، نہ ہی آپؐ

مقابلہ کروں گا، اور نہ لڑنے والوں کا ساتھ دوں گا یعنی غیر جانبدار رہوں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھوڑ دیا، پھر یہ شخص اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور کہا:

جِشْتَكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ۔۔۔۔۔ ”میں تو اس شخص کے پاس سے آیا ہوں جو تمام لوگوں

سے بہتر ہے“ (احیاء العلوم ج ۲ ص ۳۳۵ و فتح الباری ج ۳ ص ۱۲۷)

میدان حنین میں شیبہ پر رحم و کرم:

شیبہ بن عثمان کا بیان ہے کہ میدان حنین میں میں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں



دیکھا کہ آپ تنہا کھڑے ہیں اور آپ کے ساتھیوں کے پیرا کھڑ چکے ہیں، اس وقت میری نیت خراب ہوئی اور میں آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آپ کی طرف نپکا۔

پہلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف گیا تو اس طرف حضرت عباسؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا پایا، میں نے دل میں کہا: یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، یہ بھتیجے کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دیں گے۔ پھر میں بائیں طرف گیا تو ادھر ابوسفیان بن حارث کو کھڑا پایا میں نے انہیں دیکھ کر اپنے جی میں کہا، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی ہیں، یہ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لئے پوری طاقت لگا دیں گے، پھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آیا اور آپ کے عقب کو خالی پا کر آپ پر تلوار کا وار کرنا چاہا۔

اِذْ رَفَعَ لِي سُوَاطًا مِّنْ نَّارٍ بَيْنِي وَبَيْنَهُ كَانَتْ بَرَقَ فَخْفَتِي اَنْ يَغْشَىٰ  
فَوَضَعَتْ يَدِي عَلَىٰ بَصَرِي ————— ”پس اچانک آگ کا ایک شعلہ مجھے بلند ہوتا  
نظر آیا گویا کہ ایک بجلی کو ندی، پس میں ڈرا کہ کہیں مجھے مجلس نہ دے اور میں نے ڈر کر اپنی آنکھوں  
پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور پھر میں پیچھے ہٹ گیا، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وقت  
احساس ہو گیا اور آپ نے مُڑ کر مجھے دیکھا اور مجھے آواز دے کر کہا:

يَا شَيْبَةَ يَا شَيْبَةَ اَدْنِ مَتَىٰ اَللّٰهُمَّ اَذْهَبْ عَنْهُ الشَّيْطَانُ ————— ”اے شیبہ، اے  
شیبہ، میرے قریب آ، الہی! شیبہ کے اندر سے شیطان کو دور کر دے۔“  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر میں نے آپ کی طرف دیکھا:

وَلَهُوَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ سَمْعِي وَبَصَرِي ————— ”تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے  
نزدیک میری آنکھوں اور میرے کانوں سے بھی زیادہ محبوب تھے۔“

مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی نظر محبت اور نگاہِ کرم نے میرے دل کی دنیا  
بدل دی اور آپ پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔

یہ روایت امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے امام بیہقی نے

مصعب بن شیبہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیبہ کے سینہ پر ہاتھ مارا اور تین دفعہ دعا ر دے کر فرمایا۔۔۔ اللّٰهُمَّ اَهْدِ شَيْبَةَ۔۔۔ ”الہی! شیبہ کو ہدایت فرما“ شیبہ کہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کے بعد میرے سینہ میں آپ سے زیادہ کسی دوسرے کی محبت نہ تھی (ابی کثیر سورہ توبہ ج ۲ ص ۳۲۵)

### حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی پر لطف و کرم:

قریش کے مشہور سردار جبیر بن مطعم کے غلام ”وحشی“ نے اُحد کے معرکہ میں حضرت حمزہؓ کو شہید کیا، مگر غلط فہم ہونے کے بعد یہ وحشی قتل کئے جانے کے خوف سے طائف چلا گیا، طائف والوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد وحشی کا بیان ہے کہ میں شام یا یمن کی طرف بھاگنے کی بات سوچنے لگا اور مجھ پر خدا کی زمین تنگ ہونے لگی۔

میں اسی پریشانی کے عالم میں تھا کہ ایک شخص مجھ سے بولا:

و یحک الله ما یقتل احدا من الناس دخل فی دینہ و تشہد بشہادتہ۔۔۔ ”تجھ پر افسوس! وہ شخص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کسی کو قتل نہیں کرتا جو اس کے دین میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے رسول ہونے کی گواہی دیتا ہے“

یہ خوشخبری سن کر میں سیدھا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا اور آپؐ کے پیچھے کھڑا ہو گیا تاکہ کلمہ شہادت کا اعلان کر دوں، آپؐ نے فوراً مجھے دیکھ لیا اور کسی طرح پہچان لیا، پھر فرمایا:

اَوْحَشِي؟ قُلْتُ نَعَمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ اَقْعِدْ فَاُخْذُ شَيْءًا كَيْفَ قُلْتُمْ حَمْرَةَ فَاُخْذُ شَيْءًا، فَلَمَّا فُرِغَتْ مِنْ حَدِيثِي قَالَ وَيْحْتُ! غَتِيبَ عَنِّي وَجْهَكَ فَلَا اَدْنِيكَ۔۔۔ ”کیا تو وحشی ہے؟ میں نے کہا، جی ہاں فرمایا، بیٹھ جا اور جس طرح تو نے چچا حمزہؓ کو قتل کیا تھا، اس کی کیفیت بیان کر، میں نے ساری کیفیت بیان کی، پھر آپؐ نے فرمایا: افسوس! وحشی بس تو مجھ سے اپنا چہرہ چھپا لے، وحشی کا بیان ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک آپؐ کی

خدمت میں حاضر نہیں ہوا (سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۷۶)

غور کرو! یہ محبوب چچا کا قاتل ہے، حمزہؓ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بہادر چچا تھے۔  
دودھ شریک بھائی بھی تھے، چچا کی دردناک شہادت پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد رنج ہوا  
تھا اور آج آپؐ ان کے قاتل سے انتقام لینا چاہتے تو لے سکتے تھے، پھر وحشی ایک غلام تھا کوئی  
آزاد خانہ انی عرب نہ تھا، اس کے آقا نے حمزہؓ کے قتل کرنے کے بعد اسے آزاد کر دیا تھا، اس لئے  
اب کوئی اس کا یار و مددگار نہ تھا۔

پھر ہر مسلمان آرزو مند تھا کہ عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قاتل کا سر میں اپنے ہاتھ سے قلم کر کے  
اپنے آقا کو خوش کروں۔۔۔۔۔ لیکن رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر لطف و کرم فرماتے ہیں  
اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں اپنے پیارے چچا کی دردناک شہادت کو بھولا نہیں ہوں۔  
بھول جاتا تو معاف کرنے میں کیا کمال ہوتا۔۔۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے منہ  
سے دہ داستان پھر سنتے ہیں، اپنے زخموں کو تازہ کرتے ہیں اور پھر اسے عفو و کرم سے نوازتے  
ہیں اور صرف یہ خواہش کرتے ہیں کہ مجھ سے اپنا چہرہ چھپا لے۔

ظاہر ہے کہ سرد در عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں ایک حساس اور درد مند دل تھا، ایک  
شریف فطرت تھی، اگرچہ آپؐ حکم الہی کے تحت وحشی کو معاف فرماتے ہیں، لیکن عزیز دل درد مندوں  
کی تکلیفوں کو یاد کرنے والی فطرت کو بدلتا، آپؐ کے بس کی بات نہ تھی، وحشی جب آپؐ کے  
سامنے آتا، آپؐ کے زخم ہرے ہو جاتے، اس سے آپؐ کو تکلیف ہوتی اور وحشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم  
کو اذیت پہنچانے کا گناہ کماتا رہتا، اس بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواہش کی۔۔۔۔۔  
وحشی اپنے محسن آقاؐ کا حکم سن کر چلا آیا، وہ سچا مومن بن گیا تھا، یہ دُعا کرتا رہا کہ خدایا! مجھ سے  
کوئی ایسی نیکی کو ادا دے جس سے میں آخرت میں اپنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرخرو ہو کر جاؤں  
اس کی دعا قبول ہوئی، نبوت کا بھوٹا مدعی مسیحاؑ اسی کے ہاتھ سے مارا گیا، بدترین دشمن نبوت کو انہی  
ہاتھوں سے قتل کیا جن سے ایک محبوب نبوت قتل ہوئے تھے۔۔۔۔۔ وحشی سرخرو ہو گیا۔

ہندہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور مہربانی :

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مکہ کے لوگوں نے اسلام کی بیعت کرنی شروع کی مردوں کے بعد عورتیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، ان عورتوں میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری باتوں کے ساتھ جب ان سے اس بات کا عہد لیا کہ اُنہو تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا تو ہندہ بولیں۔۔۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ! ہم نے جس اولاد کو پالا پوسا، آپ نے اسے بدر کے میدان میں قتل کر دیا۔۔۔۔۔ پس آپ جانیں اور وہ جانیں۔۔۔۔۔ ہندہ عورت تھیں، اپنی فطرت کے مطابق انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر کے معرکہ کا طعنہ دیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت موجود تھے، وہ سنس پڑے، پھر آپ نے ہندہ سے عہد لیا کہ کسی پر بہتان نہ باندھنا۔۔۔۔۔ ہندہ بولیں۔۔۔۔۔ دما تاملوا لا بالوشد و مکارم الاخلاق۔۔۔۔۔ ”خدا کی قسم! آپ ہمیں بھلائی اور بلند اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں“

ہندہ نے حاضری کے وقت اپنے چہرہ پر نقاب ڈال رکھی تھی اور شرم کی رصہ سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا، کیونکہ ہندہ وہ ستاک خاتون تھیں جنہوں نے آپ کے پیارے چچا کو قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے ان کا کلیجہ چبایا تھا، لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس سنگین جرم کو نظر انداز کر کے ان پر غفور و کرم فرمایا اور ان کے حق میں دعا فرمائی۔

امام بخاریؒ نے بیعت کے بعد ہندہ کی جو گفتگو نقل کی ہے وہ یہ ہے: ما کان علی ظہر الارض من اهل خباء احب الی ان بد تو امن اهل خباءك ثم ما اصبح الیوم علی ظہر الارض اهل خباء احب الی ان یعزوا من اهل خباءك قال ایضا والذی نفسی ببیدہ (بخاری شریف ص ۵۲۹)۔۔۔۔۔ ”یعنی روئے زمین کے تمام خیمہ والوں میں (تمام کنبہ والوں میں) آپ کے کنبہ والے تھے جن سے مجھے سب سے زیادہ بغض تھا اور میری یہ تمنا رہا کرتی تھی کہ وہ ذلیل ہوں اب یہ جذبہ بدل گیا، اب روئے زمین کے تمام خاندانوں میں سب سے زیادہ عزیز خاندان جس کے متعلق میری سب سے زیادہ تمنا یہ ہے کہ ان کی عزت ہو اور ان کی عظمت بڑھے وہ آپ کا



فانذ ان ہے۔ ہندہ کے جواب میں رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا۔  
 وايضاً والذي نفسي بيده الخ۔۔۔۔۔ سن اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں  
 میری جان ہے کہ یہی کیفیت ادھر بھی ہے۔

مہاجرین کے چھوڑے ہوئے مکان مکہ والوں کے حوالہ کر دیئے:

صحابہ کرام ہجرت کے وقت اپنے مکانات، دکانیں اور زمین اور دوسرے املاک مکہ میں چھوڑ  
 کر گئے تھے اور ان پر مکہ والوں نے قبضہ کر لیا تھا، اب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے  
 یہ سوال رکھا کہ ہماری املاک مکہ والوں سے واپس دلائی جائیں۔

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی ابو اُحد کو بلا کر ان کے کان میں چپکے سے کچھ کہا،  
 انھوں نے اپنے مکان کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، جسے ابوسفیان نے چار سو دنیا میں فروخت کر دیا  
 تھا، ابو اُحد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن کر خاموش ہو گئے، لوگوں نے ابو اُحد سے پوچھا حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا، انھوں نے جواب دیا، آپ نے مجھ سے فرمایا:

ابو اُحد، اگر تم صبر کرو تو اچھا ہو، خدا تعالیٰ اس کے بدلے میں تمہیں جنت میں مکان عطا فرمائے گا۔  
 میں نے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں صبر کروں گا۔

پھر آپ نے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی فرمایا، جو مال خدا کی راہ میں جا چکا ہے میں اس کی  
 واپسی کو پسند نہیں کرتا، یہ سنتے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش ہو گئے۔

وہ مکان جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تھی اور جس مکان میں حضرت  
 خدیجہ کے ساتھ آپ کی شادی ہوئی تھی آپ نے اپنے اس ذاتی مکان کا تذکرہ بھی مناسب نہیں  
 سمجھا۔۔۔۔۔ (سیرت المصطفیٰ بحوالہ الصارم الملول ص ۱۵۴)

سردارانِ قریش کے لئے عفو و کرم:

فتح مکہ کے بعد قریش کے کچھ بڑے سردار اپنے جرم کا احساس کر کے قتل کے خوف سے مکہ  
 ۱۵ چھوڑ کر چلے گئے، ان میں سے ایک ابو جہل کا رد کا عکرہ بھی تھا۔

عکرمہ کے بھاگ جانے کے بعد ان کی بیوی ام حکیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام سے مشرف ہو گئیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر کے لئے امن کی درخواست کی، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو فوراً قبول کر لیا، عکرمہ مکہ سے بھاگ کر مین جانے کے لئے ساحل پر پہنچے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے، اتفاق سے ان کی کشتی بھنور میں آگئی، انھوں نے اپنے مشرکانہ عقیدہ کے مطابق اپنے دیوتاؤں (لات و عزیٰ) کو مدد کے لئے پکارا، کشتی کے سواروں میں سے کسی اللہ کے بندے نے کہا، اس موقع پر نقلی خدا کچھ کام نہ دیں گے، خدائے واحد کو پکارو، خدا کی توحید کی سر بلندی کا تماشا یہ مکہ کے اندر اسلام کی فتح کی صورت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے، اس آواز نے ان کے دل پر ایک اور چوٹ لگائی، فوراً بولے اگر دریا میں خدائے واحد کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں آسکتا تو پھر خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں اور یہ کہہ کر خدا کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ دعا کی:

اللهم لك عهد ان عافيتني مما اتا فيه ان اتى محمد احقى اضعيدي  
في يده فلا جدته عتورا عفورا حريسا ————— ”خداوند! میں تجھ سے عہد کرتا ہوں  
کہ اگر تو نے اس پریشانی سے مجھے نجات دیدی تو میں تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر  
ہوں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا اور ضرور میں انھیں معاف کر نیوالا اور مہربان پاؤں گا۔“  
ادھر یہ ہوا کہ اسی پریشانی کے عالم میں عکرمہ کی بیوی ام حکیم ان کے پاس پہنچ گئیں اور انھیں  
آواز دے کر تباہ کیا کہ:

يا ابن عم جئتك من ابر الناس واصل الناس وخير الناس لا تهلك نفسك  
اني قد استأمنت لك رسول الله صلى الله عليه وسلم ————— ”اے ابن عم! میں تیرے  
پاس اُس شخص کی جانب سے آئی ہوں جو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ  
مہربانی کرنے والا، سب سے زیادہ بہتر ہے، تو اپنے آپ کو ہلاک نہ کر، میں نے تیرے لئے رسول  
پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے امن حاصل کر لیا ہے۔“ عکرمہ یہ سن کر کشتی سے اتر آیا اور ام حکیم کیساتھ

ردانہ ہو گیا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا کہ عکرمہ خدمت اقدس میں حاضر ہو رہا ہے، آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

یا نیکم عکرمۃ مرمنا فلا تسبوا اباءہ فان سب المیت یوذی الحق۔  
 ”وگرا عکرمہ تمہارے پاس مومن بن کر آ رہا ہے، پس تم اس کے باپ (ابو جہل) کو بُرا بھلا نہ کہنا، کیونکہ مردہ کو بُرا کہنے سے زندہ کو تکلیف پہنچتی ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نصیحت میں اسلامی اخلاق کی تعلیم دی، ایک زندہ دوست کی دلدادگی کی خاطر مردہ دشمن کو بُرا بھلا کہنے سے روک دیا، ابو جہل بدترین دشمن حق تھا، اس کے کرنامے انتہائی نفرت انگیز تھے اس پر جس قدر بھی اظہار نفرت کیا جاتا کم تھا مگر باپ کو بُرا کہنے سے بیٹے کو قدرتی طور پر تکلیف پہنچتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا احساس کیا، عکرمہ انسانی نفسیات سے خالی نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے ان کی خاطر ضروری تھی اور ماضی کے حالات پر لعن طعن کرنے سے کوئی فائدہ پہنچنے والا بھی نہ تھا، یہ ہدایت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبیر اور بالغ حکمت پر مبنی تھی۔

عکرمہ کی آمد:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی نصیحت فرما ہی رہے تھے کہ عکرمہ اپنی بیوی ام حکیم کے ساتھ تشریف لے آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر دوڑے۔

و ثب الیہ و ما علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ردائہ فرجاً بکرمۃ۔  
 ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوڑ کر عکرمہ کی طرف بڑھے، خوشی کے مارے چادر تشریف بھی نہ اوڑھی پھر عکرمہ کو اپنے سامنے بٹھالیا۔“

عکرمہ کے پاس ام حکیم بیٹھی ہوئی تھیں، جن کے چہرہ پر نقاب پڑا ہوا تھا عکرمہ نے عرض کیا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ام حکیم نے مجھے پیغام دیا ہے کہ آپ نے مجھے امن دیدیا ہے، آپ نے فرمایا: صدقت، فانت امن۔ اس نے صحیح کہا تجھے امن ہے۔

پھر عکرمہ نے کہا، آپ کی دعوت کیا ہے؟ — آپ نے فرمایا ادعوك الى ان  
 تشهد ان لا اله الا الله واني رسول الله وان تقيم الصلوة وتؤتي الزكوة وتفعل تفعل  
 حق عد خصال الاسلام — یعنی توحید اور نبوت کا اقرار کر لے اور نماز روزہ اور اسلامی  
 احکام کی پیروی کر — عکرمہ نے آپ کی دعوت کو قبول فرمایا، اور عرض کیا۔

والله ما دعوت الا الى الحق وامر حسن جميل، قد كنت والله! فينا قبل ان  
 تدعو الى ما دعوت اليه وانت اصدقنا حديثا وابرنا برأ — ”حضور صلی اللہ  
 علیہ وسلم! آپ جس پیغام حق کی دعوت دے رہے ہیں وہ حق ہے اور اچھا اور بہترین پیغام ہے  
 خدا کی قسم آپ اس دعوت سے پہلے بھی ہم میں موجود تھے ہم نے اس وقت بھی آپ کو صادق  
 القول، ہمدرد اور مہربان پایا۔“

ایک روایت میں عکرمہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے؛

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تجھ کو امن ہے۔

میں نے عرض کیا — اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وانت  
 عبد الله ورسوله وانت ابرُّ الناس واصدق الناس اوفى الناس —  
 میں یہ کہتا جا رہا تھا اور میرا سر شرم کے مارے جھکا ہوا تھا — واني لمطامئ  
 راسي استحياء منه — عکرمہ کہتے ہیں؛

میرے اس اقرار و شہادت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے انور خوشی سے چمک اٹھا  
 پھر میں نے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! کوئی اچھا کلمہ مجھے تعلیم دیجئے۔  
 آپ نے فرمایا: — یہ کلمہ شہادت ہی سب سے اچھا کلمہ ہے۔

عکرمہ بولے مجھے کچھ اور نصیحت کیجئے — آپ نے فرمایا، اچھا کہو:

واشهد الله واشهد من حضراتي مسلم مجاهد مهاجر — (عکرمہ  
 نے یہ جملے ادا کئے) یعنی میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور ان سب کو جو یہاں حاضر ہیں کہ میں مسلمان ہوں



بہادریوں، مہاجرینوں،

عمرہ نے ان الفاظ سے اپنے خدا کو، اور تمام حاضرین کو اپنے ایمان، جہاد اور ہجرت پر گواہ بنایا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عمرہ! آج تم مجھ سے جو سوال کرو گے میں اسے پورا کروں گا، مانگو، کیا مانگتے ہو۔

عمرہ نے مال و دولت کا سوال نہیں کیا، ایمان و اسلام کی دولت نے انہیں بالکل بدل دیا تھا، ہاں ایک احساس انہیں تکلیف دے رہا تھا، کہ میں ایسی پاکیزہ، ہمدرد اور صداقت مآب ہستی کی آج تک مخالفت کرتا رہا، اس لئے عمرہ نے جس چیز کا سوال کیا وہ یہ تھا؟

فَا قِ اسْأَلْتُ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِي كُلَّ عِدَاوَةٍ عَادَيْتُهَا اَوْ مَسِيرًا وَصَنَعْتُ فِيْهِ

اَوْ مَقَامًا لِقِيَتَا فِيْهِ اَوْ كَلَامًا قُلْتُ فِيْ وَجْهٍ اَوْ اَنْتَ غَائِبٌ عَنْهُ

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے لئے خدا تعالیٰ سے مغفرت اور معافی کی دعا کریں کہ میں نے آپ کی جو بھی مخالفت کی ہے جس جگہ بھی آپ کے خلاف کوشش کی ہے، جس مقام پر آپ کا مقابلہ کیا ہے، جو ناشائستہ بات آپ کے متعلق کہی ہے، آپ کے منہ پر یا آپ کے پیچھے، خدا تعالیٰ اسے معاف کر دے۔

میرا کرنے وعدہ کے مطابق فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اَعْفِرْ لِيْ كُلَّ عِدَاوَةٍ عَادَيْتُهَا وَكُلَّ مَسِيرٍ سَارْتُهُ اِلَى مَوْضِعٍ يَّرِيدُ

بِذَلِكَ السَّيْرَ اَطْلُقُ نَوْرًا وَاَعْفِرْ لِيْ مَا قَالَتْ عَرَضُ فِيْ وَجْهِ اَوْ اَنَا غَائِبٌ عَنْهُ

فَقَالَ عُمْرَةُ رَضِيَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! خداوند! عمرہ! کی ہر دشمنی کو معاف

کر دے، جو اس نے میرے ساتھ کی ہے اور اس نے جو قدم بھی تیرے نور کو بھانے کے لئے

اٹھایا ہے اسے بھی اور اس نے میرے ساتھ جو زیادتیاں کی ہیں، میرے سامنے یا میرے

پیچھے انہیں بھی معاف کر۔

عمرہ اس دعا سے خوش ہو گئے اور کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اب میں مطمئن ہوں۔

اس کے بعد عکرمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا ————— اَما واللہ یا رسول اللہ ! لا ادع نفقۃ کنت انفقہا فی صد عن سبیل اللہ الا انفقۃ ضعیفا فی سبیل اللہ ولا قتالا کنت اقاتل فی صد عن سبیل اللہ الا ابلیت ضعیفا فی سبیل اللہ ————— حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں نے جس قدر پیسہ راہِ حق میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے صرف کیا، اس سے دو گنا اسلام کی سر بلندی کے لئے صرف کروں گا۔ اور میں نے جس قدر اسلام کے خلاف جنگ کی ہے اس سے دو گنی طاقت اعلاء کلمۃ الحق کے لئے دوں گا (حیات صحابہ ج ۱ ص ۵، البحر الکنز المال ج ۸ ص ۵، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۴۱) عکرمہ کا وعدہ دل سے تھا وہ پورا ہوا۔ صدیق اکبر کے عہد میں اجنادین کی جنگ میں جہاد میں شریک ہوئے اور جام شہادت نوش فرمایا۔

صفوان بن امیہ پر رحم و کرم :  
اسلام کے بدترین دشمنوں میں صفوان کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے، یہ آخر تک اسلام سے لڑتے رہے اور جب مکہ پر اسلام کی فتح کا جھنڈا نصب ہو گیا تو یہ مکہ سے بھاگ گئے۔ ان کی بیوی ”بنوم بنت معدل“ نے شوہر کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ مسلمان ہو گئیں صفوان اپنے غلام یسار کے ساتھ مکہ سے نکل کر ایک پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ گئے۔ حضرت عمرؓ امن و امان قائم ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ! یا رسول اللہ ! ہماری قوم کے سردار صفوان آپ کی کامیابی کو دیکھ کر مکہ سے بھاگ گئے اور وہ سمندر میں ڈوب کر خودکشی کرنا چاہتے ہیں، انھیں خطرہ ہے کہ آپ انھیں مٹا نہیں کریں گے اور قتل کر دیں گے۔

قَاتِلْهُ فِدَاكَ اَبِي دَاوُدَ ————— ”پس میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں انہیں آپ امن دے دیجئے“ ————— سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تاثر فرمایا :  
قَدْ اَمْنَتْهُ ————— ”میں نے اسے امن دے دیا“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امن حاصل کر کے عمیرہ صفوان کی تلاش میں نکلے اور ایک گھائی میں صفوان کو پایا۔ صفوان نے دور سے عمیرہ کو آتا دیکھ کر اپنے غلام یسار سے کہا:   
 رَیَحْتُکَ اَ اُنْظُرُ مَنْ تَرٰی؟ ”تجھ پر افسوس! دیکھ تو یہ کون آرہا ہے۔“   
 صفوان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر غلام بولا، یہ تو عمیر بن وہب آرہے ہیں جو تمہارے قبیلے کے آدمی ہیں، صفوان نے کہا:

عمیرہ کو مجھ سے کیا واسطہ؟ یہ تو مجھے قتل کرنے آرہے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (مکہ پر پورا قبضہ کر چکے ہیں اور یہ ان کے ساتھی ہیں۔) عمیرہ جب قریب پہنچے تو صفوان نے مایوس ہو کر کہا:   
 عمیرہ! تم میرے ساتھ اتنا کچھ تو کر چکے، بال بچے چھوٹے، گھر بار چھوٹا، اب تم مجھے قتل کرنے آئے ہو۔ اپنے سردار کی مایوسی اور گھبراہٹ کو دور کرتے ہوئے عمیرہ نے کہا:   
 میرے سردار! میں تجھ پر قربان جئتُکَ من ابرالناس وادصل الناس میں تو ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو لوگوں میں سب سے زیادہ نیک اور سب سے زیادہ احسان کرنے والے ہیں، خویش پرور ہیں۔

میں ان سے تمہارے لئے امن حاصل کر کے آیا ہوں صفوان کو اطمینان نہ ہوا کیونکہ ان کی ساری زندگی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہنچانے میں گزری تھی۔   
 صفوان نے اطمینان حاصل کرنے کے لئے کہا:

عمیرہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امن دینے کی کوئی سند لے کر آؤ، تاکہ میں مطمئن ہو سکوں، مجھے اطمینان حاصل نہیں ہو رہا۔

عمیرہ واپس آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صفوان کا خوف و ہراس دیکھ کر اطمینان پیش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی اپنے عفو و کرم کا مظاہرہ فرمایا اور فوراً اپنا عمامہ عطا فرمادیا۔

یہ عمامہ دراصل وہ مہینی چادر تھی جو سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن اپنے

سرے پیٹے ہوئے تھے یہ — اور یہ چادر صفوان کے سامنے پیش کر کے کہا:

یا ایا وھب! یُجْتَنَّبُ مِنَ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ وَادْوِلِ النَّاسَ وَابِرِ النَّاسِ وَاحْلَمْ  
النَّاسَ مَجْدَهُ مَجْدُكَ وَعِزُّكَ عِزُّكَ وَمُلْكُكَ مَلِكُكَ - ابن املک و ابیہ - وَ  
اذْکُرْكَ اللّٰهُ فِیْ نَفْسِکَ — ”اے ابو وہب! میں اس ذاتِ اقدس کی طرف سے آیا ہوں  
جو سب سے بہتر ہے، سب سے زیادہ بخشش کرنے والا ہے سب سے زیادہ نیک سب سے زیادہ  
بردار ہے — اے صفوان! اس کا عروج تمہارا عروج ہے، اس کی عزت تمہاری عزت ہے  
اس کا اقتدار تمہارا اقتدار ہے — وہ ددھیال اور ننھیال سے تمہارا عزیز ہے اور تمہارے  
دل میں خدا کی یاد پیدا کرنا چاہتا ہے“

صفوان پر پھر قتل کی دہشت سوار ہوئی اور بولا — اَخَاتُ اَنْ اُقْتَلَ  
”مجھے اپنے قتل کا اندیشہ ہے“ — اور پھر ساتھ ہی چادر پاک کو دکھ کر کہا:

نعم هو، هو — یہ وہی چادر ہے، وہی چادر ہے۔

صفوان نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اقدس پر اسے دیکھا تھا جب آپ فاتحانہ جلال  
کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے تھے۔

عمیرہ نے پھر اطمینان دلایا اور صفوان ان کے ساتھ مکہ آ گئے۔

صفوان اور عمیرہ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
مسلمانوں کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔

صفوان نے نماز کو دیکھ کر پوچھا:

کم یصلون فی الیوم واللیلۃ قال خمس صلوات قال یصلی بھم مہمد؟ قال نعم!

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ دخل فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومئذ متعجراً بہ برداً حبرۃ ین  
فتح مکہ کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک یمن کی دھاری دار چادر کو سر اقدس سے پیٹے ہوئے تھے اور اس کا ایک سر آگے نکلا ہوا تھا  
الا عجباً رباً لعامة ہوا ینلقھا علی راسہ ویرو طرفھا علی وجہہ (حیات الصحابہ ج ۱ ص ۱۵۹)



”رات دن میں کتنی نمازیں ہیں؟“ عمیرؓ نے کہا، پانچ صفوان بولا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں؟ عمیرؓ نے کہا، ہاں؟“

صفوان کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا صرف مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں یا خود بھی اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ عمیرؓ نے جواب دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دوسروں کو دیتے ہیں خود بھی اس کی تعمیل ان پر ضروری ہوتی ہے۔

صفوان اپنے ذہن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر بنے کر آئے ہوں گے کہ ہر زمین عرب کا فاتح شہنشاہ تخت شاہی پر با عظمت و جلال رونق افروز ہوگا، لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے، وہ حکم دے رہا ہوگا اور لوگ اس کی تعمیل کر رہے ہوں گے۔

یہاں آکر صفوان نے بالکل دوسرا نقشہ دیکھا عرب کا وہ فاتح شہنشاہ خدا کے آگے سربسود ہے اور لوگ بھی اس کے ساتھ خدا کے سامنے جھکے ہوئے ہیں، عرب کا وہ فاتح بطور امام کے تمام مسلمانوں سے دو قدم آگے ہے، جس سے وہ اشارہ کر رہا ہے کہ لوگو! میں خدا کی عبادت میں تم سے دو قدم آگے رہوں گا، ہر بندگی میں تم مجھے سب سے آگے دیکھو گے۔

بس اسلام میں امامت کا یہی مطلب ہے، امامت و سرداری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لوگ اس کی پوجا اور پرستش کریں

صفوان عرب کے اس سردار کی نہالی سرداری دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ اور سوال کیا، کیا ہر نماز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ خود بھی عبادت کرتے ہیں؟ حضرت عمیرؓ نے صفوان کے جواب میں جو بات کہی قرآن نے جملہ پیغمبران علیہم السلام کے متعلق اس بات کو واضح کیا ہے کہ پیغمبر خود بھی احکام الہی کی پابندی پر مامور ہوتے ہیں۔

سردارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سورہ یونس میں یہ اعلان کیا گیا۔ دَامِرَتْ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ”مجھے خدا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود بھی ایمان لانے والوں میں سے ہو جاؤں“

سورۃ انعام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان نقل کیا گیا:

قُلْ اِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ  
بِذَلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ————— ”آپ کہہ دیجیے! میری نماز، قربانی اور مرنا  
جیسا ب خدا کے لئے ہے جو رب العالمین ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا  
گیا ہے کہ میں خدا کا سب سے پہلا فرمانبردار ہو جاؤں۔“

بہر حال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو صفوان پہل کر کے حضور صلی اللہ  
علیہ وسلم کو آواز دی اور کہا:

یا محمد! ان عمیر جاءنی ببردك وزعم انك دعوتنی الى القدام عليك  
فان رضیت امرًا والا سیرتنی شھوین ————— ”اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ عمیر آپ کی  
چادر دکھا کر مجھے اپنے ساتھ لائے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ اگر میں اسلام قبول نہ کر دوں تو پھر بھی مجھے دو ماہ  
کی مہلت مل سکتی ہے۔“

آپ نے صفوان کی گھبراہٹ دیکھ کر انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

انزل یا ایا دھب! ————— ابو وہب تم سواری سے نیچے تو اترو ————— صفوان بھی  
تک خوف و ہراس میں مبتلا تھے، بولے: لا، واللہ! حتی تبین لی ————— ”نہیں خدا  
کی قسم! میں نیچے نہیں اتر دوں گا، یہاں تک کہ آپ صاف صاف مجھے نہ بتلا دیں۔“  
آپ نے فرمایا ————— دو ماہ کی مہلت نہیں، صفوان تمہیں چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے  
صفوان کو مہلت دے دی گئی۔

مہلت کے دوران صفوان غزوہ حنین اور طائف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے  
یہ ابھی تک اپنے آبائی دین پر قائم تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کسی قسم کا تعرض نہیں فرماتے تھے۔  
غزوات سے فارغ ہو کر حیرانہ کے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کا جائزہ لے رہے  
تھے، صفوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی کھڑے تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے اندازہ

مال غنیمت کو دیکھ رہے تھے کہ ساز و سامان، اونٹوں اور بکریوں سے راستے بھرے پڑے ہیں۔  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لنگھیوں سے صفوان کو دیکھا کہ یہ اس قدر مال و دولت سے حیرزدہ  
 ہیں، پھر صفوان کی حیرت کو توڑتے ہوئے فرمایا:

أَبَاوَهَبَ! يَعْجَبُ هَذِهِ الشَّعْبُ، قَالَ نَعَمْ، قَالَ، هَوْلًا وَمَافِيهِ — ”ابوہب!  
 یہ دولت پسند ہے؟ بولے ہاں پسند ہے، فرمایا، اس میں سے جتنا چاہو لے لو، یہ سب تمہارا ہے“  
 صفوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و کرم کا یہ اندازِ شاہانہ دیکھ کر بول اُٹھے۔  
 فَقَالَ صَفْوَانُ عِنْدَ ذَلِكَ مَا كَاطَبَتْ نَفْسُ أَحَدٍ بِمِثْلِ هَذِهِ النَّفْسِ مُنْذُ بَنِي — أَشْهَدُ  
 أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ — ”صفوان اسی وقت  
 بول اُٹھے: اس قدر عفو و کرم اور بخشش و عطا پر ایک رسول کا نفس ہی پہنچ سکتا ہے، ایک رسول  
 (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ایسا بے مثل کرم کر سکتا ہے۔ یہ کہہ کر صفوان نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔“  
 (کنز العمال جلد ۵ ص ۲۹۴)

### ابوہب کے بیٹوں کے لئے دُعا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوہب کا ظلم و جور مشہور ہے، اس ظالم چچا کے دونوں لڑکے  
 عقبہ اور معتب فتح مکہ کے بعد اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مکہ سے بھاگ گئے تھے حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا، عقبہ اور معتب کہاں ہیں؟ — آپ کو بتایا گیا وہ دونوں بھی  
 قتل کے خوف سے بھاگ گئے ہیں، آپ نے فرمایا، انھیں میرے پاس لاؤ، حضرت عباس رضی  
 اپنے ان بھتیجوں کو عرفہ کے مقام سے واپس لائے اور آپ کی خدمت میں انھیں پیش کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 ان کے سامنے اسلام پیش کیا، دونوں نے کلمہ حق کا اقرار کیا، پھر آپ انھیں بیت اللہ کے دروازہ کے  
 قریب ملزم پر لائے، آپ نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے، ملزم پر آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے دیر تک دُعا مانگی اور پھر منبتے ہوئے واپس آئے حضرت عباسؓ نے کہا اے رسولِ محترم! صلی اللہ علیہ وسلم  
 خدا تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، اس وقت آپ کے مننے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے

اپنے پروردگار سے دُعا کی کہ میرے ان دونوں بھائیوں کو مجھے مہربان کر دے، خدا تعالیٰ نے میری دُعا قبول فرمائی اور مجھے عقبہ اور معتب عطا کر دیئے گئے (زر قانی ج ۲ ص ۳۲۰)

ابولہب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا، اس کے لڑکوں کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جذبہِ رحم اور بے پایاں شفقت دیکھنے کے قابل ہے اور پھر ان کے اسلام کو خدا تعالیٰ کا خاص عطیہ قرار دینا ان کے اعزاز و اکرام کی انتہا ہے۔

### ابولہب کی بیٹی ”درہ“ پر لطف و کرم:

ابولہب کی بیٹی ”درہ“ مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ آ گئیں تو کچھ عورتوں نے اس پر ابولہب کی بیٹی ہونے کا طنز کیا ”درہ“ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع عام میں تقریر فرمائی، سب مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ درہ سے طنز کی کوئی بات نہ کی جائے اور فرمایا ”درہ“ میرے خاندان کی خاتون ہے، اس کی اذیت میری اذیت ہے اور قیامت میں صرف

میرا ہی رشتہ ایسا ہوگا جو کام آئے گا (درمنثور)

### حنین کے قیدیوں پر رحم و کرم:

مکہ منظمہ فتح ہو جانے کے بعد دشمنانِ حق نے آخری مورچہ حنین کے میدان میں قائم کیا، یہاں آپ کا مقابلہ ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں سے ہوا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے ظلم کی آخری شوکت کو توڑنے کے لئے زبردست مقابلہ کیا اور خدا تعالیٰ نے اہل حق کو کامیابی عطا فرمائی۔ اس معرکہ میں چھ ہزار جنگی قیدی مسلمانوں کے قبضہ میں آئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرانہ کے مقام پر ان قیدیوں کو تین ہفتہ تک اپنے ساتھ رکھا اور ہوازن کے ذمہ دار لوگوں کا انتظار کیا اور جب کوئی شخص ان قیدیوں کو چھڑانے نہ آیا تو آپ نے دستور کے مطابق ان قیدیوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تقسیم کر دیا۔

تقسیم کے بعد ہوازن کا وفد ان قیدیوں کو چھڑانے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنے آدمیوں کو چھڑانے کی درخواست کی۔



حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حضرت حلیمہؓ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں، اس وفد کے ایک ممبر نہ میر بن صرد نے آپؐ سے رحم و کرم کی اپیل کرتے ہوئے کہا:

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ان جنگی مجرموں میں آپؐ کی رضاعی خالائیں، پھوپھیاں اور آپؐ کو گود میں کھلانے والیاں شامل ہیں، اگر عرب کے کسی حکمراں سے ہمارا ایسا تعلق ہوتا تو ہم پر بہت رحم و کرم ہوتا اور آپؐ کی شان اقدس تو حکمرانوں سے بہت اعلیٰ اور بلند ہے، پس آپؐ ہم پر رحم کیجئے، ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں نے تمہارا بہت انتظار کیا، اس کے بعد ان قیدیوں کو تقسیم کر دیا، اب میں اپنے اور اپنے خاندان نبی ہاشم کے حصہ کے تمام قیدیوں کو آزاد کر کے تمہارے سپرد کرتا ہوں، رہے وہ قیدی جو دوسرے مسلمانوں کے حصہ میں آئے ہیں تو تم ظہر کی نماز کے بعد مسلمانوں سے ان قیدیوں کے لئے درخواست کرنا میں بھی تمہاری سفارش کروں گا۔

ظہر کی نماز کے بعد وفد کے خطیبوں نے فصیح و بلیغ تقریریں کیں اور مسلمانوں سے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی، اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی اور مسلمانوں سے کہا:

لوگو! میں نے اپنے حصہ کے قیدیوں کو آزاد کر دیا ہے، میں تم سے بھی یہ کہتا ہوں کہ تم بھی ان تمام قیدیوں کو چھوڑ دو، اگر تم میں کوئی شخص اپنی خوشی سے رہا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو میں اپنی طرف سے ان کا معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں۔

صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی سن کر خوشی اپنے تمام قیدی آزاد کر دیئے انہی قیدیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیماء بھی شامل تھیں، مسلمانوں نے جب شیماء کو میرا بن جنگ سے اپنی حراست میں لیا تو انہوں نے کہا، لوگو! میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں، حلیمہ کی لڑکی ہوں، اور اس کی نشانی یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے بچپن میں میرے کاٹ لیا تھا۔

دیکھیے! یہ اس کا نشان موجود ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شیماء کو فوراً پہچان لیا اور خوشی سے

میں اپنی چادر پاک زمین پر ڈال دی اور اس پر بہن کو بٹھایا، اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہن شیماء سے کہا، اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو میرے ساتھ چلو، آرام سے زندگی گزار لینا اور اگر اپنی قوم کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے، شیماء نے واپس جانیکی خواہش کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی واپس کر دیا اور کچھ اونٹ اور بکریاں، تین خادم اور ایک لونڈی بھی انہیں عطا فرمادی۔ (اصابہ ترجمہ شیماء ص ۴۴ ص ۴۴)

حاتم طائی کی بیٹی پر رحم و کرم کی بارش:

حاتم طائی مشہور عیسائی سخی گذرا ہے، اس کے قبیلہ مطے کے جنگی قیدیوں میں حاتم کی رملکی سقافہ بھی شامل تھی، حاتم کا رمل کا عدی تو مسلمانوں کے آنے کی اطلاع پا کر ملک شام چلا گیا اور بہن مسلمانوں کی حراست میں مدینہ لے آئی گئیں، یہ لوگ مسجد نبوی کے قریب ایک احاطہ میں اتار دیئے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس احاطہ کے سامنے سے گذرے تو سقافہ کھڑی ہو گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم میرا باپ حاتم خدا کو پیارا ہو گیا، میرا بھائی جو میرا سر پرست تھا، وہ شام کی طرف بھاگ گیا، اب آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہم پر رحم فرمائیے اور احسان کیجئے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سقافہ کی درخواست پر فرمایا تم اطمینان سے رہو ملک شام جانے والا کوئی ذمہ دار آدمی مل جائے تو میں ان کے ساتھ تمہیں بھیج دوں گا، دو تین دن کے بعد آپ نے سقافہ کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس کر دیا سقافہ نے اسلام قبول کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکر یہ ادا کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا دی جس کے چند جملے یہ ہیں۔

اصاب اللہ بمعروفک مواضعہ ولا جعل لک الی لئیم حاجۃ ولا سلب نعمۃ عن کریم الا وجعلک سبباً لوردها علیہ۔ خدا کرے آپ کا احسان کرم ہمیشہ بر مل اور حق داروں پر واقع ہو، خدا کرے آپ کو کسی کینہ سے کوئی ضرورت نہ پڑے

اور خدا تعالیٰ کسی شریف آدمی کی نعمت نہ چھینے اور اگر چھینے تو آپ جیسے شریف انسان کے ہاتھوں سے واپس کرائے۔“

سنانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہو کر اپنے بھائی کے پاس ملک شام پہنچیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کرم سے عدی کو آگاہ کیا اور بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دین اور دنیا کی فضیلت حاصل کرے۔

عدی نے بہن کی زبان سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا حال سُن کر مدینہ کا رخ کیا اور حاضر خدمت ہو کر مسلمان ہو گئے (بحوالہ زرقانی ج ۳ ص ۵۳) علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے حاتم طائی کی بیٹی کے قیدی بن کر آنے اور آپ کے رحم و کرم پر چند اشعار لکھے ہیں، فرماتے ہیں:

در مصافِ پیشِ آں گردوں سریر      دخترِ سردارِ طے آمد اسیر  
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود      گردن از شرم و حیا رخم کردہ بود  
دخترِ کِ راجہاں نبی پے پردہ دید      چادر خود پیشِ روئے او کشید  
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم      پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم  
(ترجمہ) قبیلہ طے کے سردار کی بیٹی آپ کی خدمت میں بطور ایک قیدی کے آئیں، جب اس تاجدار نے اس معزز خاتون کو نگے سر دکھیا تو اپنی چادر اتار کر اس کے سر پر ڈال دی اور بے پردہ و کرم فرمایا۔

پس ہم مسلمان تو اس خاتون سے زیادہ عریاں اور اقوامِ عالم میں بے چارہ و بے پردہ مسلمان ہیں پھر ہم اس رحم و کرم کے کیوں مستحق نہیں۔

سراقہ بن مالک بن حیشمہ کی معافی اور انعام: قریش مکہ کی طرف سے ہجرت کے موقع پر یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص محمد بن عبد اللہ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کو پکڑ کر لائے گا اسے سزا و نٹ انعام میں دیئے جائیں گے، سراقہ بن مالک کا بیان ہے

کہ یہ اعلان سن کر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دور جا کر میں نے آپ کو دیکھ لیا اور آپ کے قریب پہنچ گیا، ابو بکر صدیق کی نگاہ جب مجھ پر پڑی تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، یا رسول اللہ! یہ شخص ہماری تلاش میں آ رہا ہے اب ہم پکڑ لے گئے، آپ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

لَا تَحْزَنَنَّ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا — ابو بکر! غم نہ کرو، خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔“

پھر آپ نے خدا تعالیٰ سے دعاء فرمائی:

اَللّٰهُمَّ اَخْفِنَا بِمَا شِئْتَ ”خداوند! تو ہمارے لئے کافی ہو جا جس طرح چاہے“

(فتح الباری ج ۷، ص ۱۸۸)

سرکار کی زبان پاک پر بددعا کے الفاظ جاری نہیں ہوئے بلکہ اپنے خدا سے مدد کی درخواست کی اور خدا تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کی یہ صورت اختیار فرمائی کہ سراقہ کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔

سراقہ نے گھبرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی کہ آپ میرے لئے خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے اس عذاب سے نجات عطا فرمائے، آپ نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور سراقہ کا گھوڑا زمیں کے اندر سے باہر آ گیا۔

سراقہ کا بیان ہے کہ میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غائب کرے گا اور قریش کو ناکام رہیں گے، میں نے اپنا زادراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، مگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا، البتہ آپ نے مجھ سے کہا تم ہمارا راز کسی پر ظاہر نہ کرنا، پھر میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ مجھے ایک تحریری معافی نامہ لکھ دیں، آپ نے اپنے خادم عامر بن فہیرہ سے کہا کہ اسے چمڑے کے ٹکڑے پر معافی نامہ لکھ کر دو، انھوں نے وہ معافی کی سند مجھے عطا کر دی (بخاری ج ۱۰، ص ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲)

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ کو خطاب کر کے فرمایا:

هَيْفَ إِذَا لَيْسَتْ سِوَارِ حُسْرَى — ”اے سراقہ اس وقت تیری کیا کیفیت ہوگی“



جب تہ شاہِ فارس کسری کے کنگن اپنے ہاتھوں میں پہنے گا۔“

ان الفاظ میں ایک تاریخی پیشین گوئی بھی تھی اور سراقہ کے لئے ایک بڑی خوشخبری اور تسلی بھی تھی چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا، فارس کی فتح کے بعد شاہِ فارس کا شاہی تاج اور کنگن زیورات مسجد نبوی میں فاروقِ اعظم کے سامنے لاکر ڈال دیئے گئے۔

حضرت عمرؓ نے سراقہ کو بلایا اور ان کے ہاتھوں میں وہ شاہی کنگن پہنا دیئے اور کہا:

اللہ اکبر الحمد للہ الذی سلہما من کسری ابن ہرمز والبسمہما سراقۃ  
الامرایہ اللہ اکبر ————— ”اللہ اکبر اس خدا کی تعریف ہے جس نے کسری سے کنگن چھین لئے

اور ایک دیہاتی سراقہ کے ہاتھ میں ڈال دیئے، اللہ سب سے بڑا ہے“

اس کے بعد وہ تمام زیورات مسلمانوں کے اندر تقسیم کر دیئے (زرقانی ج ۱ ص ۳۴۸) سراقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہو کر مکہ معظمہ واپس ہوا اور راستہ میں ہر تعاقب کرنے والے کو یہ کہہ کر واپس کر تا گیا کہ میں دیکھ آیا ہوں، تمہارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں، پھر سراقہ مکہ میں ابوبہل سے ملا اور اس سے کہا:

ایا حکمہ واللہ لو کنت شاہداً	ایموی جواد یحییٰ ساخت قوائمہ
ای ابوہیل، واللہ اگر تو اس وقت حاضر ہوتا	جب میرے گھوڑے کے قدم زمین میں دھنس جاتے
علمت ولم تشکک ما ن محمداً	نبیؐ ببرہان فمن ذایقاً ومداً
تو تو اس وقت جان لیتا اور تجھے شک نہ رہتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں دین کے ساتھ آئے ہیں، پھر کون ان کا مقابلہ	
کر سکتا ہے (البدایہ ج ۳ ص ۱۸۶)	

## منافقین کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق

منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کو مانتے تھے مگر ان کے دل ایمان و یقین سے خالی تھے، یہ لوگ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تھے لیکن جب کوئی نازک موقع آتا تھا، یہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

### رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی

اس گروہ کا سب سے بڑا لیڈر عبداللہ بن ابی تھا، یہ شخص مدینہ کا بااثر آدمی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے پہلے مدینہ کے لوگ اسے اپنا حکمران بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد اس کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور یہ اسی وقت سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن بن گیا، البتہ ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا رہا۔۔۔ ایک سفر میں اس شخص نے مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈلوانے کی زبردست کوشش کی۔ حافظ ابن کثیر نے سورہ منافقین کی تفسیر میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نبی مصطفیٰ کے غزوہ کے لئے جاتے ہوئے مسلمانوں کا ایک جگہ قیام تھا، یہاں حضرت جہاہ بن سید غفاری (مہاجر) اور حضرت سنان بن یربید انصاری کے درمیان پانی لینے پر کچھ کہن سُن ہو گئی۔

بات طول پکڑ گئی، حضرت سنانؓ نے انصاریوں کو مدد کے لئے آواز دی اور جہاہؓ نے مہاجرین کو پکارا۔۔۔ یہ رئیس المنافقین انصاری کی ایک جماعت کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا، اس نے جب یہ جھگڑا دیکھا تو اس جھگڑے کو بڑھانے کی کوشش کرنے لگا اور انصاری مسلمانوں کو مشعل کرنے کے لئے بولا۔

دیکھو! ہمارے ہی گھر دل میں ان پر دیسیوں نے ہم پر حملے شروع کر دیئے، خدا کی قسم! مدینہ واپس ہو کر ہم حیثیت والے لوگ ان بے حیثیت لوگوں کو دلوں سے نکال دیں گے۔

قرآن کریم نے اس کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ————— ” منافقین کہتے ہیں اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو عزت والے ان ذلت والوں کو نکال دیں گے اور حقیقت تو یہ ہے، عزت تو اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے اور اہل ایمان کے لئے ہے لیکن یہ دو غیے لوگ اس بات کو نہیں جانتے (سورہ منافقین آیت ۸)

یہ نہایت خطرناک فتنہ انگیزی تھی جو عبد اللہ بن ابی کی طرف سے کی گئی، حضرت عمرؓ نے اس شرارت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اجازت دیں کہ فسادى منافق کو ختم کر دیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو منع کر دیا اور فرمایا، تم مسلمانوں کو اس جگہ سے روانہ ہونے کا حکم دے دو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق مسلمانوں کا قافلہ فوراً روانہ ہو گیا، اور لوگ اس جھگڑے کو بھول گئے، اس منافق کے رٹ کے حضرت عبد اللہ ایک سچے مسلمان تھے انھیں جب اپنے باپ کی گستاخی اور شرارت کا علم ہوا تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت چاہی کہ مجھے اپنے باپ کو اس فتنہ انگیزی کی سزا اپنے ہاتھ سے دینے کی اجازت دی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہؓ کو بھی انتقام لینے کی اجازت نہ دی اور ان سے کہا:

بَلْ نَتَرَفَقَ بِهِ وَنَحْسِنُ مَحَبَّتَهُ مَا بَقِيَ مَعَنَا ————— ” نہیں، ہم اس کے ساتھ نرمی کریں گے اور اچھا سلوک کریں گے جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے“ (ابن کثیر ج ۴ ص ۲۷۲)

مورخین نے لکھا ہے کہ جب یہ لشکر مدینہ واپس ہوا تو رؤس المنافقین کا مخلص لڑاکا عبد اللہؓ مدینہ کے دروازہ پر تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا، لوگ گذرتے رہے یہاں تک کہ رؤس المنافقین آپہنچا اور بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر بولا:

مَالِكٌ وَيْلَكَ؟ ————— ”یہ کیا کر رہا ہے، افسوس تجھ پر“

عبداللہ بولے :

واللہ، لا تجوز من ہہنا حتی یاذن لك رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ العزیز و انت الذلیل۔۔۔۔۔ ”خدا کی قسم تو آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں، بیشک رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم عزت والے ہیں اور تو بے عزت ہے۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ قافلہ کے آخری حصہ میں رہا کرتے تھے چنانچہ جب آپ کی سواری آئی تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یہ میرا لڑکا کیا کر رہا ہے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کو اس حرکت سے باز رکھا اور اس کے باپ کو

بیٹے کے ہاتھ سے رہائی دلوائی اور شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دی (ج ۴ ص ۱۱)

ایک سیاسی لیڈر کے لئے اپنے دشمن کو ختم کرانے کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ دشمن کا اپنا بیٹا اسے قتل کرنے کے لئے تیار تھا، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سیاسی لیڈر نہ تھے بلکہ اخلاق و شرافت کے معلم اور انسانیت کے علم بردار تھے، آپ نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور اس فسادِ انسان پر رحم و کرم فرما کر اس کی سنگین سیاسی اور اخلاقی خطا کو معاف کر دیا۔

ابن ابی کے جنازہ کی نماز :

یہ فدی لیڈر آخر وقت تک اپنی شرارتوں پر قائم رہا، یہاں تک کہ اسی حالت میں اس پر موت طاری ہو گئی۔

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ ابن ابی نے مرض الموت میں اپنے لڑکے عبداللہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج کر آپ کو بلایا، سرکا صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے اور اس سے کہا

اھلک حبیب یھود۔۔۔۔۔ ”تجھے یہودیوں کی محبت نے ہلاک کر دیا۔“

ابن ابی اس حالت میں بھی تکبر و غرور میں گرفتار تھا، کہنے لگا :

یا رسول اللہ! انما ارسلت الیک لتستغفر لی ولحمہ ادرسل الیک لتنبھنی۔۔۔۔۔

آئے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے آپ کو اس لئے نہیں بلایا کہ آپ مجھے ڈانٹیں بلکہ اس لئے بلایا کہ آپ میرے لئے دعائے مغفرت کریں۔“



پھر عبد اللہؓ نے اپنے باپ کی خواہش کے مطابق اپنا کمرہ اس کے کفن کے لئے عطا فرمایا اور اس منافق کے غرور و تکبر کو نظر انداز فرما کر اس کے حق میں دعا و مغفرت فرمائی۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سب سے بڑے فسادِ منافق کے ساتھ رحم و کرم کا جو برتاؤ کیا، حضرت عمرؓ کی زبانی حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسے نقل کیا ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں — رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس منافق کی نمازِ جازہ کے لئے کھڑے ہو گئے تو

میں صفت کے اندر سے نکل کر آپ کے سینہٴ اقدس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور عرض کیا، آپ اس دشمنِ حق کی نمازِ جازہ پڑھا رہے ہیں، یہ شخص تو ایسا ہے، ایسا ہے، اس نے فلاں موقع پر یہ کہا، فلاں موقع پر یہ کہا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عمرؓ کی باتیں سنتے رہے اور تبسم فرماتے رہے۔

و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتبسم حتی اذا اٹھت علیہ قال اخرعتی یا عمر! خیرت! فاختیرت۔ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے رہے، یہاں تک کہ جب میں نے بار بار وہ دہرایا تو آپ نے فرمایا، عمرؓ! ہٹ جاؤ، خدا نے مجھے دعا دے کر یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہے، میں نے دعا کرنے کو ترجیح دے دی ہے۔“

وَلَوْ أَعْلَمَهُ اَنِي اَنْزَلْتُ عَلَى السَّبْعِينَ غَفْرَةً لَهَزَّتْ عَلَيْهَا — ”اور اگر مجھے اس بات کا علم ہو جاتا کہ ستر دفعہ سے زیادہ دعا دے کر اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر دفعہ سے زیادہ بار دعا و مغفرت کرتا۔“

یہ روایت امام احمد کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، امام بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ کر آپ کو ناز پڑھانے سے روکا — ”اس کے بعد بھی مقامِ عمرؓ فاخذ بثنوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔“ اس کے بعد بھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصرار جاری رہا تو یہ صفت سے نکل کر آگے آگئے، حضرت عمرؓ خود کہتے ہیں کہ اس موقع پر میں نے جس جرأت سے کام لیا، اس پر مجھے سخت تعجب ہوا۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۹)

ایک جلیل القدر ساتھی کے اصرار کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے بڑے

مخالفت کے ساتھ شرافت و مہربانی کا یہ سلوک فرمایا، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مقام اخلاق کریمانہ کا بے مثل نمونہ پیش کر کے دنیا کو اس کی دعوت دینی تھی۔

حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں حضرت قتادہؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا:

میرے کرتے سے اس منافق کو فائدہ نہ پہنچے لیکن مجھے امید ہے کہ اس کے خاندان (نبی خذرج) کے ہزاروں افراد (میرے) اس شریفانہ برتاؤ کو دیکھ کر اپنے دلوں میں سے نفرت اور بدگمانیاں دُور کر دیں گے اور میری سچائی کو تسلیم کر لیں گے (بیان القرآن ج ۴ ص ۱۲۳)

**نماز کی ممانعت:**

اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ ایک مفسد کے ساتھ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ رحم و کرم کہ دوسرے مفسدین کی حوصلہ افزائی کا سبب بن سکتا تھا اور اس سے مدتیہ کے اجتماعی امن و امان کی صورت حال خراب ہو سکتی تھی، اس لئے خدا تعالیٰ نے آئندہ کے لئے یہ حکم نازل کر دیا کہ شخص کفر و انکار پر مبرے اسلامی طریقہ پر اس کے جنازہ کی نماز کے لئے ہادی اسلام اور دوسرے مسلمان شرکت نہ کریں۔

**منافقین کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے کی کوشش اور آپ کا رحم و کرم:**

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپسی کے وقت ایک پہاڑی درہ سے گزر رہے تھے، اس موقع پر بارہ منافق منہ چپا کر ایک آڑ میں کھڑے ہو گئے، تاکہ جب حضور ادھر سے گزریں تو آپ پر حملہ کر کے آپ کو ختم کر دیں، حضرت حذیفہؓ اور حضرت عمارؓ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب آگے سے گزرے تو آپ ہوشیار ہو گئے اور آپ نے ان منافقین کو للکارا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی للکار سن کر یہ لوگ بھاگ گئے۔

خدا تعالیٰ نے آسمانی وحی کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقین کے نام بتا دیئے

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور غمار لوان کے ناموں سے آگاہ فرمایا، مگر ساتھ ہی منع فرمایا کہ عام مسلمانوں کو ان کے ناموں کی خبر نہ دی جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غصہ میں ان لوگوں کو ان کی مجرمانہ حرکت پر سزا دیتے لگیں اور یہ لوگ ہلاک ہو جائیں۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کی انتہا تھی کہ ایسے مجرموں کی مفسدانہ کارروائیوں کی پردہ پوشی فرمائی اور ان کا راز فاش نہ ہونے دیا۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۳۰۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کو منافقین کمزوری سمجھتے تھے:

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان منافقین کے ساتھ عفو و درگزر کا شریفانہ طرز عمل اختیار فرماتے یہ لوگ اسے آپ کی کمزوری قرار دیتے، قرآنِ کریم نے بتایا:

وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أَدْنَىٰ أَمْرٍ مِّنْكُمْ يَوْمَئِذٍ يَخِيرُ تَكُمُ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُونَ بِآيَاتِهِ وَلَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (سورہ توبہ، ۱۰)۔  
 منافقین سے کچھ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدگوئی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شمس تو کان ہے تم کہہ دو اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، نبی کان میں تمہارے بھلے کے واسطے، وہ ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور یقین ہے مسلمانوں کی باتوں پر اور رحمت ہے ایمان والوں کے حق میں۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی رح مکتبے ہیں ”منافقین آپس میں بیچہ کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بدگوئی کرتے، جب کوئی کہتا کہ ہماری یہ باتیں پیغمبر اسلام تک پہنچ جائیں گی تو کہتے، کیا پروا ہے، ان کے سامنے ہم جھوٹی تاویلیں کر کے اپنی برادری کا یقین دلائیں گے کیونکہ وہ تو کان ہی کان ہیں جو سنتے ہیں فوراً تسلیم کر لیتے ہیں، ان کو باتوں میں لے آنا کچھ مشکل نہیں، بات یہ تھی کہ حضرت اپنے حیار و قرار اور کریم النفس سے جھوٹے کا جھوٹ پہچانتے تب بھی نہ پکڑتے، خلقِ عظیم کنباء پر مسامحت اور تعامل، برہنہ، وہ بے وقوف جانتے کہ آپ نے سمجھا ہی نہیں، حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ کان ہی کان ہیں تو تمہارے بھلے کے واسطے ہیں، نبی کی یہ خواہ اور عادت تمہارے حق میں بہتر ہے، نہیں تو اول تم کھڑے جاؤ گے۔“  
 (محافل شریف ص ۲۵۴)

## زہر دینے والی عورت پر رحم و کرم

خیر کے غزوہ کے موقعہ پر سلام بن مشکم، یہودی سردار کی بیوی زینب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمائی، اس نے کسی سے پوچھا، آپ کو کس جگہ گوشت پسند ہے؟ کسی نے بتایا، بکری کی دست آپ کو زیادہ پسند ہے، اس نے تمام گوشت میں زہر ملا دیا اور دست کے گوشت میں بہت زیادہ ملا دیا، یہ زہر آلود گوشت جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس میں سے کچھ تناول فرمایا اور پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

ہاتھ روک کر آپ نے فرمایا، مجھے اس بڑی نے خبر دی کہ میں زہر آلود ہوں — ان العظم لیخبر فی انہ مسموم — پھر آپ نے زینب کو بلایا زینب نے زہر دینے کا اقرار کر لیا، آپ نے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا —؟ وہ یوں ہی: — فَقُلْتُ اِنْ كَانَ مَلِكًا اِسْتَوَحْتُ مِنْهُ وَاِنْ كَانَ نَبِيًّا فَسَيَخْبِرُ — ”میں نے سوچا تھا، اگر یہ شخص بادشاہ ہے تو اس کے ہاک ہو جانے سے مجھے راحت ملے گی، پھر ظکارا حاصل ہو جائے گا اور اگر یہ شخص نبی ہے تو یہ اس زہر سے باخبر ہو جائے گا“

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کا یہ جواب سُن کر انہی طرت سے اسے معاف کر دیا، حالانکہ زینب نے جو بات بنائی وہ بالکل بھوٹی تھی، اس نے آپ کو رسول جان کر اذیت پہنچانی چاہی۔ یہی زہر تھا جو مرضِ وفات میں آپ کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا اور اسی کے اثر سے آپ نے وفات پائی اور شہادتِ خفی کا مرتبہ حاصل کیا۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۰۲)

## بد زمان خطیب ”سہیل“ پر رحم و کرم :

سہیل بن عمرو قریش کا بہترین خطیب تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سخت عداوت رکھتا تھا، یہ بد زبان، اپنی تقریروں اور خطبوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بُرا بھلا کہا کرتا تھا۔ — بد کے قیدیوں میں جب یہ شخص بھی قیدی بن کر آیا تو حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا



اعتی انزع ثنیتہ لید لہ لسانہ، فلا یكون خطیباً ایداً، فقال علیہ السلام  
 لا امثل بہ فیمثل اللہ بی وان صنت نبیاً۔۔۔۔۔۔ ”حضور! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے  
 اجازت دیجئے کہ میں اس کے اگلے دو دانت توڑ دوں، پھر یہ کبھی تقریر نہ کر سکے گا، آپ نے فرمایا:  
 میں اس کا (مثلاً) چہرہ نہ بگاڑوں گا، اللہ تعالیٰ میرا چہرہ بگاڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں!“  
 اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے رحم و کرم کے پیچھے انسانی محبت کے ساتھ ساتھ خدا کے خوف کا  
 جذبہ کام کرتا تھا، آپ کے دل میں ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ یہ دشمنانِ حق بھی خدا کی مخلوق ہیں، اگر  
 میں خدا کی مرضی کے بغیر ان سے بدلہ لوں گا، تو خدا تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔  
 (من اخلاق النبی صری ص ۱۷۷)۔

### اسی حملہ آوروں کو معافی:

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں مشغول تھے کہ تنعیم سے  
 اسی آدمیوں نے اتر کر آپ پر حملہ کر دیا، تاکہ آپ کو قتل کر دیں۔  
 صحابہ کرامؓ نے ان حملہ آوروں کو گرفتار کر لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں معاف کر دیا  
 اسی واقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (شفاء قاضی عیاض ج ۱ ص ۸۵)  
 وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَايْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَنْظَرَكُمْ  
 عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (سورہ فتح: ۲۴)۔۔۔۔۔۔ ”اور وہ وہی ذات  
 ہے جس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیئے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے مکہ کی وادی میں  
 اس کے بعد تم ان پر کامیاب ہو گئے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے“  
 غیر مسلموں کی عزت کا حکم:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میرے والد ابو بکرؓ نے جاہلیت کے  
 زمانہ میں میری ماں کو طلاق دیدی تھی، میری یہ ماں میرے پاس آئیں اور میرے لئے کچھ گھئی اور منقا  
 اپنے ساتھ لائیں، یہ ابھی تک مشرک تھیں، اس لئے میں نے انہیں اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت

نہ دی اور نہ ان کا ہدیہ قبول کیا، میں نے اس مسئلہ کے لئے اپنی بہن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسامہ سے کہہ دو، انھیں گھر میں آنے دیں اور ان کا ہدیہ قبول کر لیں۔

اس واقعہ پر خدا تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور غیر مسلموں کے ساتھ ملنے جانے کے بارے میں ایک اصول بیان فرمادیا، ارشاد فرمایا:

لَا يَهَاجِرُ اللَّهُ عَنْ الَّذِينَ لَمْ يَقَاتِلُواكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يَخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ  
أَنْ تَبْرُدُوهُمْ وَتَقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ  
قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ  
وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَوَلِيَّاتٌ هُمُ الظَّالِمُونَ ٥ (طَبَقَاتُ ابْنِ سَعْدٍ ج ١ ص ٩٥)

”خدا تعالیٰ ان غیر مسلموں کے ساتھ احسان کرنے اور عدل کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے نہ رھتے ہیں اور نہ انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے، بے شک خدا تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اہل خدا تعالیٰ ان غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے قتال کیا اور تمھارے گھروں سے تم کو نکالا اور جو لوگ ان سے دوستی کریں گے وہ ظالم ہوں گے۔“  
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و شفقت نے اسے گوارا نہ کیا کہ ماں باپ اور اولاد کے فطری رشتہ کو دین و مذہب کے اختلاف کی وجہ سے ختم کر دیں، یہ فطری مائتہا ہر قسم کے اختلاف سے بالاتر ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اولاد کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنے ماں باپ سے پرچھے بن کر جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کرے۔

قرآن کریم نے اوپر والی آیات میں قتال و فساد برپا کرنے والے مشرکین کے ساتھ جس بات سے روکا ہے وہ توئی، دوستی اور اعتماد ہے، بھلائی، انصاف اور نیکی کرنے کی اجازت اور فضیلت ہر حال میں باقی رکھی گئی ہے۔

## عہد کی پابندی کے تین اہم واقعات:

**بدر کا واقعہ:** موجودہ دورِ تہذیب میں میاں میاں کے اندر عہد و معاہدہ کی پابندی کے کوئی معنی نہیں ہیں، طاقتور فریق جب چاہتا ہے، کمزور کے ساتھ کئے گئے عہد کو توڑ کر اپنا مفاد پورا کر لیتا ہے، لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ کے اندر قتال و فساد برپا کرنے والے دشمنوں کے ساتھ پابندیِ عہد کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر مشکل ہی سے تاریخ میں نظر آتی ہے۔ غزوہ بدر کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی کس قدر کمزور تھے، تعداد بھی دشمنوں سے کم اور سروسامان بھی بہت قلیل، اس دن آپ کے نزدیک ایک ایک مسلمان کی بڑی قیمت تھی۔ لیکن اس دن کا ایک واقعہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرے ساتھ میرے والد ابو حُسیل مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے، قریش کے آدمیوں نے راستہ میں ہم دونوں کو روک لیا اور کہا، تم دونوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جانا چاہو؟ ہم نے کہا نہیں، ہم یہاں سے مدینہ جانا چاہتے ہیں، ان لوگوں نے ہم سے عہد لیا کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ نہیں لیں گے اور سیدھے مدینہ چلے جائیں گے۔ ہم لوگ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو ہم نے بدر کی لڑائی میں حصہ لینے کا ارادہ کیا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے عہد کا علم ہو گیا، آپ نے فرمایا، تم اپنے عہد پر قائم رہو۔

و نستعين الله عليهم (الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۲ والا ستیاب ص ۳۳۲) — اور

بحمدِ تعالیٰ سے ان کے مقابلہ پر مدد چاہتے ہیں۔

## ابو جندل کا واقعہ:

دوسرا واقعہ ابو جندل کا ہے اور وہ یہ ہے کہ مدینہ کے میدان میں قریش اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ طے پا رہا تھا، قریش کی طرف سے سہیل نمائندگی کر رہے تھے، معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جو قریش کا قیدی مکہ سے بھاگ کر مدینہ جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے واپس کر دیں لیکن جو شخص مدینہ سے نکل کر مکہ پہنچ جائے گا قریش کے لئے اس کی واپسی

ضروری نہ ہوگی۔

یہ معاہدہ زبانی طور پر طے پا گیا تھا اور تحریر میں لانا باقی تھا کہ سہیل کا لڑکا ابو جندل پانچویں مکہ سے بھاگ کر حدیبیہ میں مسلمانوں کے پاس آ گیا، مسلمانوں نے اپنے ایک مظلوم ساتھی کو اس حال میں دیکھا اور سب بے چین ہو گئے۔

سہیل نے کہا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاہدہ کی پابندی کا یہ سب سے پہلا موقع ہے، میرے لڑکے ابو جندل کو واپس کرو، آپ نے ابو جندل کو بلایا، اور فرمایا:

یا ابا جندل و اصبر و احتسب ————— ”ابو جندل! صبر کرو اور خدا سے اجر و ثواب کی امید رکھو“

اس وقت عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو گئی، ابو جندل صحابہ کرام رضے سے اپیل کر رہے تھے کہ قریش مجھ پر ظلم و ستم تو ڈرتے ہیں، میں نے اسلام قبول کر لیا ہے پھر مجھے ان ظالموں کے حوالہ کیوں کیا جا رہا ہے؟

لیکن جب ابو جندل سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں کہ خدایتیرے لئے کوئی راہ نکالے گا، اس وقت واپس چلا جا، تو ابو جندل فوراً تیار ہو جاتے ہیں اور اپنے آقا کی بات رکھتے ہیں، اپنی جان کی پروا نہیں کرتے۔

**ابو بصیر کا واقعہ:**

حدیبیہ کے معاہدہ کے بعد ابو بصیر کا واقعہ پیش آیا، یہ مد والوں کی قید میں تھے، بھاگ کر مدینہ پہنچ گئے، قریش نے آدمی بھیجا کہ ہمارے قیدی معاہدہ کے مطابق واپس کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا اور ابو بصیر کو بلا کر کہا، ابو بصیر! تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے قریش سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

وَلَا يَصْحَحُ لَنَا فِي دِينِنَا الْغُلْدُ وَاللَّهِ جَاعِلٌ لَكَ وَلِسَنَ مَعَكَ مِنَ الْمُسْتَغْنِينَ فَرَجًا وَمَخْرَجًا ————— ”ہمارے دین میں بدعہدی جائز نہیں خدا تعالیٰ تمہارے لئے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔“ ابو بصیر حضور صلی اللہ



علیہ وسلم کی ہدایت پر واپس آ گئے :  
خدا نے راہ نکالی :

خدا تعالیٰ نے ان دونوں کے لئے راستہ پیدا کیا، ابوبصیر نے کسی ہنگڑے میں مراقتہ القشی کو قتل کر دیا اور مکہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے چلے آئے، اس کے بعد ابو جندل بھی ان کے پاس چلے گئے اور جو شخص اسلام قبول کرتا، مکہ سے بھاگ کر ان کے پاس چلا جاتا، اس طرح اس مقام پر مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت ہو گئی، یہ مقام حجاز سے شام کی طرف جانے والی شاہراہ پر واقع تھا ان مظلوموں نے یہاں جمع ہو کر اپنے اوپر ظلم و ستم کرنے والے قریشی قاتلوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا، کیونکہ انہی لوگوں نے انہیں بے گھر اور بے سرو سامان کیا تھا، پھر یہ دشمنوں کے قاتلوں کو سلامتی کے ساتھ کیسے گزرنے دیتے؟

اس پریشانی نے سنگ دل قریش کو بدحواس کر دیا اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی بھیجا کہ آپ ابو جندل اور اس کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیں، قریش نے خدا اور رشتہ داری کا واسطہ دیا، آپ کو رحم آگیا اور ان لوگوں کو مدینہ بلا لیا (ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲)  
اس طرح ایک طرف اس بر بارگہ وہ کو عافیت ملی اور دوسری طرف قریش کے قافلے امن و سلامتی کے ساتھ گزرنے لگے۔

اپنے مرے ہوئے غیر مسلم کی مذمت کو ناپسند فرمایا :

محمد بن مسلمہ کا بیان ہے کہ ایک روز ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے فرمایا، حسان! جا بہیت کے دور کا کوئی شعر سناؤ  
ما عفا اللہ لنا قیہ — خدا ان اشعار کی بُرائی سے درگزر فرمائے۔

حضرت حسان نے ”اعشی“ کا قصیدہ سنایا، جس میں علقمہ بن علاشہ کی ہجو تھی، قصیدہ کا مطلع یہ تھا  
علقمۃ ما انت من عامر  
النَّاقِصُ الْاَوْتَارُ وَالْمَوَاتِرُ  
اے علقمہ تو قبیلہ عامر میں سے نہیں ہے، تو تو ایسا ہے جو چنگ و رہاب سے محروم ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شعر سن کر فرمایا — یَا حَسَّانَ لَا تَنْشِدُنِي مِثْلَ هَذَا بَعْدَ الْيَوْمِ — حَسَّان! اس قسم کا شعر تم مجھے آئندہ نہ سنانا (کنز العمال ج ۲ ص ۱۵۲) ابو بکر صدیق کو بھی منع فرمایا:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر عقیف، کریم اور پاکیزہ نفس تھے کہ نہ کوئی گھٹیا بات آپ کی زبان پاک سے نکلتی تھی اور نہ آپ کے کان بری باتوں کو سننا پسند کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے کہ آپ طائف والوں کی سرکشی دور کرنے کی غرض سے صحابہ کرام کیساتھ تشریف لے جا رہے تھے، ابو بکر صدیقؓ بھی آپ کے ساتھ تھے۔

راستہ طے کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ ایک قبر سے گزرے اور پوچھا، لوگو! یہ قبر کس کی ہے لوگوں نے کہا یہ قبر سعید بن عاص کی ہے، ابو بکرؓ نے نام سن کر کہا:

لَعَنَ اللَّهُ صَاحِبَ هَذَا الْقَبْرِ فَإِنَّهُ كَانَ يُجَارِبُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ — ”خدا اس قبر والے پر لعنت بھیجے، یہ خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرتا رہا۔“

سعید کے دونوں لڑکے اس وقت موجود تھے، ان میں سے عمرو بن سعید نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قبر اس شخص کی ہے جو غریبوں کو کھانا کھلانے اور یتیموں کی گردن اڑانے میں ابو بکرؓ کے باپ ابو قحافہ سے آگے تھا۔

هَذَا قَبْرُ رَجُلٍ كَانَ اطعم للطعام وَاَصْرَبَ لِلْهَامِ مَن ابى قحافه — ابو بکرؓ، سعید کا مقابلہ اپنے باپ کے ساتھ کرنے سے خفا ہوئے اور کہا حضور! صلی اللہ علیہ وسلم دیکھئے! یہ مجھ سے کس طرح کی باتیں کر رہا ہے، آپ نے عمرو کو خاموش کر دیا: عمرو چلے گئے، پھر آپ نے ابو بکر صدیقؓ کو نصیحت فرمائی:

يَا اَبَا بَكْرٍ! اِذَا ذَكَرْتُمُ الْكُفَّارَ فَعَمِّوْا فَاَنْتُمْ اِذَا اخْصَمْتُمْ غَضِبَ الْاَبْنَاءُ لَا بِاَهْلِكُمْ كَلَّفَ الْمُسْلِمُونَ عَنْ ذَلِكَ (احياء العلوم ج ۳ ص ۱۰۰) — ”اے ابو بکرؓ جب تم منکروں کا ذکر کرو تو تمام انہماز سے ذکر کیا کرو، کیونکہ جب تم خصوصیت کے ساتھ نام لے کر کسی منکر کا ذکر

کرد گے تو اس کی اولاد کو نگرانی ہوگی کہ ان کے بزرگوں کے ساتھ یہ کیا جا رہا ہے۔  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کے بعد مسلمان اس طرح کی باتوں سے رُک گئے۔

اسی طرح آپ نے بدر کے مقتولین کو بُرا کہنے سے روک دیا تھا اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا تھا:  
 لَا تَسُبُّوا هَؤُلَاءِ فَإِنَّهُمْ لَا يَخْلِسُ إِلَيْهِمْ شَيْءٌ مِمَّا تَقُولُونَ وَتُؤْذُونَ الْأَحْيَاءَ  
 الْآيَاتِ الْبَيِّنَاتِ لَكُمْ (احیاء ج ۳ ص ۱۰۴) ————— ”ان لوگوں کو بُرا نہ کہو، کیونکہ تمہاری کوئی  
 بات ان تک تو پہنچتی نہیں، البتہ جو لوگ زندہ ہیں، انہیں اذیت پہنچتی ہے، خبردار! بخش گوئی قابلِ ملامت  
 ہے۔“ ————— سعید بن عاص کی بُرائی کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لڑکے عمرو کو بھی  
 سمجھا سکتے تھے کہ تمہارا باپ دشمنِ حق تھا، تم اس کی مذمت پر بُرا کیوں مان رہے ہو۔ ————— اور  
 یقیناً اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمرو سے یہ فرماتے تو وہ اپنی سبھی مان لیتے، مگر یہ بات فطرتِ انسانی کے  
 خلاف ہوتی۔

باپ بیٹے کا فطری تعلق اور خون کا رشتہ کسی حالت میں نہیں ٹوٹتا، اسلام جو ”دینِ فطرت“ ہے  
 اس نے ہر حال میں فطری تقاضوں کی رعایت کی ہے، عبد اللہ بن ابی ریس المناقیہ کے واقعہ میں بھی  
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے محض لڑکے (عبد اللہ) کو اپنے باپ کے ساتھ باپ کی شدید  
 فساد انگیزی کے بدلے میں سزا دینے اور اسے قتل کرنے سے روک دیا تھا۔  
 البتہ عین میدانِ جنگ میں اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ دہاں خونی رشتوں کی ہر گز پروا  
 نہ کی جائے اور جو لوگ حق کے پیغام کو تلوار کے ذریعہ مٹانے آئیں، ان کی اچھی طرح سرکوبی کی جائے  
 خواہ وہ باپ، بھائی ہوں، یا بیٹے اور بھتیجے۔

بدر کے موقع پر ابو بکر صدیقؓ کے والد ابو قحافہ دشمنوں کی صف میں شامل تھے، لڑائی کے  
 بعد جب باپ بیٹوں کے درمیان بات ہوئی تو ابو قحافہ نے کہا، ابو بکرؓ! ایک موقع پر تم میرے نشانہ  
 کی سیدھ میں آہی گئے تھے، مگر میں نے تمہیں چھوڑ دیا، ابو بکرؓ بولے: آبا جان! اگر آپ میرے نشانہ  
 کی سیدھ میں آجاتے تو خدا کی قسم! میں آپ کو نہ چھوڑتا۔

## حضرت بلالؓ کی اذان پر اعتراض اور وحی الہی کا جواب:

فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی، قریش کے نزدیک یہ بہت اعزاز تھا جو ایک قریشی سردار ہی کو نصیب ہونا چاہئے تھا، مگر ایک آزاد شدہ غلام، کعبہ کی چھت پر چڑھا ہوا نظر آ رہا ہے، اسے کون برداشت کرتا، رتی جل گئی تھی مگر رتی کے بل یاتی تھے، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو اور خالد بن اسید نے کہا — هَذَا الْعَبْدُ يُؤْذِنُ؟ — یہ غلام اذان دے رہا ہے — اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے پندار پر ضرب کاری لگائی اور یہ آیات نازل ہوئیں — يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَكُلُّكُمْ عِنْدَنَا رَافِقٌ — ”لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد عورت سے پیدا کیا ہے۔“



کیا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا کی ہے؟

کیا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے لئے بددعا کی ہے؟ ————— یہ سوال بڑا اہم ہے، کیونکہ رحمتہ للعالمین اور صاحبِ خلقِ عظیم کی عام زندگی اخلاقِ کہ بیانہ اور رحمت و محبت سے بھری ہوئی نظر آتی ہے اور اس رحمت والی زندگی کے ساتھ اس بات کا بالکل جوڑ نہیں لگتا کہ آپ نے اپنے ذاتی دشمنوں کے لئے بددعائیں کی ہیں۔

حضرتِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا سرسری علم رکھنے والے بددعا والے واقعات کو سرسری انداز سے بیان کر دیتے ہیں اور اس سے رحمت للعالمین کے حقیقی مقام اور اصلی مشن کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ بات اوپر واضح کی جا چکی ہے کہ قرآن حکیم نے آپ کا اصلی مقام اور حقیقی مرتبہ بیان کرتے ہوئے آپ کو رحمتہ للعالمین اور صاحبِ خلقِ عظیم قرار دیا ہے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنے بارے میں یہی فرمایا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے سورہ انبیاء میں وما ارسلناک الا رحمة للعالمین کی جو اہم تشریح و تفسیر کی ہے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہتے ہیں: امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ————— یا رسول اللہ ادع علی المشرکین قال انی لم ابعث لکنا واما بعثت رحمة ————— ”اے رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مشرکین کے حق میں بددعا کیجئے آپ نے فرمایا، بلاشبہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا مجھے تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے“ دوسرے طریقہ روایت میں اس طرح ہے:

انہما انا رحمة مہداة۔۔۔۔۔۔ میں خدا کی طرف سے ہدیہ کی ہوئی رحمت ہوں۔  
اس روایت کو بھی ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں:

ان الله بعثني رحمة مہداة يرفع قوم وخنض آخرين۔۔۔۔۔۔ ”مجھے خدا تعالیٰ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے، مجھے اطاعت گزاروں کو سر بلند کرنے اور منکروں کو سست و مغلوب کر نیکی لے۔“  
اس کے بعد ابن کثیر نے طبرانی کی ایک صحیح حدیث نقل کی ہے کہ ابو جہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں چین سے نہ بیٹھنے دو۔  
اور بعد از جلد مسلمانوں پر چڑھاٹی کر دو، اس کے جواب میں مکہ کے مشہور دانشور مطعم بن عدی نے کہا:  
يا ابا الحكم والله ما رأيت احداً اصدق لساناً ولا اصدق موعداً من اخيكم  
الذي طردتہ۔۔۔۔۔۔ ”اے ابو الحكم! قسم ہے خدا کی، میں نے اس شخص سے زیادہ کسی کو سچا اور وعدہ کا پکا نہیں دیکھا، جس کو تم لوگوں نے باہر نکال دیا ہے۔“

مکہ میں ہونے والی اس ساری بات چیت کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں پہنچی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔

والذي نفسي بيده لا قتلنهم ولا هدم لبناهم ولا هدم ينهم وهم كادھون  
انني رحمتي بعثني الله ولا يتوفني حتى يظهر الله دينه۔۔۔۔۔۔ ”خدا کی قسم میں ان ظالموں کو سزا دوں گا اور انہیں راہِ راست پر لے آؤں گا اور وہ اسے ناپسند کریں گے، میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، مجھے خدا تعالیٰ اس وقت تک نہیں اٹھائے گا جب تک کہ سرزمینِ عرب پر دین کو غالب نہ کر دے گا۔“

اس ارشادِ نبوت کے بیان کرتے سے ابن کثیرؒ کا مقصد یہ ہے کہ لڑائی اور جنگ و فساد پر آمادہ لوگوں کے مقابلہ پر تلوار اٹھانا ”رحمة للعالمین“ کے مرتبہ کے خلاف نہیں ہے، بلکہ رحمتِ ماقہ کا یہ مین تقاضا ہے کہ امن پسند عوام کی جان و مال کو مٹھی بھر فساد یوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے

تو اڑاٹھائی جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ رحمتہ للعالمین نے اگر کسی موقع پر بددعا کی ہے تو اس کا مقصد کیا ہے؟  
بن کثیرؒ نے امام احمدؒ کے حوالہ سے ایک حدیث حضرت سلمان فارسیؓ سے نقل کی ہے، اس میں حضور  
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بددعا کی مصلحت پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ایما رجل سبیتہ فی غضبی او لعنتہ لعنة فانما اتا رجل من ولد آدم عقیب  
کما تغضبون واما بعثنی اللہ رحمة للعالمین فاجعلها صلاة علیہ یوم القيامة —  
میں جس شخص کو غصہ میں بُرا کہوں یا اس پر لعنت بھیجوں تو وہ جان لے کہ میں آدم کی اولاد ہی کا  
ایک فرد ہوں میں اسی طرح غصہ کرتا ہوں جس طرح تم غصہ کرتے ہو۔ مجھے خدا نے رحمتہ للعالمین بنا کر بھیجا  
ہے پس میں درخواست کروں گا کہ خدا تعالیٰ میری اس ناراضگی کو بھی قیامت کے دن ان کے لئے رحمت  
بنادے۔ اس کے بعد حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ایک سوال قائم کرتے ہیں:

فان قيل فاي رحمة حصلت لمن كفر به؟ — ”اگر کہا جائے کہ منکرین  
کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کی شکل کیا ہے؟“

تو اس کا جواب ابن عباسؓ کی اس حدیث میں ملتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من آمن بالله واليوم الآخر كتب له الرحمة في الدنيا والاخرة ومن لم  
يؤمن بالله ورسوله عوفي مما اصاب الامم من الخسف والقذف — جبرائیل اور

آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لئے دنیا اور دین دونوں میں رحمت ہے اور جبرائیل اور رسول صلی اللہ  
علیہ وسلم پر ایمان لانے سے محروم رہتا ہے اس کے حق میں رحمت کی شکل یہ ہے کہ وہ اگلی مہم  
قوموں کی طرح دنیاوی ہلاکتوں، دھنسنے اور پتھراؤ کی سزا سے محفوظ رہتا ہے۔“

(تفسیر حافظ عطاء اللہ بن اسماعیل ابن کثیر قرشی متوفی ۷۴۰ھ، ج ۲ مصری ص ۲۰۰)۔

بددعا کے دو موقعے اور پھر اس کی ممانعت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دشمنوں کے لئے بددعا کرنے کے چند موقعے آئے جن میں

آپؐ نے دشمنوں کے ظلم و ستم کی انتہائی شدت میں فطری تقاضے کے تحت ظالموں کے لئے بددعا کی لیکن قرآنِ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کا مقامِ رحمت یاد دلایا اور بددعا کرنے سے روک دیا امام بخاریؒ نے دشمنوں کے لئے بددعا کے مسئلہ پر دو جگہ روشنی ڈالی ہے، مغازی کے باب میں غزوہٴ احد کے سلسلہ میں مالک بن انسؒ کی یہ روایت پیش کی ہے۔

شِبَعَةُ النَّبِيِّ يَوْمَ اَحَدٍ فَقَالَ كَيْفَ يَقْلِمُ قَوْمٌ شَجَرًا بَيْنَهُمْ؟ — "اُحد کے دن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور زخمی ہو گیا، اُس وقت آپؐ نے فرمایا، وہ قوم کس طرح فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کو زخمی کیا ہو؟"

ان جملوں پر خُدا کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَأِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (سورہ آل عمران) ۱۳۸

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو کوئی دخل نہیں، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوبہ ہو جائے

یا ان کو کوئی سزا دے، کیونکہ وہ ظالم ہیں۔"

ابن کثیرؒ نے منہ امام احمد سے بحوالہ سالم بن عبد اللہؒ حدیث نقل کی ہے کہ اُحد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث بن مشام، سہیل بن عمر، صفوان بن امیہ کا نام لے کر ان پر لعنت بھیجی کیونکہ ان لوگوں نے اُحد کے دن قتل و غارتگری میں نمایاں حصہ لیا تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کر دی گئی کہ ان لوگوں کے حق میں بددعا مناسب نہیں ہے (ابن کثیر ج ۱ ص ۴۰۲)

علامہ محمود آلوسی نے روح المعانی میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ اُحد کے دن حضرت حمزہؓ کی صورت بگاڑنے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ قریشِ مکہ کی وحشیانہ زیادتیوں سے متاثر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے یہ نکل گیا:

لَنَفْعَلَنَّ بِهِمْ مِثْلَ مَا فَعَلُوا وَلَنَمَثِّلَنَّ بِهِمْ مِثْلَهُ لَوْ مِثْلَهَا أَحَدٌ مِنَ الْعَرَبِ قَطُّ

"میں ان ظالموں کے ساتھ بھی ایسا ہی کروں گا، ان کا ایسا مثلہ کروں گا جیسا آج تک



عرب میں کسی کو نہیں کیا گیا۔

اس غضبناک جملہ کے زبان پر آتے ہی قرآن کی وہ آیت نازل ہوئی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے

(روح المعانی ج ۴ ص ۴۹)

ان تینوں روایتوں کا تعلق غزوہ اُحد سے ہے اور ان سب کا مقصد یہ ہے کہ اُحد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حالات کی بے حد شدت سے متاثر ہو کر غیض و غضب کے چند جملے زبانِ پاک سے نکال دیئے مگر خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے اخلاقِ کریمانہ کے بلند مقام کی طرف توجہ دلائی اور اس غفۃ کو غیر مناسب قرار دیا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیتِ پاک کا فوری اثر ہوا اور آپ نے اپنی اس نادان قوم کے لئے معافی اور بخشش کی یہ دعا شروع کر دی۔

رب اغفر لقومی فانہم لا یعلمون (مسلم - عن ابن مسعود ج ۱ ص ۱۰۸)

”خداوند! میری قوم کو معاف کر دے یہ لوگ بے خبر ہیں“

اس حدیث پر پہلے وضاحت سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

بیرمعونہ کے واقعہ پر بدو عادی:

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے جس موقعہ پر ظلم و ستم کی شدت سے متاثر ہو کر بددعا کی وہ موقعہ بیرمعونہ کے حادثہ کا ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر بہترین حافظِ قرآن شہید کر دیئے گئے، یہ لوگ دھوکہ دے کر دعوتِ دین کے لئے بلائے گئے اور راستہ میں رعل و ذکوان قبائل نے حملہ کر کے نہایت سفاکی کے ساتھ ان بزرگوں کو قتل کر دیا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ظلم پر بے حد افسوس ہوا، آپ نے اس حادثہ کے بعد ایک ماہ تک صبح کی نماز میں قنوت پڑھی اور ان ظالموں کے لئے بددعا کی۔

یہ حادثہ اس قدر سنگین تھا کہ خدا تعالیٰ نے ایک ماہ تک آپ کو بددعا کرنے کی مہلت دیدی اور پھر ایک ماہ کے بعد یہی آیت جبریل امین نے آپ کے سامنے دوبارہ پیش کی، گویا آپ کو پھر

توجہ دلائی کہ آپ کا اصل مقام یہ ہے کہ آپ عفو و کرم سے کام لیں۔

امام بخاریؒ نے آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تحت باب التفسیر میں حضرت ابو ہریرہؓ سے رعل و ذکوان کے واقعہ میں اس آیت کا نازل ہونا بیان کیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت پاک احد کے موقع پر نازل ہوئی اور بیر معونہ کے واقعہ پر خدا تعالیٰ نے اس آیت کی طرف توجہ دلائی۔ — بیر معونہ کا واقعہ احد کے چار مہینہ بعد پیش آیا (فتح الباری ج ۹ ص ۱۸۳) تیسرا واقعہ:

ایک واقعہ غیر مشہور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۳۲ میں نقل کیا ہے لکھتے ہیں:

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال کیا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیچھ کر کے جانے لگا اور اس گستاخ کی شرم گاہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھل گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس گستاخانہ انداز پر سخت غصہ آیا اور آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے لئے بددعا یہ جملے زبان سے نکال دیئے۔ اس پر آیت پاک اتری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس غصہ کے غیر مناسب ہونے پر توجہ دلائی پھر یہ شخص مسلمان ہو گیا اور اچھا مسلمان بنا۔

یہ واقعہ قاضی صاحبؒ نے مرسل غریب کہہ کر نقل کیا ہے اور مشہور محدثین میں سے کسی محدث اور مفسر نے بیان نہیں کیا۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بیان القرآن ج ۲ ص ۵۶ میں اس موقع پر ایک سوال قائم کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب احد کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بددعا کرنے سے روک دیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ بددعا کرنا آپؐ کی شانِ اقدس کے مناسب نہیں تو آپؐ نے بیر معونہ کے حادثہ پر رعل و ذکوان کے قبیلوں کے خلاف بددعا کیوں کی؟

مولانا کا جواب ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

”ممكن ہے آپ نے بقرینہ تخصیص ضما کر اس حکم کو اہل اُحد کے ساتھ خاص سمجھا ہو یا بالخصوص یتوب علیہم سے اشارہ ان کے احتمال ایمان کا بھی معلوم ہوتا ہے رعل و ذکوان میں یہ مواقع ظاہر نہ تھے، اس لئے بددعا فرمادی ہو اور وہی آیت دوبارہ وحی سے یاد دلائی گئی ہوتا کہ آپ کو حکم کا عام ہونا معلوم ہو جاوے۔ اور جانتا چاہئے کہ آپ کا بددعا فرمانا اس کا قصد کرنا اجتہاد تھا، نہ وحی سے اذن ثابت تھا، نہ ممانعت، پس عصمت کے منقطع کوئی اشکال لازم نہیں“

مؤلف عرض کرتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بددعا کرنے سے اُحد اور بیرمونیہ کے موقع پر باقاعدہ روکا گیا، لیکن اس سے پہلے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف حبشی سختیوں سے گزرے مگر آپ کی زبان اقدس پر کبھی دشمنوں کے لئے ہلاکت کی بددعا جاری نہیں ہوئی۔ اور غزوہ اُحد اور بیرمونیہ کے بعد تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے اصرار پر جو کچھ فرمایا وہ حضرت ابوہریرہ کی زبانی اور امام مسلم کی حدیث میں گزر چکا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ اور وَإِنَّكَ لَتَعْلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ

جیسی آیات کی زندگی ہی میں نازل ہو چکی تھیں اور آپ کو اپنے ابتدائی دور ہی میں اپنے رحمتہ عالم اور صاحب خلق عظیم ہونے کا پورا پورا احساس اور علم تھا، جب کہ آپ کی پوری عملی زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔

چور کے حق میں بددعا کرنے سے روکا:

امام ابوداؤد نے حضرت عطار سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں چوری ہو گئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عقد میں چور کو بددعا دینی شروع کر دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ لَا تَسْبَحِي عَنْهُ۔ ”عائشہ رضی اللہ عنہا اس کے بوجھ کو ہلانے کو“

(ابن کثیر سورہ نساء ج ۱ ص ۵۷۱)

انسان کی عام فطرت یہ ہے کہ وہ تکلیف پہنچانے والے کو بددعا کے ذریعہ تکلیف میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بددعا سے روکنے کے لئے نفسیاتی انداز اختیار فرمایا اور ان سے کہا، عائشہ رضی اللہ عنہا! تم اس چور کے حق میں بددعا کر کے اس سے بدلا لے رہی ہو اور اس کے جرم کے بوجھ کو ہلکا کر رہی ہو، اگر تم صبر کرو تو اس پر چوری کا گناہ مسلط رہے اور وہ خدا کی طرف سے اس کی سزا پائے۔

بددعا سے روکنے کا اس سے بہتر نفسیاتی طریقہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔  
امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ چور کے حق میں بددعا کرنے کے بجائے یہ دعا کرتی چاہیے۔

اَللّٰهُمَّ اَعِزِّيْ عَلَيِّهِ وَاَسْخَرْجَ حَقِّيْ مِنْهُ ————— ”خداوند! اس چور کے مقابلہ

میں میری مدد فرما اور میرا مال اس سے رلوا دے۔“ (ابن کثیر سورہ نساء ج ۱ ص ۵۷)

**رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر پر آسمانی آفت کا نزول:**

ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ جبریل امین آپؐ کی خدمت میں آئے اور آپؐ کے پاس کھڑے ہو گئے۔

اس اثناء میں اسود بن یثوث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذرا، یہ شخص قریش کے ان پانچ مشہور سرداروں میں سے تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیفیں پہنچاتے اور آپؐ کا مذاق اڑانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اس کے علاوہ چار سردار یہ تھے۔

بنی مخزوم کا ولید بن منیرہ، بنو سہم کا عاص بن دائل، بنی خزاعہ کا حارث بن طلحہ، اسود بن ابی رفیع۔ خدا تعالیٰ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سرداروں کی ایذا رسانی پر ہمیشہ سبر و تحمل اور ذکر الہی کی ہدایت فرماتا رہا، سورہ حجر کی آخری آیت میں تلقین فرمائی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَفْصِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِيْنَ

واعبد ربك حتى ياتيك اليقين ————— ”اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں خرب معلوم ہے کہ



ان لوگوں کی باتوں سے آپ دلی تنگ ہوتے ہیں، تو آپ اپنے رب کی حمد کیجیے اور سجدہ کرینوالوں میں بیٹھے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہیے، یہاں تک کہ یقین کی بات (موت) آجائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کی اس ہدایت کو ہر موقع پر سامنے رکھا اور مبر و تحمل سے مخالفین کی ہر بات کو نظر انداز کیا، لیکن ایک دن خداوند عالم کو خود جلال آگیا اور اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کا آپ کے دشمنوں کو مزاج کھایا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ حضرت جبریل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور حرم پاک میں کھڑے ہو گئے، آپ طواف کر رہے تھے، اس اثنا میں آپ کے ساتھ مذاق کرنے والوں میں سے اسود ادھر سے گذرا، جبریل امین نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اس کے اثر سے اس کے پیٹ میں بیماری پیدا ہو گئی اور وہ اسی بیماری میں مر گیا۔ اس کے بعد ولید بن مغیرہ ادھر سے گذرا، حضرت جبریل نے اس کے پیر کی ایڑی کی طرف اشارہ کیا، اس کی ایڑی میں دو سال پہلے ایک خزاہی شخص کے تیر سے معمولی سی خراش آگئی تھی وہ خراش ایک بڑا زخم بن گئی، اور ولید اسی میں ہلاک ہوا۔

اس کے بعد عاص بن دائل ادھر سے گذرا، جبریل امین نے اس کے تلوے کی طرف اشارہ کیا، اس کے بعد عاص اپنے گدھے پر طائف جا رہا تھا، اس کے اوپر سے نیچے گرا اور اس کے تلوے میں کیل چبھ گئی اور اسی تکلیف میں یہ ہلاک ہوا۔

اس کے بعد حارث بن طلحہ ادھر آیا، جبریل امین نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا اس سے خون کی قے آنے لگی اور وہ بھی اسی میں ہلاک ہوا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ ان سب کا لیڈر ولید تھا، وہی ان سب کو جمع کیا کرتا تھا۔

(ابن کثیر ج ۲ سورہ بقرہ ص ۵۶۰)

نشرعی سیاست کی بنیاد رحمت پر ہے:

جس طرح موجودہ مغربی سیاست کی بنیاد مکر و فریب، جیل سازی اور دھوکہ دہی پر ہے

اسی طرح اسلامی سیاست کی بنیاد رحمت اور شفقت پر قائم ہے، ”احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت“ کے فاضل مصنف مولانا محمد تقی کارمینی ناظم شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شرعی سیاست پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت بہت فاضلانہ اور ٹھوس بحث کی ہے۔

سیاست شرعیہ کیا ہے؟ مصنف نے بتایا:

انہما القانون الموضوع لرعاية الآداب والمصالح وانتظام الأحوال  
 ”سیاست وہ قانون ہے جو آداب و مصالح کی رعایت کرنے اور حالات کا انتظام کرنے کے لئے  
 بنایا گیا ہو۔“ (بحوالہ جامع التقریر الہی تمہ فی لیساسہ ص ۱۰۰)

ان السياسات فعل یفشی من الحاکم لمصلحة یراها وان لم یجد اذک  
 الفعل دلیل خبری — ”سیاست وہ فعل ہے جس کو حاکم و حکمران مصلحت کے پیش نظر  
 مناسب سمجھ کر کرتا ہے، اگرچہ اس فعل کی کوئی دلیل منقول نہ ہو۔“ (بحوالہ جامع التقریر الہی تمہ لیساسہ ص ۱۰۱)

آگے چل کر سیاست کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیاست عادلہ اور دوسری سیاست ظالمہ۔  
 سیاست ظالمہ کو شریعت حرام قرار دیتی ہے اور سیاست عادلہ اختیار کرنے کا شریعت میں حکم  
 دیا گیا ہے اور یہ وہ سیاست ہے جس میں مظلوم کو ظالم سے حق دلوا یا جاتا ہے۔

پھر لکھتے ہیں — یہ سیاست دین کا جزو ہے، بظاہر سیاست شرعیہ کے بعض فیصلے پھیلے  
 منقول احکام کے مطابق نہیں معلوم ہوتے، لیکن حقیقت میں وہ شریعت کے بنیادی مقاصد کے  
 مطابق ہوتے ہیں اور اصطلاح کی رعایت کرتے ہوئے انہیں سیاست کا نام دیا جاتا ہے ورنہ  
 اتماھی عدل اللہ ورسولہ — ”حقیقت میں وہ اللہ اور اس کے رسول  
 صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل ہے۔“ (انظر المحکمہ)

نازل یہ کہ سیاست شرعیہ میں عوام کے دینی اور دنیوی مصالح کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور انہیں  
 نقصان سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سیاست شرعیہ کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے اور اس میں افراط اور تقریط

دونوں ہلاکت برپا کر دیتی ہیں، اس میں بڑی سمجھ بوجھ، بڑی دانائی اور صحت کی ضرورت پڑتی ہے اگر ضرورت سے زیادہ نرمی ہو جائے تو حق تلفی کا دور شروع ہو جائے اور اگر ضرورت سے زیادہ سختی ہو جائے تو ظلم و تشدد کا دور دورہ ہو جائے۔

اسی لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قاضی ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا۔

الفہم الفہم فیما اولی الیث (الطرق العکس) ————— ”جو معاملات پیش آئیں ان میں زیادہ سے زیادہ فہم اور دانش مندی سے کام لینا“

مطلب یہ ہے کہ سیاست شرعیہ کے منصب پر کام کرنے والے خلفاء اور حکام کے اندر جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ علم شریعت کے بعد سمجھ بوجھ اور عقل و فہم کی ہے شرعی سیاست میں مخلوق خدا کو ہر قسم کی سہولت پہنچانے اور ہر قسم کے نقصان سے بچانے کا جو اصول رکھا گیا ہے، اس کی دلیل یہ آیت پاک ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (انبیاء، رکوع ۷) ————— ”اے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم ہم نے آپ کو محض اس لئے بھیجا ہے تاکہ رحمت عامہ کا ظہور ہو۔“  
آیت کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے:

ومن الرحمة الاذن لهم على لسانه صلى الله عليه وسلم في جلب المصالح و دفع  
المفاسد عنهم و معلوم ان للناس مفاخر تجدد و يستجدون الايام فودقوا الاعتبار  
على المخصوص فقط لوقع الناس في المحرج الشديد وهو منات للرحمة (بحوالہ تفسیر  
الاحکام ص ۲۸۸) ————— ”رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ  
تعالیٰ نے آپ کی زبان اقدس کے ذریعہ لوگوں کو زندگی کے فائدے حاصل کرنے کی اور نقصانات  
کو دور کرنے کی اجازت دی ہے اور حالات کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے ہیں  
ایسی حالت میں صرف منصوص (منقول) احکام ہی پر اکتفا کیا جائے تو لوگ تنگی میں مبتلا ہو جائیں  
اور یہ بات رحمت کے خلاف ہے“

اسی لئے فقہاء اسلام نے یہ اصول مقرر کیا ہے:

الاصل فی الاشیاء الاباحۃ (بحوالہ اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۲۱) ————— ”اشیاء میں

اصل اباحت ہے“ ————— یعنی اشیا میں اصل اباحت ہے، البتہ جس چیز کو شریعت حرام قرار دیدے یا عقل اسے بُرا کہے، وہ ممنوع ہو جاتی ہے۔  
چند مثالیں:

اس کی مثالیں دیتے ہوئے علماء نے لکھا ہے۔

(۱) قرآن کریم نے مشرک قوموں کے معبودوں کو بُرا کہنے سے روکا ہے —————  
ولا تسبوا الذین ————— یہ اس بات کی دلیل ہے کہ:

وهذا کالتنبیہ بل کالتصریح علی المنع من الجأئز مثلاً یكون سبباً فی فعل  
ملا یجوز ————— ”جو باتیں جائز ہوتی ہیں شریعت ان سے صرف اس لئے روکتی ہے  
کہ ان کے ارتکاب سے ناجائز باتیں پیدا ہونے لگتی ہیں“  
معبودان باطل کو بُرا کہنے سے معبود حقیقی کو بُرا کہنے کا راستہ کھلتا ہے اور شر و فساد کھڑا  
ہوتا ہے، اس لئے اس سے روک دیا گیا ہے۔

(۲) خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کے ساتھ سخت کلامی کرنے سے  
روک دیا ————— فَتَوَلَّاهُ قَوْلًا لِّیْنَا ————— کیونکہ سخت کلامی سے نفرت پیدا ہوتی  
ہے اور دعوت کے راستہ میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں، حالانکہ خدا تعالیٰ نے موسیٰ و ہارون کو  
یقین دلایا تھا ————— قَالَا رَبَّنَا اِنَّا نَخَافُ اَنْ یَّعْزِطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْفِئَ قَالَ لَا  
تَخَافَا اِنِّیْ مَعُکُمَا اَمْثَمُّ وَاَزٰی ————— ”اس یقین دہانی کے باوجود سخت کلامی سے  
روکا گیا۔

(۳) فرعون نے حضرت موسیٰ سے سوال کیا ————— قَالَ فَمَا بِالْقُرُونِ الْاُولٰی  
رُک ۲۷) ————— ”اے موسیٰ! جو لوگ نئے عقیدہ ”توحید“ سے پہلے مر گئے، ان کا کیا حال ہوا



وہ اب کیسے ہیں؟ — یہ مسئلہ بڑا جذباتی ہے عوام کو اپنے بڑوں کے ساتھ عقیدت ہوتی ہے، ان کے بارے میں وہ کوئی بُرا لفظ سنتے کو تیار نہیں ہوتے، فرعون کا مقصد تھا کہ موسیٰ پچھلوں کے لئے کوئی بُرا لفظ کہیں اور عوام میں ان کے خلاف مخالفت کا جذبہ پیدا ہو لیکن حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو اپنے مقصد میں ناکام کر دیا اور جواب دیا — — — — — علمہا عند ربی فی کتاب (طہ رکوع ۲) — — — — — ”ان لوگوں کا علم میرے خدا کو ہے جو کتاب میں محفوظ ہے“ یہ جواب حضرت موسیٰؑ نے شرعی سیاست کے تحت دیا جس میں عظیم دینی مصلحت پوشیدہ ہے، اگر آج لوگ اس کا لحاظ رکھیں تو مذہبی اور سیاسی جھگڑے کھڑے نہ ہوں۔

یہی وہ شرعی سیاست و مصلحت ہے جسے دین کا جزو قرار دیا گیا ہے اور صیہ کرامؑ نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔

ان الصحابة رضوان الله عليهم سئلوا امورا المطلق المصلحة لا لتقدم شاهد یا لا اعتبار (حالات زمانہ کی رعایت ص ۱۲۴ بحوالہ تبصرہ الاحکام ص ۴۵) — — — — —

”تمام صحابہ کرام بہت سے معاملات میں مصلحت کا لحاظ رکھتے تھے، جب کہ ان معاملات میں ان کے سامنے کوئی شاہد موجود نہیں ہوتا تھا“

(۵) اجتماعی زندگی میں شرعی سیاست پر عمل کرنے کی بہترین مثال ”صلح حدیبیہ“ کا معاہدہ ہے اس معاہدہ میں بعض دفعات ایسی تھیں جو کسی طرح قابل قبول نہ تھیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت دُور اندیشی کے ساتھ مستقبل پر نظر رکھی اور ان دفعات کو قبول فرمایا، حالانکہ اس سے صحابہ کرام کے جذبات مجروح ہوئے۔

(۶) صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ معظمہ میں قحط پڑا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور میں دین کے برسرِ پیکار دشمنوں کی ہر ممکن مدد فرمائی تاکہ یہ لوگ قحط میں ہلاک نہ ہوں، اس میں بھی آپؐ نے شرعی سیاست کے تحت رحم و کرم سے کام لیا اور مستقبل کے مفاد پر نظر رکھی، وقتی غصہ اور انتقام کے جذبہ کو نظر انداز فرمایا۔

## نہی عن المنکر میں احتیاط :

قرآن کریم نے امر بالمعروف کے ساتھ ہی نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب کسی بُرائی پر روک ٹوک کرنے سے کسی دوسری بڑی بُرائی کے رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو روک ٹوک کرنے سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من رای من امیرہ ما یکرہ فلیصبر (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ والقضاۃ)۔ ”جو شخص اپنے امیر کی طرف سے ناپسندیدہ باتیں دیکھے تو اسے برداشت سے کام لینا چاہیئے۔“

اس باب میں جوش اور جلد بازی کی روش اختیار کرنے سے ملت کے اندر بڑے بڑے فتنے کھڑے ہو چکے ہیں، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے۔ ”اسلام میں جس قدر چھوٹے بڑے فتنے ظاہر ہوئے ہیں، ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بُرائیوں کی روک تھام میں بے تدبیری اور جلد بازی کی روش کو بڑا دخل رہا ہے، لوگوں نے بُرائیوں کو دور کرنا چاہا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے بڑی بُرائیاں پیدا ہو گئیں۔“ (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۸)

ابن قیمؒ نے اپنے استاد علامہ ابن تیمیہؒ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ تاتاری فتنہ کے عہد میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں پر گزرے جو شراب نوشی کا شغل کر رہے تھے امام کے ساتھیوں نے انھیں روکنا چاہا، لیکن امام نے ان کو باز رکھا اور ان سے کہا

انما حرم اللہ الخمر لانھا تصد عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ وهو لا یصدھم الخمر عن قتل النفوس وسمی الذریۃ و اخذ الاموال قد علمہم۔ ”یعنی خدا تعالیٰ نے شراب سے روکا ہے اس لئے کہ وہ ذکر اللہ اور نماز سے باز رکھتی ہے لیکن یہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ انھیں شراب نوشی کا مشغلہ قتل و غارت گری اور لوٹ مار سے روکتا ہے، لہذا انھیں اس مشغلہ میں لگا رہنے دو۔“ (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۹)

ایک حاکم وقت اور قاضی شریعت کو حالات زمانہ اور انسان کی نفسیات اور اس کے مخصوص

مزاج کا کتنا لحاظ رکھنا چاہئے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے مصنف نے یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ پر حد جاری کر دیجئے، آپ نے فرمایا: — اَلَيْسَ قَدْ صَلَّيْتَ مَعَنا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ عَفَا لَكَ ذَنْبَكَ اَوْحَدَكَ — ”یعنی کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے، اس نے کہا، ہاں پڑھی ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارا قصور معاف کر دیا“ معاف کرنے کا اس شخص پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے شراب نوشی سے توبہ کر لی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے کوڑوں کے خوف سے شراب چھوڑنے میں میں اپنی توبہ سمجھتا تھا، لیکن جب آپ نے معاف کر دیا تو خدا کی قسم! میں اس ملعون شے کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ (اعلام الموقعین فصل فی تغیر الفتویٰ)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی طبیعت کا اندازہ لگایا کہ یہ شخص ایک خود دار اور شریف فطرت رکھتا ہے اور اس پر سزا جاری کرنے کے مقابلہ میں معاف کرنے کا فعل زیادہ اثر ڈالے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

## مجرموں کے ساتھ عادلانہ اخلاق

قوت ، شجاعت ، جرأت ، عدالت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جس طرح رحم و کرم اور صبر و حلم کی صفات کمال درجہ موجود تھیں، اسی طرح شجاعت اور جرأت کی صفت بھی اپنی مکمل شان کے ساتھ آپ کے اندر جلوہ گر تھی۔

تاریخ نے ایسے بہادروں کے نام بتائے ہیں جو جنگ و پیکار میں شیروں کی طرح دشمن سے رٹے ہیں لیکن تاریخ نے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا شجاع اور بہادر شاید ہی دیکھا ہو۔ آپ میدانِ جنگ کے بھی بہادر تھے اور میدانِ امن کے بھی، اور یہ شجاعت کا وہ کمال ہے جو ایک ہی ذات میں بہت کم جمع ہوتا ہے، جنگ کے ماہر صلح میں فیل ہو جاتے ہیں اور صلح دامن کے تم بردار جنگ و پیکار کے وقت ناکام ہو جاتے ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بدر و احد اور حنین کے معرکوں میں ایک بہادر سپہ سالار تھے اور حدیبیہ کے میدان میں ایک امن پسند اور صلح جو رہنما، احد اور حنین کے معرکوں میں رفیقوں نے ساتھ چھوڑ دیا مگر رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تنہا دشمنوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہے پھر حدیبیہ میں منافقوں نے امن و صلح کا ہاتھ بڑھایا تب بھی تمام رفیق و جاں نثار بدلتی اور ناامیدی کا شکار ہو گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی ہر شرط کو تسلیم کرنے صلح کر لی اور امن کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، جو تلوار لے کر آیا اسے پوری جرأت سے روکا اور جو صلح کے لئے آگے بڑھا، اسے اسی حوصلہ کے ساتھ سینہ سے لگالیا۔

اسی شجاعت کی ایک قسم یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں پر قانونِ انصاف نافذ کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہ ہو، حق کے راستے میں، نہ دشمنوں کا خوف رکاوٹ بنے اور نہ دوستوں کی محبت آڑے آئے اور شجاعت کی اسی قسم کا نام عدالت ہے۔



ذیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بے لاگ عدل و انصاف کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔  
**قانونی انصاف اپنی ذات سے بدلہ:**

غزوہ بدر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کی صفیں سیدھی کر رہے تھے، آپ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا، آپ اس تیر کے اشارہ سے لائن سیدھی کرتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے کہ حضرت سواد بن غزیہ لائن سے باہر نکلے ہوئے ملے، آپ نے ان کے پیٹ میں نیزہ چھبوا کر فرمایا:  
**اِسْتَوِيَا سَوَادُ! ————— "سواد لائن میں ہو جاؤ۔"**

سواد نے کہا ————— **اَوْجَعْتَنِيْ وَ قَدْ بَعَثْتَ اللّٰهَ بِالْحَقِّ فَاَوْقِدْنِيْ**  
 "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے تکلیف پہنچا دی، خدا نے آپ کو حق کیساتھ بھیجا ہے مجھے بدلہ دیجئے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اپنا پیٹ کھول دیا اور فرمایا:  
**اِسْتَوْ قَدْ يَا سَوَادُ! ————— "سواد بدلہ لے لو۔"**

سواد اپنے آقا سے پیٹ گئے اور آپ کے پیٹ کو چوم لیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
**سواد یہ کیا کیا؟ سواد بولے:**

یا رسول اللہ! حَضَرَمَاتِيْ فَلَمْ اَمِنْ الْقَتْلِ فَارَوْتُ اَنْ يَّكُوْنَ اٰخِرَ الْعَهْدِيْنَ  
 اِنْ يَّسَّرَ جِدِّيْ جِلْدَكَ قَدْ عَاكَ رَسُولُ اللّٰهِ بِخَيْرٍ ————— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ دیکھتے ہیں موت سامنے ہے، میں موت سے نہیں بچ سکتا، میں نے سوچا، کہ آخری وقت میں آپ کے جسم اقدس کو چھپا لوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد کے لئے دُعا فرمائی۔"

بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ ہے، مگر ایک طرف انصاف حاصل کرنے کے لئے بے باکی اور دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انصاف پسندی اور خدا ترسی کی ایک سبق آموز داستان اس میں پوشیدہ ہے۔  
**مسلمان کے قاتل پر غصہ:**

معلم بن جہام نے ایک لڑائی میں عامر کو قتل کر دیا، معلم جب عامر کی طرف حملہ کرنے آئے تو عامر نے اسلام کا سلام، السلام علیکم کیا، معلم اور عامر کے درمیان زمانہِ جاہلیت سے کچھ رنجش

چلی آرہی تھی، معلم نے موقع غنیمت جانا اور عامر کے السلام علیکم کہنے کے باوجود ان پر تیر چلا کر قتل کر دیا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا، معلم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس غلطی پر معافی چاہی، ایک بے قصور مسلمان کے قتل کا مسئلہ تھا جو حق کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذاتی رنجش کی بنا پر قتل کیا گیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم سے فرمایا:

لَا عَقْرَ اللَّهُ لَكَ ————— ”خدا تجھے اے معلم! معاف نہ کرے“، معلم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی دیکھ کر کھڑے ہو گئے، آنکھوں سے آنسو جاری تھے ————— دَهْوَيَتَلْقَى دُمُوعًا بِبُودَيَيْنِ ————— ”چادر کے کونوں سے آنسو پونچھتے ہوئے چلے گئے معلم پر سات دن نہیں گزرنے پائے کہ معلم کا انتقال ہو گیا، لوگوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق معلم کو دفن کر دیا، لیکن ————— فَلَفَظَتْهُ الْأَرْضُ ————— ”زمین نے معلم کی نعش کو باہر بھینک دیا، صحابہ کرام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ————— الْأَرْضُ تَقْبَلُ مَنْ هُوَ شَرٌّ مِّنْ صَاحِبِكُمْ وَالِئِنَّ اللَّهَ أَرَادَ أَنْ يَعْظِمَكُمْ ————— ”زمین نے اس شخص سے زیادہ بُرے آدمی کو قبول کر لیا ہے، لیکن خدا تعالیٰ تم لوگوں کو نصیحت کرنا چاہتا ہے اس لئے معلم کی نعش کو زمین نے قبول نہیں کیا“

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم کی نعش کو پہاڑ کی وادی میں بھینکوا دیا اور اس پر پتھر ڈلوادئے (سورۃ نساء، ابن کثیر ج ۱ ص ۵۲۹، ۲۲۸۰)

ایک طرف اپنی اُمت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا یہ حال کہ کسی صحابی کا منوم چہرہ آپ سے برداشت نہ ہوتا اور ہر اُمتی کی بے چینی آپ کو بے چین کر دیتی اور دوسری طرف سختی کا یہ عالم کہ ایک مجرم اُمتی کی درخواست معافی ٹھکرا دی جاتی ہے اور ایک غلام کی روتی ہوئی آنکھیں بھی آپ کے دل کو نرم نہیں کرتیں ————— یہ فرق تھا اجتماعی جرائم اور انفرادی گناہوں کا انفرادی گناہوں میں عفو و درگزر کی شان غالب تھی اور اجتماعی جرائم میں سخت گیری کا رویہ تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے حاکموں اور حکمرانوں کو ہدایت کرتے ہوئے نصیحت فرمائی۔ اَقِيْمُوا اَحَدُودَ اللّٰهِ عَلٰی الْقَرِيْبِ وَالْبَعِيْدِ وَلَا تَاْخُذْكُمُ فِي اللّٰهِ تَوَمَّةٌ لَا مِثْمَ (ابن ماجہ کتاب الحدود)۔ ”اے حکام و امراء! خدا کے مقرر کردہ قوانین کو دُور اور قریب، رشتہ دار اور اجنبی سب پر یکساں طور پر جاری کرو، اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کرو۔“

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ یہ آپ کی اصلاح کو ششوں کی کرامت تھی کہ جو معاشرہ جرائم کا عادی تھا اور برائیاں اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں وہ بہت جلد برائیوں سے پاک ہو گیا۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چوری، بدکاری اور شراب خواری کے جو چند واقعات ہوئے وہ تہہ ہونے کے برابر تھے اور ان واقعات سے بھی یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ آپ نے عرب کے معاشرہ میں خوفِ خدا اور خوفِ آخرت کا جذبہ اس قدر بھریا تھا کہ کوئی شخص اگر انسانی خواہش سے مغلوب ہو کر بُرائی کر بیٹھتا تو وہ فوراً بے چین ہو جاتا اور اپنے آپ کو اس بُرائی کے اثر سے پاک کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور اپنے اوپر شرعی سزا جاری کر لیتا۔

### اسلام کے تعزیری قوانین کی سختی:

آج کا جدید انسان اسلام کے تعزیری قوانین کو معاذ اللہ دورِ وحشت کی یادگار قرار دیتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹنا، بدکار کو کوڑے لگانا یا سنگ مار کر دنیا، شرابی پر کوڑے برسانا وغیرہ یہ سزائیں ان لوگوں کے نزدیک جہالت کے دور میں تو مناسب تھیں، آج اس دورِ تہذیب میں کسی طرح موزوں نہیں ہیں لیکن اسلام انسانی معاشرہ کو اخلاقی آوارگیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے سخت سے سخت تدابیر اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتا، اور اس کا نتیجہ اسلام کا دورِ اول یہ پیش کرتا ہے کہ عرب کے بگڑے ہوئے سماج میں چند سزائیں نافذ کر کے اسلام نے لاکھوں انسانوں

کو ہر قسم کی ناقانونیت اور آوارگی سے بچایا، اور انسانی معاشرہ چہری بدکاری جوے اور شراب کی لعنت سے محفوظ ہو گیا۔

آج کی مہذب دنیا نے جرائم کی سزاؤں میں تو تخفیف کر دی لیکن پورے معاشرہ کو جس طرح برائیوں کا گہوارہ بنا دیا وہ آنکھوں کے سامنے ہے اور انسانیت اس سے رزہ بر اندام ہے۔ عدل و مساوات کے معاملہ میں آسمانی فہمائش قانون بنانے کا حق اسلام میں: اسلام میں قانون بنانے کا حق صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی حاکم حقیقی ہے وہی خالق و مالک ہے، وہی اس قابل ہے کہ اپنی مخلوق کو زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ بتائے، قرآن کریم نے کہا: **أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ** (سورہ اعراف رکوع ۷)

”سُن لو اُسی کا کام ہے پیدا کرنا، اور حکم فرمانا، بڑی برکت والا ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔“ مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں ————— پیدا کرنا خلق ہے اور پیدا کرنے کے بعد کوئی یا شرعی احکام دنیا یہ ”اُمُر“ ہے اور دونوں اسی کے قبضہ و اختیار میں، اس طرح وہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہوا (حامل شریف ص ۲۰۴)

مولانا احمد سعید صاحب دہلوی فرماتے ہیں ————— تخلیق اور حکمرانی کا وہی سزاوار ہے پیدا کرنا اور حاکم ہونا اسی کے لئے خاص ہے اس نے عرش کو تمام امور کی تدبیر کا مرکز اور اجرائے احکام اور حکومت الہی کا منظر مقرر کیا (کشف الرحمان ص ۲۵۰)

سکونینی احکام کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہر شئی کو پیدا کیا اور پھر اس کی فطرت میں اس بات کا علم و شعور رکھا کہ وہ کس طرح زندگی گزار سکتی ہے، مرغی کا بچہ انڈے سے نکلے ہی دست اور دشمن میں تمیز کرنے لگتا ہے ————— چیل، کوئے کو دیکھ کر ڈرتا ہے اور ————— اپنی ماں (مرغی) کو دیکھ کر اس کے پیچھے دوڑتا ہے، وہ پیدا ہوتے ہی زمین میں سے اپنی خوراک حاصل کرنے لگتا ہے، اسی طرح ہر پرندے اور چرندے میں زندہ رہنے کا یہ قطری شعور دیکھا جاسکتا ہے



تشریحی احکام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے شریعت کا قانون عطا فرمایا، اعتقاد عمل کا ایک مکمل نظام دیا جس پر چلنا ہر انسان کے لئے ضروری قرار دیا۔ پس اگر تکوینی ہدایت (فطری شعور) خالقِ عالم کے سوا کسی کی طرف سے نہیں اور نہ یہ قدرت خدا کے سوا کسی کے اندر موجود ہے اور اس سے کسی انسان کو انکار نہیں تو پھر اتنے بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ صاحب اختیار مخلوق (انسان) کو اس کی بے اختیار زندگی کے لئے قانون دینے کا حق بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں اسی بات کا اعلان سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا

اور کہا: قَا نَسْمَعُ عِندَ رَبِّي الْاٰدَبَ الْعٰلَمِيْنَ الَّذِي خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِيْ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِيْ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِيْ وَالَّذِيْ يُمِيتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِيْ وَالَّذِيْ اَطْعَمَ اَنْ يَّخْضِرَ لِيْ خُطِيْبَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (سورہ شعراء: ۷۷ تا ۸۲) ————— ”یہ معبودانِ باطل

میرے دشمن ہیں، مگر پروردگار سارے جہان کا، جس نے پیدا کیا مجھے اور وہ ہدایت دیتا ہے مجھے، جو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے مجھے، اور جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہ شفا عطا کرتا ہے اور وہی مارتا اور جلاتا ہے اور اسی سے مجھے امید ہے کہ وہ نبخشے گا، میری خطا قیامت کے روز“

یہی اعلان حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يُوسُفُ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقًا ثُمَّ هَدٰی (سورہ طہ) آیت ۵، ۵۱) ————— ”فرعون نے کہا، اے موسیٰ اور ہارون! تمہارا پروردگار کون ہے، موسیٰ نے کہا، وہ ہے جو پیدا کرتا ہے پھر ہدایت دیتا ہے“

ان دونوں جلیل القدر رسولوں نے خداوندِ عالم کا تعارف خالقیت اور حاکمیت کی صفات کا سے کرایا یعنی خدا وہ ہے جو پیدا کرتا ہے اور پھر پیدا کر کے اپنی مخلوق کو یونہی بھٹکتا ہوا اور بے مہار نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اسے زندگی کا طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ اسی کا نام ہدایت ہے جس کی دو صورتیں ہیں (۱) بے اختیار مخلوق میں تکوینی اور فطری علم و شعور عطا کیا (۲) اور با اختیار مخلوق (انسان) کی زندگی کے با اختیار حصہ کے لئے شریعت کا قانون (وحی الہی) عطا فرمایا۔

## قانونِ شریعت کی نگرانی خدا کی طرف سے:

پس جب یہ بات ثابت ہے کہ حکومت و فرماں روائی اور قانونِ شریعت بنانے کا حق صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے تو یہ بات بھی مسلم ہے کہ اپنے قانون کی حفاظت اور قانون پہنچانے والے رسولوں کی کارگزاری پر نظر رکھنے کی ذمہ داری بھی خدا تعالیٰ کے اوپر ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے جن خاص بندوں (رسولوں) کو اپنے قانونِ شریعت کی تبلیغ و دعوت کے لئے منتخب کیا وہ سب کے سب معصوم اور فکر و عمل کی ہر خطا سے محفوظ تھے البتہ کبھی کبھی ان مقدس رسولوں سے معمولی لغزش سرزد ہو جاتی تھی اور یہ حضرات کسی دینی مصلحت کے پیش نظر بہت اچھے، راستہ کو چھوڑ کر اچھا راستہ کر لیتے تھے اور ان حضرات کا یہی فعل ان کی شانِ ارفع کے مطابق ان کے حق میں لغزش بن جاتا تھا اور پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے ان پر فہمائش نازل ہوتی تھی اور اس فہمائش اور اتباہ کے واقعات رسولوں کی زندگی میں اس لئے پیش آتے تھے تاکہ دُنیا کو یہ بات بتادی جائے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی وحی اور آسمانی قانون کی تبلیغ و حفاظت اور اسے عملی جامہ پہنانے میں کس قدر سخت نگرانی سے کام لیا ہے۔

اس سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ خطاب بڑا سبق آموز ہے۔  
 وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَادِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۚ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (سورہ حاقہ رکوع ۲ آیت ۴۴ تا ۴۷)  
 ”اور اگر وہ رسول ہماری طرف کوئی بات غلط طور پر منسوب کر دیتے تو ہم انہیں سید ہاتھ (قوت) سے پکڑ لیتے پھر ہم ان کی شہ رگ قطع کر دیتے پس تم میں سے کوئی انہیں بچاؤ والا نہ ہوتا۔“

## سیاسی اور قانونی انصاف پر فہمائش

بشیر بن ابیرق کا واقعہ:

سورہ نسا رکوع ۱۵ میں بشیر بن ابیرق کی چوری کے واقعہ پر حضرت حق نے تبصرہ کرتے

ہوئے فرمایا:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ بِالْحَقِّ لَتَحْكُمَ بَيْنَ الَّذِينَ يَدْعُونَكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنُ  
لِلْمُفْسِدِينَ وَصِيماً وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُوراً رَحِيماً وَلَا تَجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ  
يَخْتَلِفُونَ أُنْفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّاتاً أَثِمًا ————— ”لے نبی! ہم نے

یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے تم اس کے  
مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، مگر بددیانتی کرنے والوں کی حمایت میں جھگڑنے والے نہ بنو۔  
اللہ تعالیٰ سے درگزر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگزر کرنے والا اور مہربان ہے، جو اپنے نفس کے  
ساتھ خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو، اللہ تعالیٰ کو خیانت والوں اور گناہ پیشہ انسان پسند نہیں  
اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ انصار کے قیدی بنی ظفر میں ایک منافق طعمہ یا بشیر بن ابیرق نے

رفاعہ بن زید انصاری کی زرہ چرائی اور اسے ایک یہودی کے پاس رکھوا دیا، زرہ کے مالک نے حضور  
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس استغاثہ کیا اور بشیر پر اپنا شبہ ظاہر کیا، بشیر اور اس کے خاندان والوں  
نے چوری کے الزام سے اپنے آپ کو بری ظاہر کر کے اس یہودی کے سر پر الزام تھوپ دیا، یہودی  
سے معلوم کیا گیا تو اس نے اس چوری سے بے تعلقی ظاہر کی، بشیر کے خاندان والوں نے اپنے  
آدمی کی زبردست حمایت اور وکالت کرتے ہوئے کہا کہ یہ یہودی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ  
علیہ وسلم کا دشمن ہے۔ اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جانا چاہیے، بلکہ ہم مسلمانوں کی بات کو صحیح سمجھنا  
چاہیے۔ ————— سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمہ کی روداد کو دیکھ کر بشیر کے خاندان والوں  
کا اعتبار فرمایا اور اس یہودی کے خلاف فیصلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس پردہ حجب الہی نازل ہوئی اور خدا تعالیٰ کی طرف سے جھوٹ اور سچ کی حقیقت ظاہر ہو گئی  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک قاضی اور جج کی تھی، جس پر ظاہری واقعات کی  
بنیاد پر فیصلہ دینے کی ذمہ داری ہوتی ہے، نہ کہ حقیقت حال پر کیونکہ حقیقت حال علام الغیوب  
پروردگار کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا، اس لئے سرکار اقدس اگر مقدمہ کی روداد پر فیصلہ فرمادیتے  
تو اس میں آپ کے لئے کوئی گناہ کی بات نہ ہوتی، آخرت کی ذمہ داری تو اس فریق پر عائد ہوتی

جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غلط رو داد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلہ حاصل کرتا۔ مگر اس وقت جب کہ حق و باطل کے درمیان زبردست کش مکش برپا تھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم رو دادِ مقدمہ کے مطابق فیصلہ صادر فرما دیتے تو مخالفین کو اسلام کے خلاف اور ہادی اسلام کے خلاف شور مچانے کا موقع مل جاتا اور وہ لوگ کہتے کہ ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بے لاگ عدل و انصاف کی کوئی قیمت نہیں، یہ تو طرف داری سے کام لیتے ہیں اور حق و انصاف کے معاملہ میں بھی مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان تمیز کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے اسلام کے خلاف اس پروپیگنڈہ کا سد باب کرنے کے لئے بروقت مداخلت فرمائی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ یہودی بالکل بے تصور ہے اور اہل مجرم بشری منافق ہے اور پھر اس کے حمایتی مسلمان ہیں۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے ان مسلمانوں کی مذمت فرمائی ہے جو قبیلہ اور خاندان کی پیروی کر رہے تھے اور انصاف کے معاملہ میں اپنے اور پرانے کے درمیان تفریق کر رہے تھے۔

آیات کریمہ میں براہِ راست خطاب چہ نہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا ہے جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجرموں کی حمایت اور بے تصور یہودی کی طرف سے بدگمانی کرنے میں انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کیا اس لئے خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت فہمائش فرمائی۔

حالانکہ اصولی طور پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو رویہ اس معاملہ میں اختیار کیا گیا اس میں کسی قسم کی معصیت اور گناہ کا صید و نظر نہیں آتا، آپ نے بشریہ کے خاندان کی نیک شہرت اور ان کے اسلام کو دیکھ کر ان پر الزام لگانے والوں سے صرف یہ فرمایا:

عمدت الی اہل بیت ذکر منہم اسلام وصلاح تو میہم یا لسرقۃ علی غیر ثبت ولا بینۃ (ابن کثیر ج ۱ ص ۴۰۳) ————— ”تم لوگ ایسے گھرانے پر الزام لگا رہے ہو جن کے اسلام اور نیکی کا ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ تمہارے پاس نہ ثبوت ہے اور نہ گواہ“



اسلام میں کسی مسلمان کے بارے میں حسن ظن رکھنا خود ایک بہت بڑی نیکی ہے، آپ کے سامنے نبو ابیرق کے خاندان کی عام نیکیاں تھیں اور اصلی مجرم بشیر کے نفاق کا حال سرد، دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوشیدہ تھا، اس لئے چوری کے قانونی ثبوت کے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاندان والوں پر چوری کا الزام لگانے سے منع کیا۔

خدا تعالیٰ نے حقیقتِ حال کا انکشاف کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبو ابیرق کی صفائی کرنے اور ان کی حمایت کرنے سے روک دیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم وحی الہی کے بعد اپنے میلان اور حسن ظن کو ختم کر دیا۔

خدا تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کرنے کا حکم صرف اتنی سی بات پر دیا کہ حضور کے دل میں اس واقعی مجرم خاندان کی طرف سے نیکی کا یہ میلان بھی کیوں آیا، یہ بات گناہ اور معصیت نہیں صرف مرتبہ نبوت کے لحاظ سے خلافتِ شان ہے۔

خلافتِ شان ہونے پر اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دُعا و مغفرت کرنے کی ہدایت فرمائی گئی آیات میں خیانت کاروں کی طرفداری اور جھگڑا کرنے سے ممانعت کی گئی ہے، اس ممانعت اور نہی کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس کا ارتکاب ہوا، کسی فعل سے روکنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس فعل کا، صنی میں سدور بھی ہوا، بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص کو آئندہ کے لئے اس فعل سے سدکا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ مجرم ہیں، اگر آپ اس انکشاف کے بعد بھی ان کی طرفداری کریں گے جیسا کہ آپ سے اس کی اُمید نہیں تو یہ بات غلط ہوگی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی موصوم و محفوظ ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے گناہ سے پاک اور بے خطر تھے، پھر آپ کو آئندہ کے لئے بے جا طرفداری کرنے سے صفا کیوں روکا گیا؟ کیا اس گناہ کا آپ کی طرف سے امکان تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کی امت کو اس حکم سے آگاہ فرماتا ہے، براہِ راست خطاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے اور سنانا مقصود ہوتا ہے

آپ کی اُمت کو قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے، جو لوگ اس قرآنی اسلوب سے واقف نہیں وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

**معاشرتی مساوات کے معاملہ میں فہمائش:**

سیاسی انصاف اور قانونی مساوات کے سلسلے میں وحی الہی کی نگرانی کا واقعہ آپ نے اذہر پڑھا، اسی طرح ایک واقعہ معاشرتی مساوات کے سلسلہ میں بھی سیرت پاک کے اندر موجود ہے۔ تفسیر اور حدیث کی مشہور کتابوں میں سورہ کہف کی آیت ۲۸ کے شان نزول میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ عرب کے بڑے بڑے سردار، اقرع بن حابس تمیمی، عیینہ بن حصن خزازی، عباس بن مرداس سلمی وغیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ فقراء مہاجرین اور ہمارے درمیان ملاقات کا الگ الگ دن مقرر کر دیجئے، ایک دن ہم آپ کے پاس آئیں اور آپ کا پیغام سنیں اور ایک دن وہ لوگ آئیں، کیونکہ بلال صہیب سلمان، ابوذر، خباب، عمار، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم ورضوانہ جیسے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ ایک مجلس کے اندر بیٹھنے میں ہم اپنی توہین محسوس کرتے ہیں اور ہمیں ان کے کپڑوں میں سے بدبو آتی ہے۔

شكوا الى النبي التاذي براحتهم من اخلاق النبي ص (۱۰۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی شدید خواہش رکھتے تھے کہ یہ مغرور سردار کسی طرح خدا کا پیغام سنیں، اس شوق و رغبت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان کا یہ مطالبہ منظور کر لیا جائے۔

فاجابهم رسول الله صلى الله عليه وسلم رغبة في تقوية الاسلام بهم —  
پس آپ کے اس رجحان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات نازل ہو گئیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهًا  
وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْنَتْ قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا  
وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ مَرْطَاوًا كُلِّ لَاحِقٍ مَنْ رَزَيْكُم مِّنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ  
فَلْيُكْفُرْ (کہت: ۲۸، ۲۹) — اور آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھئے

جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں صرف اس کی خوشنودی کے لئے اور آپ اپنی نظریں ان کو چھوڑ کر ان پر نہ نگاہیں جو دنیا کی زیب و زینت کے طلبگار ہوتے ہیں اور آپ ان کا کہنا نہ ماننے جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کے پیرو ہیں اور ان کا معاملہ حد سے نکلا ہوا ہے اور آپ کہہ دیں کہ حق خدا کی طرف سے ہے پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جو چاہے اس کا انکار کرے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤسائے قریش کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ دوسرے کیا گیا، ایک مرتبہ سورہ کہف کی مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور ایک مرتبہ سورہ انعام کی آیات ذیل نازل کی گئیں۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهًا مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ لِيَكْرِيمَ مَنْ شِئْتَ فَتَظَرَّدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ (انعام: ۵۲) ————— ”اور آپ ان لوگوں کو دور نہ کیجئے جو رضا الہی کی خاطر اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کرتے ہیں، آپ پر ان کے حساب میں سے کچھ نہیں اور ان پر آپ کے حساب میں سے کچھ نہیں کہ آپ انہیں دور کریں ورنہ آپ زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے“ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں تفسیر وحدیث کی مختلف کتابوں سے شان نزول کی روایات نقل کی ہیں۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ رؤسائے مکہ نے حضرت ابوطالب کے ذریعہ مطالبہ کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ ان کا مطالبہ تسلیم کر کے دیکھ لیجئے کہ یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں یا نہیں؟

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ مطالبہ مان لیا تھا مگر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، جب یہ آیات آئیں تو آپ نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا اور حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر اپنی رلٹے پر اظہارِ افسوس کیا (بیان القرآن کلاں ج ۳ ص ۸۸ سورہ انعام) اسی آیت کے تحت حضرت تھانویؒ نے تبلیغ کی مصلحت پر لکھا ہے کہ ————— ان آیات

فہمائش کر کے قریش کی سازش کو ناکام بنا دیا۔

کالے اور گورے کے امتیاز پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی:

ابو ذر غفاریؓ کا بیان ہے کہ ایک روز ایک سیاہ رنگ والے صحابیؓ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان کو آواز نہ دی۔ \_\_\_\_\_ یا ابن السوداء \_\_\_\_\_؟ اے سیاہ رنگ والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے اور فرمایا۔ \_\_\_\_\_ طفت الصاع ، طفت الصاع \_\_\_\_\_ ”پیمانہ پورا بھر، پیمانہ پورا بھر۔ \_\_\_\_\_ یہ عرب کا ایک محاورہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو پیمانہ بھر کر دے، سب کو ایک پیمانہ سے دے، کسی کو کم اور کسی کو زیادہ نہ دے، انسان انسان کے درمیان امتیاز نہ کر۔ \_\_\_\_\_ اور پھر فرمایا۔ \_\_\_\_\_ لَيْسَ لِابْنِ الْبَيْضَاءِ عَلَى ابْنِ السَّودَةِ فَضْلٌ \_\_\_\_\_ ”کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں“

ابو ذر کہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہ سے میں اس قدر شرمندہ ہوا اور مجھ پر اتنا خوف طاری ہوا کہ میں زمین پر بیٹ گیا اور اس شخص سے کہا — قُمْ وَطَافُطًا عَلَى خَدَّيْ — کھڑا ہو جا اور میرے چہرے کو روند ڈال، میرے منہ کو اپنے قدموں اور پیروں سے مسلسل دے (احیاء ج ۲ ص ۲۰۲) اس منہ سے کیا نکل گیا۔



اس طرح ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مالدار مسلمان کو دیکھا کہ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک غریب مسلمان سے اپنے کپڑے سمیٹ رہا ہے اور دُور بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

اَخْشَيْتَ اَنْ يَّعْدُوَ اِلَيْكَ فَقَرُّهُ؟ ————— ”کیا تجھے ڈر ہے کہ اس کی غریبی تیرے لپٹ جائے گی؟“

### عبداللہ ابن ام مکتوم کا واقعہ:

دوسرا واقعہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا ہے، یہ بزرگ صحابی بھی نادار اور بے کس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کا واقعہ یہ پیش آیا کہ جس دور میں قریش کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی بات چیت کر رہے تھے کہ ہمارے اور ان غنموں کے درمیان اوقات کی تقسیم کر دیجئے اسی دوران ایک روز قریش کے یہ سردار آپ کی خدمت میں موجود تھے کہ اتفاق سے نابینا صحابی عبداللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریشی سرداروں کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں، انھوں نے آکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دینی شروع کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار نہ ہوا کہ اس وقت عبداللہ آئے ہوئے تو اچھا تھا، بس خدا تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بے التفاتی پسند نہ آئی اور سورہ عبس کی یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کی

عَبَسَ وَتَوَلَّى اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّہٗ یَزَكٰیۚ اَوْ یَدَّکُرُ فَنَسَغَہُ

الَّذِیْ کُرِیٰ ————— ”اس نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا، اس بات سے کہ نابینا اس کے پاس آیا، تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ نابینا اپنا تزکیہ کر لیتا یا نصیحت حاصل کرتا اور نصیحت اسے فائدہ پہنچاتی۔“

وحی الہی میں خداوند عالم کی لطیف ناراضگی کا اندازہ دیکھو، پہلے جہد میں نائب کے صیغہ سے خطاب فرمایا، اس نے منہ موڑا۔۔۔۔۔ کہا، تم نے منہ موڑا انہیں کہا، اس لطیف ناراضگی کے بعد فوراً خطاب کا صیغہ بولا۔۔۔۔۔ بس اتنی ہی ناراضگی تھی، زیادہ نہیں۔

ان آیات کے آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کا بے حد احترام فرماتے، عبداللہ جب آپؐ کی خدمت میں آتے تو آپؐ فرماتے مرجأ بن عاتب بنی فیدرجی۔  
”اے عبداللہ! تمہاری وجہ سے میرے رب نے مجھ پر ناراضگی ظاہر فرمائی۔“

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ پیغام الہی نے عدل و انصاف، مساوات اور غریبوں کی دہاری کے معاملہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی پوری پوری نگرانی فرمائی اور اسی نگرانی کی وجہ سے وہ دہر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار، مساوات انسانی اور محبتِ خلق کا بے مثال کردار بن گیا۔

اللہ و ذریت لا ینہر میری  
چیمٹر۔ اسلام آباد

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار میں زہد، قناعت اور ایثار

زہد کا مطلب یہ ہے کہ استعمال کی قوت رکھنے کے باوجود حلال اور مباح چیزوں سے اپنے آپ کو محروم رکھے اور مقصد اپنے نفس کا تزکیہ اور ساتھ ساتھ بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچانا ہو۔ زہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ حلال کو حلال اور مباح کو مباح جان کر اسے پھوڑے اور صرف اپنے نفس کو تکلیف اور اذیت میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہ ہو، اگر ایسا ہوگا تو وہ رہبانیت ہوگی، زہد نہ ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے یا کسی جسمانی عذر کی وجہ سے ترکِ مباح کرے گا تو وہ بھی زہد نہ ہوگا۔

اس وضاحت کے بعد اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ زہد ایک ایسی اخلاقی فضیلت ہے جس میں صبر، قناعت، ایثار، تواضع اور عفت جیسی اخلاقی صفات شامل ہوتی ہیں اور ان تمام صفتوں کے جمع ہونے کے بعد ہی "زہد" جیسی اخلاقی صفت انسان میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں کمالِ درجہ کا زہد موجود تھا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد ایک صاحبِ قدرت و استطاعت کا زہد تھا، اس انسان کا زہد تھا جو مباح کے مباح ہونے پر ایمان و اعتقاد رکھتا تھا، جو ضرورت مندوں کو اور اُمت کے اجتماعی مفاد کو اپنی ذات پر ترجیح دیتا تھا اور اسے مقدم رکھتا تھا۔

آپ کے زہدانہ کردار نے سینکڑوں صحابہ کرامؓ کی تربیت فرمائی، آپ کے زہدانہ اخلاق نے ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور دوسرے رفقاء کو اعلیٰ درجہ کے زہد و ایثار پر قائم کر دیا اور ایک ایسا معاشرہ پیدا کر دیا جو سادگی، صبر اور قناعت کا بہترین نمونہ پیش کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نے ایک دن اپنے والد عمرؓ سے کہا: "ابا جان! سیاسی فتوحات حاصل ہو رہی ہیں، حکومتوں کے نمائندے اور وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے



ہیں، آپ نرم و نازک لباس پہنا کر ہیں، اچھے کھانے تیار کرایا کر ہیں، اس میں سے خود بھی کھایا کریں اور بیرونی مہمانوں کو بھی کھلایا کر ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حصہ باگھر کے آدمی اس گھر کے حالات سے خوب واقف ہوتے ہیں، میں قسم دے کر تجھ سے پوچھتا ہوں کیا تو نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے سال زندہ رہے، اس عرصہ میں آپ نے اور آپ کے اہل بیت نے صبح کا کھانا کھا تو رات کو بھوکے سوئے اور رات کو کھایا تو صبح کو بھوکے رہے۔

اور کیا تو نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے سال زندہ رہے اور آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے کھجوریں بھی پیٹ بھر کر تناول نہ فرمائیں، یہاں تک کہ خیر نفع ہو گیا۔

اور کیا تو نہیں جانتی کہ ایک روز تم گھر والوں نے ایک اونچے دسترخوان (میز قسم کی کسی چیز) پر کھانا رکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی اور آپ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، پھر آپ نے حکم دیا کہ کھانا نیچے زمین پر رکھ دیا جائے۔

اور کیا تو نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چادر کو دوہرا بچھا کر اس پر سویا کرتے تھے اور ایک دن اس کی چار تہیں کر کے بچھا دیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سو گئے، پھر جب صبح کو اُٹھے تو آپ نے فرمایا، تم گھر والوں نے اس بچھونے کے ذریعہ مجھے قیام شب سے روک دیا اسے دوہرا کر کے بچھایا کر دو، جیسا اب تک بچھایا کرتی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سوالات کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت حصہ رضی اللہ عنہ بھی رونے لگیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۹۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی وہ زہد تھا جس نے امت کے غریبوں کو سہارا دیا اور ایک قلیل مدت میں امت مسلمہ تنگی کے دور سے نکل کر خوش حالی کے دور میں داخل ہو گئی۔

تمت بالخیر

طوبی ریسرچ لائبریری

AF:1114





0333-4745084

# رومانی معالج مولانا محمد زاہد قادری

نوٹ  
آنے سے پہلے رابطہ کر لیں

جادو، جنات، بندش اور دیگر بیماریوں  
کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں

مکان نمبر 771-ا، گلی نمبر 12/2 محلہ قائم آباد نزد عبدالرافع جنرل سٹور، ڈھوک کھہہ راولپنڈی  
[toobaa-elibrary.blogspot.com](http://toobaa-elibrary.blogspot.com)

مضامین قرآن ایک ایسا وسیع ترین معلوماتی بحر تھیں کہ جس تک فحی درجہ کی رسائی کسی کی ہو سکی ہے نہ ہو سکے گی۔ صاحب فکر و ذوق اہل علم نے اپنے اپنے دور میں مخصوص علمی دائرے میں رہتے ہوئے جزوی طور پر اس کی ترتیبی و منتخب ترتیب قائم کرنے کی کاوش کی ہے۔ یاد رہے قدیمی اصطلاحات کی جگہ جدید علمی اصطلاحات معرض وجود میں آچکی ہیں ہمارا سامنا افکار باطلہ (عقائد فاسدہ) کے ساتھ باطل نظاموں سے بھی ہے۔ ان سے آگہی اور اسلامی نظام برحق کی ہمہ جہتی برتری کا علمی شعور ہماری اہم ترین ضرورت ہے (اور رہے گی)۔ ”تفہیم البیان“ میں عصری تقاضوں کی اہم ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے منتخب مضامین قرآن کی اہم تر جہتی فہرست (450 مضامین قرآن) کی نشاندہی سمیت 112 فقرہ جی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ جسمیں عصر حاضر کے افکار باطلہ اور ذہنی غلطیات کو دور کرنے کی اہم کاوش نیز اسلامی نظام کے اہم ترین عنوانات کو وقت کے اہم علمی تقاضے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے مرعوب ہونے کی بجائے مضامین قرآن کی روشنی میں امت مسلمہ کی رہنمائی ہمارا دینی فریضہ ہے۔

اپنے علمی اناٹے کی حفاظت اور مطالعہ ہمارے لئے از حد ضروری ہے۔



# تَفْہِیْمُ البَیَانِ

مولانا محمد زاہد انور جامعہ عثمانیہ شروکت شہر  
فاضل جامعہ علوم الاسلامیہ غوری ٹاؤن کراچی

جدید علوم پر دسترس کے دعوے داروں کا خیال ہے کہ حاطین علوم دینیہ کو عصر حاضر کے چیلنجز کا ادراک نہیں، ہمارا اصرار ہے کہ قرآن و سنت میں ہمہ جہتی چیلنجز (اعتقادی، معاشی، معاشرتی نیز اخلاقیاتی امراض) کا کامیاب علمی علاج تجویز کیا گیا ہے جملہ ادیان باطلہ (نظام بائے باطلہ) کے مقابلے میں صداقت قرآن (حق) کے ابدی چیلنج کو ہر دور میں دوبرانے کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن مقدس کو عالمی آئین الہی کے طور پر سمجھنے نیز منتخب مضامین قرآن اور مختصر خلاصہ مفہوم آیات کے مطالعہ کیلئے ”تفہیم البیان فی فہم القرآن“ بفضلہ تعالیٰ اہم دینی و عصری حقائق کے حوالے سے (جدید اسلوب میں) بہترین علمی تحفہ ہے، ایک بار ضرور مطالعہ کیجئے!

- امام الاولیاء و شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ کا مکمل ترجمہ قرآن عزیز اس کا جزو خاص ہے۔
- وقت کے اہم تقاضوں پر چشم کشا حقائق کی نشاندہی کرتا فکر آمیز مقدمہ۔
- آیات نمبر کے مطابق خلاصہ مفہوم آیات کا نیا اسلوب (مختصر ترین الفاظ میں مفہوم کلام الہی کو بیان کرنے کی اہم کاوش)۔
- آخر میں چند اہم نوعیت کے علمی مضامین جن میں تحقیق محمود از افاضات محمود، اہام الحکمہ حضرت شاہ ولی اللہ کا فہم دین کے حوالے سے خصوصی نقطہ نظر اور فکر محمود، بالخصوص خلاصہ مضامین قرآن جیسے اہم عنوانات شامل ہیں۔
- ہر علمی لائبریری کی ضرورت نیز مدارس کے مدرسین، علماء و طلباء (مع عالما و طالبات)، خطباء اور مساجد میں درس قرآن دینے والے حضرات سمیت جملہ اہل علم کیلئے و قیہ علمی و معلوماتی خزانہ۔
- عصر حاضر کے اکابر و علماء کا پسند فرمودہ۔

انتہائی دلکش طبعیت اور عمدہ کاغذ کے ساتھ مناسب قیمت پر۔

نیا ایڈیشن نئی ترتیب و تصحیح کے ساتھ (اضافہ شدہ) دو جلدوں میں دستیاب



(مدارس کے علماء و طلباء مع عالما و فاضلات کے لئے تاجرانہ قیمت پر رعایتی دستیابی)

جامعہ عثمانیہ شروکت شہر  
0333-6176051  
0332-7236793

5 لاکھ مال حسنت کے مندر اور بازار لاہور  
0321-9464017  
042-37361460

نفیس قرآن کمپنی

## منتخب 112 استنباطی مضامین قرآن (بحوالہ آیات، سورۃ)

### میں سے چند اہم عنوانات کی جھلکیاں

اسلام کا نظام اعتقادات ☆ اسلام کا نظام عبادات ☆ اسلام کا نظام نظافت ☆ اسلام میں سنت رسول اللہ ﷺ کی تشریحی حیثیت و عظمت ☆ اسلام میں نظریہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حقیقت آمیز تجزیہ ☆ اسلام کا نظام امن ☆ قرآنی حقائق کا تاریخ سے موازنہ چہ معنی دارد؟ ☆ اسلام، عقل اور سائنس ☆ اسلام میں نظریہ رویت ہلال اور سائنسی استدلالات ☆ وحی رسالت اور وحی بمعنی الہام والقاء کے متعلق شرعی حقیقت ☆ اسلام کا نظام محنت ☆ اسلام کا نظام معیشت اور طبقاتی نظام (موازنہ) ☆ نظریاتی و تہذیبی اختلاف کے فکری نتائج ☆ اسلام میں حقوق نسواں ☆ عالمی معاشی و باء (سودی نظام) ☆ معاملات کے لین دین کا قانونی نظام ☆ بین المذاہب مکالمہ ☆ فرقہ واریت کی اصولی بحث ☆ اسلام کا نظام عفت و پاکدامنی ☆ اسلام کا نظام میراث ☆ اسلام کا نظام تجارت اور اس کے رہنما اصول ☆ احکام دین کا عملی و قانونی نفاذ ☆ عزیمت اور رخصت کا حکیمانہ اسلوب ☆ وکالت باطلہ و صحیحہ ☆ اسلام میں نظام عدل و انصاف مع نظام شہادت ☆ حلال و حرام اور نظریہ شریعت ☆ مشروط امن معاہدے اور اسلام کی دفاعی و خارجہ پالیسی ☆ فلسفہ انقلاب احوال ☆ جامعیت قرآن کی ہمہ جہتی حقیقت ☆ حکمت اور موعظہ حسنہ ☆ اسلام کا اخلاقی نظام ☆ اسلام کا نظام حکومت ☆ اختلاف رائے اور آزادی رائے ☆ نظریہ جہاد اور اس کی حکمت مع حدود و قیود ☆ عورت کی حکمرانی کے خلاف پہلی احتجاجی آواز ☆ قواعد و اصول وقتی نہیں ہوتے ☆ اسلام اور تربیت اولاد ☆ اسلام اور نظریہ تعلیم و فن ☆ ناموس رسالت، آداب، محبت و عشق رسول ﷺ ☆ اسلام کا نظام طلاق ☆ اسلام اور سماجی خدمات ☆ اسلام اور حقوق العباد ☆ بیعت، تزکیہ نفس اور اصلاحی حقائق ☆ شریعت و طریقت ☆ کونسی جماعت برحق ہے؟ ☆ آداب معاشرہ کے اخلاقیاتی پہلو ☆ تحقیق حالات کا شرعی نظام ☆ تقلید محمود کی آسان فہم حقیقت ☆ اسلام اور باقی مذاہب کا تقابلی جائزہ ☆ باطنی اعتبار سے عذاب الہی کی بدترین قسم ☆ نظام حدود و تعزیرات ☆ نظام فطرت کے خدائی اصول اور عقلیات کے بے لگام گھوڑے ☆ بحر و بر میں سبب فساد کا تجزیہ برحق ☆ فلسفہ عزت و ذلت وغیرہ